

سالانہ

اسکرپٹس کی ویسٹ

کلی

ماہانہ

دو سیریز

مسلسل 47 سال سے

JANUARY
2019



سعدیہ سیٹھی



رکن آل پاکستان تحریک نسوان
رکن کونسل پاکستان تحریک نسوان

MEMBER
APNS
CPNE

بانہی
سہام مرزا



دوشیزہ



مدیر اعلیٰ ————— منزہ سہام

ایڈیٹر ٹائٹلنگ منیجر ————— زین شمس

ایڈیٹر دائرہ ————— دانیال شمس

آگرم ٹیکس ایڈیٹر دائرہ ————— مخدوم امینہ کھنہ (ایڈیٹر کٹ)

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdu-tube.com

خط و کتابت کا پتا

جنوری 2019ء

جلد: 48 ☆ شمارہ: 01

قیمت: 70 روپے

88-C II فرسٹ فلور خلیانہ جلی کرکٹ

(یوٹائیٹلنگ ٹیکری کے اوپر) 7-ڈیٹس فیز-7 ڈیٹس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

منیجر سرکولیشن: آفتاب عالم رابطہ: 03343193174





- 07 سال نو مبارک منزه سہام
09 زادِ راہ غزالہ عزیز (ام ایمان)
14 محفل مدیرہ اعلیٰ

باتیں ملاقاتیں

- 24 راحت و قارا بچوت ادارہ

سلسلے وار ناول

- 28 منبر عشق سنبل
100 بادِ سموم ڈاکٹر سیمیں رخ
204 انجمن ہمسفر حبیبہ عمیر

افسانے

- 50 سفر ہوا تمام خولہ عرفان

مکمل ناول

- 162 پچھڑنا بھی ضروری تحسین انجم انصاری

ناولٹ

- 70 انکشاف حاجرہ ریحان
142 محبتوں کا سفر مہتاب خان



ہر نئی کتاب کے ساتھ شائع ہونے والے ہر چل ایت حدیث اور نئی کتابیں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نکل بین ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نئی دی ہوئی کاپی یا نقل یا دوبارہ اشاعت اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیش سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ کا کوئی ادارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

افسانے

- 84 نئے اجالوں کی برکھا فصیحہ آصف خان
92 تلافی فائزہ مشتاق
122 چاہتوں کے رنگ سلمیٰ غزل
128 فصل خار آسیہ بنت عبداللہ
178 آتش عشق خالد فاروق آسی
188 پٹی نہایت ریحانہ اعجاز
197 سال نو کی بارشیں طاہرہ بختیار
224 ہم نے تو بس عبادت کاظمی
229 میں سسرال اور... عروج فاطمہ
237 ناشکری حمیرا انصاف



دو شیزہ میگزین

افسانے

- 242 دو شیزہ ٹوکلے جمیل النساء
245 ہمارے فن کار ڈی خان
248 سخن زار قارئین
250 دو شیزہ گلستان ارم حمید
256 چکن کارٹر صومعہ شریف

زیر سالانہ بذریعہ جرنلی
پاکستان (سالانہ)..... 1000 روپے
ایشیا افریقہ یورپ..... 8.000 روپے
امریکہ کینیڈا آسٹریلیا..... 10.000 روپے

پیشتر: منورہام لے ٹی پریس سے چھپا کر شائع کیا۔ مقام: بی 7-OB-7، ٹاؤن سروس کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

غزلیں.....

زمیں کی گود سے سورج اُگانے والی ہوں
اتا کے لفظ کو خود سے گھٹانے والی ہوں

نشانِ تیغ پہ سجدے سے اٹھ کر اے داعی
علی کے نام کا جھنڈا اٹھانے والی ہوں

میں ابرہہ کی سیاست سے خوب واقف ہوں
میں صوفیوں سے مرام بڑھانے والی ہوں

تمام شہر میں کوفہ گری کا موسم ہے

میں اپنے گھر سے کوئی تیر کھانے والی ہوں

مال مجھ کو کوئی وقت برا کیا دے گا

میں اپنی پونجی پہ عرس لٹانے والی ہوں

وہی اک آگ وہی تاج اور تختے یہ

رضائے ایزدی پر سر جھکانے والی ہوں

شاعرہ: ارم ایوب

ایک ورق اور پھٹ گیا صحیفہ زندگی کا
کروں غم گھٹی عمر کا یا خوشی نئے سال کی؟

بٹی جس کی گھر بیٹھے پینتیس کی ہو گئی
کیا خبر ہے اُس باپ کی غربت کے حال کی؟

اس سال جس نے آنا تھا پردیس چھوڑ کر
مجبوری نئی بن گئی اس ماں کے لہل کی

ہیں بچے جس ملاں، منبر سے ڈرے ہوئے
اُس سال لو خبر اُس برے خوش خصال کی

ہر سال کے جشن پر ہیں لاکھوں کیے خرچ
کیا یہ وہ زکوٰۃ ہے اُس رب کے مال کی

جس ملک میں ہو منتخب کوئی ظالم بادشاہ
یہ بھی ایک سزا ہے رب ذوالجلال کی

اِس برس اپنے گریباں میں جو کی نظر دیم
ہر اک برائی ہے مجھ میں دورِ حال کی

شاعر: وسیم کنول



سال نومبارک...

ایک سال اور گزر گیا..... بڑی دنیائے ماضی کی لاتعداد جہریوں میں ایک اور
حصن کا اضافہ ہوا پاکستان نے اپنے دامن میں تجربات کے کچھ اور موتی سمیٹے کیا
واقعی میں انسان اپنے مستقبل سے بے خبر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نہیں اور اب خواہ
قومیں ہوں یا افراد نہ تو اپنے مستقبل سے لاعلم ہوتے ہیں اور نہ آنے والے دنوں کا
حال جاننے کے لیے انہیں کسی جامِ حشر کی ضرورت پڑتی ہے ماضی میں ان کا رویہ
اور اس لمحہ موجود میں جو حال کہلاتا ہے ان کا طرز عمل ان کے مستقبل کا تعین کر دیتا ہے
اور جو لوگ نہ ماضی سے سبق سیکھتے ہیں اور نہ اپنے حال پر نظر رکھتے ہیں اگر وہ بھی
مستقبل کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہوں تو پھر ان کے متعلق اس کے سوا اور
کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔

اور یہی بات ہم پاکستانیوں کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہے ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا
2019ء کے آغاز کا مطلب ہمارے لیے اپنے قریبی دوستوں 'رشتہ داروں یا
افراد کو نئے سال کے تہنیتی پیغامات ارسال کرنے کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ کیا
نئے سال کی آمد کو ہم اس کے سوا بھی کوئی اہمیت دینے کو تیار ہیں کہ زندگی کے مزید
365 دن جوں توں کر کے گزاریں اور بس.....

مجھے نہیں معلوم کہ اگر ہم اپنی سوچ اور اپنے معمولات زندگی میں انقلابی
تبدیلیاں کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو نیا سال ان برسوں سے کیونکر مختلف ہو سکے گا
جو ہم پاکستان حاصل کرنے کے بعد سے اب تک گزرتے رہے ہیں۔ اگر 2019ء
کو 2018ء سے مختلف ہوتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو
بدلیں اور یہ تبدیلی ہمیں اپنے کردار میں لانی ہوگی کہ افراد کا کردار ہی قوم کا کردار
تفکیک دیتا ہے اور افراد کا کردار کسی آرڈیننس یا قانون سے نہیں بننا بلکہ اس کے لیے
اپنے اندر کی آواز پر دھیان دینے کی ضرورت ہوتی۔

یہی آپ کے لیے میرا نئے سال کا پیغام ہے۔ آپ منزہ سہام مرزا
سب کو ادارہ دوشیزہ اور میری جانب سے سال نومبارک

سچی کہانیاں ماہ جنوری کا شمارہ شائع ہو گیا ہے



ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں

پتہ II C-88 فرسٹ فلور، خیابان چابی کرش، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121-35893122

رسول اللہ کی گھریلو زندگی

رسول اللہ کی گھر میں آمد باؤنیم کے خوشگوار جھوکوں کی مانند ہوتی جس سے گھر کے لوگ شاداں و فرحاں ہو جاتے اور دروہام مہک اٹھتے

عام طور پر یہ بات معاشرے میں عام ہے کہ جو شخص راہنمائی کے منصب پر ہوتا ہے وہ عوامی رابطے کے لیے عام لوگوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا اپنی شان کے خلاف سمجھے لگتا ہے لہذا وہ شخص انکشن سے قبل دوئوں کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے منتخب ہونے کے بعد عام لوگوں سے پھر دور ہو جاتا ہے بعض دفعہ یہ کبر کے باعث ہوتا ہے اور بعض دفعہ وقت کی کمی کے باعث..... یوں عام لوگوں سے رابطہ تو دور کی بات ہے اپنے ہی گھر والے ان سے شاکاں کرتے ہیں۔

لیکن جب ہم اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو انسانیت کے عظیم ترین منصب پر فائز ہونے کے باوجود آپ کو اپنے قریبی حلقوں، گھر والوں اور عام افراد تک مسلسل اور مربوط رابطے میں دیکھتے ہیں۔

وہ نظام اخوت جو وہ مسلمانوں کے درمیان نافذ کرنا چاہتے تھے اسے سب سے پہلے انہوں نے اپنے اوپر نافذ کر کے بہترین نمونہ پیش کیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کو پیسہ قرار دیا جاتا ہے کسی بھی ایسے کام میں جس میں مالی اور مادی فوائد حاصل نہ ہوں اس میں اپنے وقت کو استعمال کرنا بے وقوفی کی علامت کہلاتی ہے یہ سوچ حقیقت میں بڑی انسانیت کش ہے بلکہ کسی حد تک ظالمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس سوچ کو تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عوامی اور سماجی روابط کو سنت رسول سمجھ کر ادا کیا جائے اس سلسلے میں پیارے رسول کا معمول ہماری راہنمائی کے لیے کافی ہے۔

آپ جب بھی باہر جاتے تھے راستے میں ملنے والوں کو سلام کرتے یعنی سلام میں پہل کرتے کسی کو کوئی پیغام بھیجتا ہوتا تو ساتھ سلام بھیجتے کوئی سلام بھیجتا تو

لانے والے اور بھیجنے والے کو علیحدہ علیحدہ سلام کہتے۔
 بچوں اور نو عمر لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرتے
 تو انہیں سلام کرتے۔ ایک دفعہ آپ عورتوں کی ایک
 جماعت کے پاس سے گزرے تو انہیں بھی سلام کیا۔ گھر
 میں داخل ہوتے یا کہیں نکل کر تشریف لے جاتے تو گھر
 والوں کو سلام کرتے۔ ساتھیوں سے مصافحہ بھی کرتے
 معافتہ بھی، یعنی گلے بھی ملتے۔ کبھی مصافحہ کر کے اپنا ہاتھ
 نہ کھینچتے جب تک دوسرا خود اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

آپ کا فرمان ہے کہ سلام میں پہل کر کے والے
 کو تیس نیکیاں اور جواب دینے والے کو دس نیکیاں دی
 جاتی ہیں۔

نا پسندیدہ شخص جس کی پسندیدگی کی وجہ بھی صرف
 دین اسلام ہوتا تھا اگر ملتے آتا تو خندہ پیشانی سے ملتے
 ایک شخص آیا جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ
 نے کہا کہ میں اخوالعشرہؓ ہے یعنی اپنے گروہ کا برا
 آدمی ہے مگر آپ اس کے ساتھ ملے تو بے تکلفی سے
 بات چیت کی حضرت عائشہؓ نے تعجب کا اظہار کیا تو
 آپؐ نے فرمایا

بچوں سے محبت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے
 بچوں کو پیار کرتے۔ گود میں لیتے اور محبت کے ساتھ ان
 کے کھیل میں شریک ہوتے ایک دفعہ بچوں میں انعامی
 دوڑ لگوائی کہ دیکھیں کون سب سے پہلے مجھے چھوٹا
 ہے۔ بچے دوڑتے ہوئے آتے اور آپ سے لپٹ
 جاتے۔

”قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص
 بدترین مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے
 باعث ملنا جلنا چھوڑ دیں گے۔“

گھریلو اور نجی زندگی میں بڑے بڑے راہنما
 اعتدال کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں لیکن رسول اللہ جن کو
 ایک دو نہیں تو گھرانوں کی ایک ساتھ دیکھ بھال کرنی
 ہوتی تھی نہایت اعتدال اور متوازن انداز میں رہتے۔

آپؐ بیماروں کی عیادت کے لیے جاتے تو
 سر ہانے بیٹھ کر حال پوچھتے۔ دعا کرتے اگر بیمار کسی چیز
 کی خواہش کرتا تو اگر وہ چیز اس کے لیے مضر نہیں ہوتی تو
 منگوادیتے آپؐ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم کی عیادت
 کے لیے بھی تشریف لے جاتے۔

رسول اللہ کی ازدواجی زندگی ایک ایسا باب ہے کہ
 جسے غیر مسلم مورخوں نے خوب اچھا لایا ہے رسول اللہ کی
 ازدواجی زندگی پر بات کرتے ہوئے ایک بات ہمیشہ
 ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آپؐ کا ہر عمل منشاءً ربانی
 کے مطابق تھا اس میں کسی خواہش نفسانی کا کوئی دخل نہ
 تھا جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ”اور وہ اپنی خواہش
 نفس سے نہیں بولتے“ آپؐ کی سیرت و کردار آپؐ کے
 اعمال و اقوال ہر ایک میں حکم ربی کی اطاعت بھی اسی

کوئی وفات پا جاتا تو اس کے گھر جاتے عالم نزع
 میں بلایا جاتا تو آپؐ مریض کے پاس جاتے اور اس کو
 اللہ کی طرف رجوع کی تلقین کرتے۔ ایک دفعہ ایک
 یہودی لڑکے کی عیادت کے لیے گئے وہ بہت بیمار تھا

لیے اللہ تعالیٰ قرآن میں اپنی اطاعت کو اطاعت رسول سے مشروط کرتے ہیں۔

یقیناً رسول اللہ نے کئی شادیاں کیں لیکن آپ کی ہر شادی میں بیشمار مصلحتیں تھیں یہ مصلحتیں دنیاوی مقاصد سے ہٹ کر تھیں حصول دولت ایک سب سے اہم دنیاوی مقصد ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو خواتین آپ کے نکاح میں آئیں ان میں حضرت خدیجہ کے علاوہ کوئی دولت مند نہ تھیں یہاں بھی شادی کی پیشکش بی بی خدیجہ کی جانب سے ہوئی تھی۔ اور بعد میں بزرگوں کی اجازت اور سرپرستی میں یہ شادی عمل میں آئی۔ باقی امہات المؤمنین میں حضرت جویریہؓ حضرت صفیہؓ جنگ میں قید ہو کر آئی تھیں۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ کثیر تھیں جنہیں مصر کے گورنر نے بھیجا تھا۔ حضرت سوہہؓ حضرت میمونہؓ حضرت زینبؓ حضرت ام حبیبہؓ حضرت ام سلمہؓ بے سہارا تھیں۔ حضرت عائشہؓ واحد کنواری لڑکی تھیں جن کو ان کے والدین نے کچھ سامان دیا تھا لیکن وہ قابل ذکر نہیں یعنی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ شادیاں دولت کے حصول کے لیے نہیں تھیں۔

یہ شادیاں ہوائے نفس کے لیے بھی نہیں تھیں پہلی شادی جو آپؐ نے جوانی میں حضرت خدیجہؓ سے کی جو آپؐ سے پندرہ برس بڑی تھیں لیکن آپؐ نے ساری جوانی یعنی پچیس سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزارے۔ حضرت خدیجہؓ کے رہنے کوئی شادی نہ کی۔

آپؐ کی شادیوں کے مقاصد میں اولین مقصد اشاعت دین تھا مختلف گھرانوں میں رشتے داروں سے ان گھرانوں تک دین کا پیغام پہنچانا آسان ہو گیا پھر آپؐ کی شادیوں نے بہت سے غلط رسوم و رواج کو توڑا شوال کے مہینے میں عرب شادی بیاہ نہیں کرتے تھے حضرت عائشہؓ کی شادی اور رخصتی دونوں شوال کے مہینے میں ہوئیں حضرت عائشہؓ اور حضرت زینب بنت جحش

سے نکاح نے منہ بولے رشتے کے ساتھ نکاح کی ممانعت کی رسم کو ختم کیا۔

رسول اللہؐ نے مختلف گھرانوں اور نسلوں کے ساتھ رشتے کر کے ثابت کیا کہ شادی کے رشتے کو ایک خاندان برادری یا قبیلہ تک محدود کرنا غلط ہے آپؐ نے نسل رنگ اور قبیلہ کے امتیازات کو ختم کیا۔

پیارے رسولؐ کی ان شادیوں کا ایک مقصد امت کے سامنے عالمی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنا بھی تھا کہ کس طرح شوہر کو اپنے بیوی بچوں اور گھریلو کار خیال رکھنا چاہیے کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی توجہ اور مہربانی کے واقعات زیادہ تر حضرت عائشہؓ کے متعلق ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی توجہ اور مہربانی سب کے ساتھ برابر تھی حضرت عائشہؓ چونکہ زیادہ ذہین تھیں لہذا انہوں نے بحیثیت شوہر نبی اکرمؐ کو جو مطالعہ کیا تھا اس کو امت کے سامنے پیش کیا یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت کی ہوئی احادیث کی تعداد حضرت ابو ہریرہؓ کے بعد سب سے زیادہ ہے۔

لوگوں نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رسول خدا جب گھر میں ہوتے ہیں تو کس رنگ میں ہوتے ہیں؟

حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ وہ ہم سب سے زیادہ نرم خو، جنتیم، خندہ رو تھے انہوں نے کبھی کسی خادم تک کو نہیں جھڑکا، سچ یہ ہے کہ رسول اللہؐ سے بڑھ کر کوئی اپنے اہل و عیال کے لیے شفیق نہ تھا (مسلم)

عرب معاشرے میں مرد اپنی اپنا پرستی پر فخر کرتے تھے اور عورتوں کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتے تھے لیکن رسول اللہؐ کا رویہ اور عمل سب سے جدا تھا۔ کسی نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہؐ اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟

نعت

ڈاکٹر توصیف تہتم

اے قلم! دائرۂ وصف و لب و رخ سے نکل
مدح ممدوح خداوند میں لکھ کوئی غزل
پیش منظر بھی وہی اور پس منظر بھی وہی
جو نبوت میں مؤخر ہے، وہی ہے اذل

بزم امکاں میں ہے نایاب سے بڑھ کر نایاب
معجزہ حق کا، مکمل سے زیادہ اکمل
خاکِ خوابیدہ میں بیدار نمو کی صورت
تا ابد مزرعِ ہستی پہ برستا بادل
اک وہی رحمتِ عالم ہے، کرم سے اُس کے
پھول باغوں میں مہکتے ہیں، ہرے ہیں جنگل
شوق حیران ہے، دل و جاں میں سائی کیسے
گم ہیں جس ذاتِ گرامی میں ابد اور ازل
صرف اک لفظ ”محمد“ کے ہیں کتنے معنی
شافع و حامد و محمود، نئی مُرسل
سر پہ ہے کس کے یہ سورج کا عمامہ، توصیف!
کون ہے پہنے ہوئے پیراہنِ صبحِ ازل

انہوں نے جواب دیا کہ آپ آدمیوں میں سے
ایک آدمی تھے اپنے کپڑوں کی خود دیکھ بھال کر لیا
کرتے، بکری کا دودھ خود دوتے اور اپنی ضروریات خود
پوری کر لیتے، اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے، اپنے
جوئے بھی مرمت کر لیتے، اپنے ڈل میں ٹانگا لگالیتے،
بوجھ اٹھاتے، جانوروں کو چارہ ڈالتے۔ کوئی خادم ہوتا تو
بھی اس کے ساتھ مل کر کام کر دیتے مثلاً آنا وغیرہ
پھوانا، بازار جا کر سودا سلف لانے میں عار محسوس نہ
کرتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ
کر اٹھا کر لاتے۔

ایک دفعہ حضرت امام حسینؑ نے حضرت علیؑ سے
اپنے نانا رسول خدا کی مصروفیات کے بارے میں
دریافت کیا۔ حضرت علیؑ نے بتایا کہ ”رسول اللہ جب
گھر آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیات
میں صرف کرتے، کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف
کرتے، کچھ وقت اہل و عیال کے لیے مخصوص تھا اور
کچھ وقت اپنے آرام کے لیے، پھر ان ہی اوقات میں
سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لیے نکالتے جس میں
احباب اور دیگر لوگ خصوصی گفتگو کے لیے آتے یا کچھ
لوگ ایسے بھی ہوتے جو اپنی ضروریات اور حاجات لے
کر آتے یوں آرام کے لیے آپ کے پاس بہت کم
وقت رہ جاتا۔

آپ کے گھر میں کبھی سخت خبیثہ بوجھل ماحول پیدا
نہیں ہوتا تھا، آپ اپنے اہل خانہ کی تربیت کے لیے
کبھی تبسم کے ساتھ گفتگو انداز اختیار کرتے اور کبھی قصہ
گوئی اور لطائف سے کام لیتے۔ غرض رسول اللہ کی
گھر میں آمد بادیسم کے خوشگوار جھوکوں کی مانند ہوتی
جس سے گھر کے لوگ شاداں و فرحاں ہو جاتے اور در
دبام مہک اُٹھتے۔

☆☆☆



دوشیزہ کی محفل

محببتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

2019ء کے پہلے شمار کیے ساتھ آپ لوگوں کی خدمت میں منزہ سہام مرزا کا خلوص بھرا سلام.....
2018ء ماضی ہو گیا۔ اس ایک سال میں بحیثیت پاکستانی ہم سب نے بہت کچھ سہا بہت کچھ برتا اہمیت بس
اس بات کی ہے کہ گزرے سال میں ہم نے کچھ سیکھا ہو۔ 2019ء کا پہلا شمارہ دینے کی بہت
Excitment تھی۔ بہت سی باتیں کرنی تھیں مگر پہلے انہیں یاد کرتے ہیں جو پچھڑ گئے..... ہمارے آرٹ
ڈیزائنر ممتاز صاحب پہلے بڑے بھائی سے محروم ہوئے اور محض چند دنوں کے وقفے کے بعد والدہ بھی گزر
گئیں۔ یقیناً یہ وقت اُن کے لیے بہت کڑا ہے۔ فیصحا آصف کے جواں سال بہنوئی بھی دنیا سے رخصت
ہو گئے۔ اس جواں سال موت نے فیصحا کے خاندان کو بہت بڑا چوکا دیا ہے۔ دوشیزہ کی دیرینہ ساتھی طلعت
اخلاق بھی اپنے بھائی سے محروم ہو گئیں۔ اللہ ممتاز صاحب، فیصحا اور طلعت اخلاق کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ غم
اور خوشیاں ساتھ ساتھ ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے تو خوشی کی خبر یہ ہے کہ غزالہ رشیدی کی بھانجی شیراز شادیم کی
بہو بن کر لاہور رخصت ہوئیں۔ بھئی غزالہ بہت معذرت کے کچھ عوالم ایسے رہے کہ شادی میں چاہت کے
باوجود شرکت نہ کر سکی۔ اور سیما مناف اور رضوانہ پرنس اس کی گواہ بھی ہیں۔ نسیم منیر علوی صاحبہ کی بہن غزالہ
علوی کی صاحبزادی بھی خیر سے اپنے گھر کی ہوئیں میں دونوں خاندانوں کو دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں
پاکستان آئی بینک سے وابستہ نصرت جہاں صاحبہ کی صاحبزادی فرحت جہاں بھی پیادیس سدھاریں آپ
سب سے ایک بار پھر معذرت کہ اتنی محبت سے بلانے کے باوجود میں نہ آ سکی وجہ میرے چچا زاد بھائی کی
شادی ٹھہری جو لوگ حیدر آباد رکن کے رسم و رواج سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں کہ میری مصروفیات کیارہی
ہوں گی۔ چلیں اب باقی باتیں اگلی بار پڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب.....

✉ فرحت صدیقی فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم! دسمبر کا شمارہ ملا۔ 2018ء کا
آخری رسالہ اپنے دامن میں بہت ساری چاہتوں کو سمیٹ کر لایا۔ جانے والے سال کی آداسی اپنی جگہ آنے
والے سال کو خوش آمدید ضرور کہتے ہیں۔ اللہ کرے 2019ء ہمارے عوام کے لیے نیا سال ہو۔ نئی خوشیاں
ہوں نیا سال ان کے آنسو پونچھ لے۔ ان کے لبوں پر وہ مسکراہٹ لے آئے جو ان کا حق ہے۔ اب تبھرہ

ہو جائے دمبر کے شمارے پڑوائی اب کیمرے کی آنکھ ہی حق دار کو حق دے سکتی ہے۔ یہ آنکھ ہر انسان کے اعمال کو دیکھ رہی ہے۔ کاش اس آنکھ کا ادراک ہو جائے۔ تو کسی دوسرے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ غزالہ عزیز کے قلم کو بہت سارا سلام جو اتنا اچھا اور جامع مضمون لکھ کر ہماری عقلی کو کم کرتی ہیں۔ حضرت حصہ جیسی عظیم ہستی کے بارے میں پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ دوشیزہ کی مغل میں اپنا طویل خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سب سے ملاقات ہوئی آدمی ہی بکری غزالہ عزیز کے بارے میں تفصیل سے پڑھا۔ وہ بالکل ٹھیک کہتی ہیں کہ سو روپے کا برگر بچوں کو دے دیتے ہیں۔ رسالہ نہیں خرید کے دیتے ہمارے بچپن میں اخبار اور رسالے ہی تھے۔ جنہوں نے ہمیں لکھنا سکھایا اور پڑھنے کا شوق دیا۔ اب موبائل اور بچوں کے ہاتھ میں Tablet ہوتے ہیں وہ سارا وقت گیمز میں گزار دیتے ہیں۔ پڑھنے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ واقعی محبت قربانی کا ہی دوسرا نام ہے۔ جہاں قربانی نہیں وہاں محبت نہیں۔ آنکھ کا بال عورت جب انتقام پر اتر آتی ہے تو زہریلی ناگن بن جاتی ہے۔ خیر علی کے ساتھ ایسا ہوتا ہی تھا۔ بہر حال بہت ہی خوفناک کہانی تھی۔ عورت ہو کر اس کا بدلہ حیران کن تھا۔ تو بے تو بے..... زرافشان فرمین نے شاہ کوئین کے در پر لکھ کر محبت اور الفت کی ساری یادیں تازہ کر دی جو روح میں گلاب کی طرح کھلی ہوئی ہیں۔ پاکستانی بہنوں کے علاوہ بھی دوسرے ممالک کی خواتین بھی شور مچاتی بھاگتی ہوئی جاتی ہیں۔ یہ دیکھ کر دل بہت بے چین ہوا کہ رسول پاک ﷺ سے محبت کا یہ کیا انداز ہے۔ ہم تو ان کو سلام پیش کرنے آتے ہیں۔ اس مقام کی عزت اور وقار اللہ کا کاش ان خواتین میں یہ احساس اجاگر ہو جائے۔ یہ مقام بہت ارفع ہے اس کے وقار کے لیے ہی خاموشی اختیار کر کے سلام پیش کریں اور دعائیں مانگیں۔ محرم حرم کے کبوتر بہت خوبصورت ہیں۔ کاش میں محرم حرم کا کبوتر ہوتی؟ یہاں کی راتیں بھی دن کا سا پیدا کرتی ہیں دن رات عاشق نبی ﷺ حاضری دیتے ہیں۔ عجب دنیا ہوتی ہے یہ دل کی یہاں سے آنے کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن واپس آنا ہی پڑتا ہے۔ وطن واپسی زخمی آنکھ کی پلک پر زخمی آنسو..... اپنی مٹی سے محبت کی لازوال مثال..... بادِ سمومِ تھرکی اس کہانی نے بہت اداس کر دیا ہے۔ مول کی روح کا درد بہت ترپا گیا۔ معصوم گلاب کی کلی کو پتھر نے روند ڈالا۔ خان کی وحشت نے مول کی کوکھ تک اجاڑ دی۔ فیروز کا گھر سے چلے جانا بھی خان کی وحشت ہی ہے۔ ماں کی جدائی نے اس کو بھی توڑ ڈالا تھا۔ کاش فیروز واپس آ جائے مٹی کی محبت اصل میں پاکستان میں بے روزگاری کی وجہ سے گھر والوں کے لیے کچھ کرنے کا عزم لے کر وہ غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اکثر اپنی جان گنوا لیتے ہیں۔ یہ لوگ جو ایجنٹ کو پیسے دیتے ہیں ان پیسوں سے اپنے وطن میں سبزی پیاپلوں کی ریڑھی ہی لگا لیں تو گھر والوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کر سکتے ہیں۔ لیکن باہر جانے کی ہوس ان کو نہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ شکر ہے عاصم کو وطن کی محبت یاد آگئی اور اس کو اس کا احساس ہو گیا۔ ناامیدی کا ستر یہ دنیا کی کہانی ہے۔ حقدار کو جب حق نہیں ملتا۔ تو اس کا بھی حال ہوتا ہے۔ ایشل بھی اسی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ لکھنے والے کو اگر سرہانہ نہ جائے تو اس کا لکھنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ دلدل زبردست دین سے محبت اور لگاؤ نے اس کی جی لگن نے اس کے شوہر کو راہِ راست پر لے آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ سچائی کے گلاب کھل کر رہتے ہیں دیارِ غیر میں بہت ساری کہانیاں ایسی ہیں جو ہم تک پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ وہاں ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ بس ابھی اتنا ہی دوشیزہ پڑھا ہے۔ آپ سب کو میرا بہت سلام اب اجازت دیجیے۔

بھی: فرحت آئی! یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ آپ نے دو شیزہ پورا پڑھائی نہیں آپ کی رائے بڑی اہم اور قیمتی ہوتی ہے۔ درست کہا آپ نے جانے والا سال بہت سارے دکھ اور پریشانیاں دے کر رخصت ہو گیا مگر کیا یہ کم ہے کہ ایک اور سال ہمارے سامنے ہے اللہ کی مدد شامل حال رہی تو ان دکھوں اور پریشانوں کا خاتمہ بھی ہو ہی جائے گا انشاء اللہ! بس ہمیں گمان اچھا رکھنا چاہیے۔

✉: مسئلہ کراچی سے لکھتی ہیں۔ بہت اچھی بہت پیاری منزہ! السلام علیکم! شکر الحمد للہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ تمام احباب کی خیریت اللہ بزرگ و برتر سے نیک مطلوب ہے۔ منزہ ادارہ ہی حسب معمول زبردست تھا یہی چل رہا ہے ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے بارے میں غزالہ آپ نے بہت زبردست لکھا جزاک اللہ آپ ہمارے علم میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ محفل حسب معمول زبردست تھی اور منزہ کراچی والوں سے معذرت کی ضرورت نہیں ہے اللہ کے کرم سے کراچی والوں کی بساط کے مطابق سردی پڑنے ہی لگی اوقات لفظ میں نے جان بوجھ کر نہیں لکھا اور غزالہ کا انٹرویو بہت خاص کی چیز تھا ہر سوال کا جواب بہت مفصل تھا کوئی تشکیقی بات نہ رہی آگے میرا ناول ایسا وہ تھا اس سے آگے کی اسرار میں تھے پرستی مجھے وہ ناول پسند نہیں آیا دردانہ خود کو کی دودھ کی دھلی تھی جو کسی سے بدلہ لینے لگی تھی اور بدکردار عورت کے لیے بدکردار مرد اور اس کی شادی کیسے کسی باکردار مرد سے ہو جاتی اور دردانہ نے اپنے انتقام کا نشانہ سارہ اور معصوم لوگوں کو بنایا اسی لیے وہ کھوکھی ہو گئی زرا نشانا فرحین نے سماں باندھ دیا اللہ ہمیں بھی اپنا مہمان بنائے آمین ثم آمین۔ غزالہ کے افسانے نے دل کو چھو لیا۔ بادِ موم بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے مٹی کی محبت کا ایضاً بہت خوبصورت تھا حالات سے گھبرا کر غلط فیصلے کرنے والوں کے لیے زبردست تحریر مریم کا افسانہ بہت اہم نقطے کو اجاگر کر گیا۔ ہمیں بار بار جو دکھایا جاتا ہے وہ معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے۔ دلدل اپنے اچھے اختتام کے ساتھ اچھی تحریر رہی میں باری سیاں میں پرانے افسانوی ماحول نے بہت مزہ دیا عورت خود کو دنیا سے کتنا ہی الگ اور لبرل ثابت کرے مگر دل کے معاملات میں مار کھا جاتی ہے اور عزیزہ انجم نے دیکر ہی دی حبیبہ ماضی سے پردہ اٹھا رہی ہیں اور ناول میں دلچسپی بڑھ رہی ہے پینا کا ناول اچھا تھا پینا کا ناول اچھا تھا مگر نوران کچھ زیادہ ہی زور رنج و حساس تھی۔ ٹوٹکے لا جواب تھے سخن زارا اچھا سلسلہ ہے شعراء کے لیے خود کو منوانے کا دو شیزہ گلستان زبردست تھا کارز کی شاعری کے تو کیا ہی کہنے کچن کارز کے فوائل کہاں نان اور لب شیریں ثرائی کرنے ہیں۔ یہ تو ہوا تبصرہ اب سناؤ طبیعت کیسی ہے بہتر ہوئی موسم تو کراچی والوں کی صحت کے مطابق سرد ہو چکا ہے اس سے زیادہ یہ نازک مزاج برداشت کے تحمل نہیں ہو سکتے اللہ سے دعا ہے کہ وہ سب معاملات میں خیر رکھے آمین ثم آمین اب اجازت دو اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا فی امان اللہ۔

بھ: اچھی مسئل! ہمیشہ کی طرح وقت پر تم محفل میں حاضر ہو میں تمہاری اس پابندی سے مرعوب بھی ہوں اور شکر گزار بھی تم اور خولہ پابندی سے حاضری لگاتی ہو اور مجھے کچھ اہم فیصلوں پر آخری مہر لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ اچھی دوست ایک بار پھر شکر یہ تم نے سچ کہا اس بار تو کراچی والوں نے ٹھنڈ کے مزے خوب لیے بلکہ اب تک لے رہے ہیں اور خاندان کی شادیوں نے اس گلہانی جاڑے کو اور گلہانی کر دیا..... میری طبیعت الحمد للہ بہت اچھی ہے میں نے ہر قسم کی آنکس کریم سے دوری جو اختیار کی ہوئی ہے بقول دانیال اب آپ بڑی ہو گئی

ہیں تم ہمارے فنکار پر بھی تو رائے دیا کرو میں خطر ہوں اپنا بہت خیال رکھنا اور تمہارا ناول مجھے بہت مزہ دے رہا ہے بچپن کے لیے بہت اہم پیغام دیا تم نے اللہ سب کی شہزادیوں کو بھٹیڑوں سے محفوظ رکھے آمین۔

✉ حسن علی طالب ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ آئی منزہ سهام السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو صحت و ایمان والی لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ آپ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ یہ بھائی یہاں بھی آگیا تو بات یہ ہے دو شیزہ میگزین دیکھا تو خریدے بغیر نہ رہا چلو مجھ تاجز کو برداشت کر لیں اللہ اجر دے گا۔ تمام ماہنامہ دو شیزہ کے قارئین و لکھاریوں کو دل سے سلام امید ہے آپ سب کا ساتھ خوشگوار رہے گا۔ اب آتے ہیں تبصرہ کی طرف..... ماہنامہ دو شیزہ کراچی دسمبر 2018ء آخری شمارے کا ٹائٹل اشتہار ماڈل گئے اور مضبوط بال کے ساتھ زبردست تھا۔ ایک بات کہوں بازاری شیپو خطرناک ہیں مگر دیکھی چیز خطرناک نہیں بازاری شیپو سے جن میں گھٹیا کیمیکل ہوتا ہے آپ کے بالوں کا بیڑا غرق کرتا ہے اور مردوں کے سر پر شفاف شفاف جگ نمودار کرتا ہے یہ سچ خواتین کی طرف بھی رخ کر سکتا ہے اس لیے دیکھی شیپو استعمال کریں ان کی وجہ سے آپ کے کھوئے بال واپس نمودار ہو سکتے ہیں سچ مبارک سر پر ہا ہا ہا..... آپ کا کالم سبق آموز تھا سچی بات ہے وہ شہید سپاہی شہرت کے انعام کے اصل حقدار تھے جبکہ اگر اس لیڈی ایس پی کے سامنے ایک بھی دہشت گرد آ جاتا ہے اس کے ایک ٹھٹھری بھی نہیں مار سکی۔ زاد و راہ اچھا سلسلہ ہے مجھے جن کے خطوط اچھے لگے اُن کے نام فرحت صدیقی، انیلا طالب، خولہ عرفان، سیدہ عروج فاطمہ، اور نصیر آصف خان پسند آئے نصیر آصف بہتار شیم میں بھی لکھتی رہی ہیں یہاں انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی سلسلے والے رازدار سب اچھے تھے خاص کر سبیل کا مہر شفق باقی جو تحریریں مجھے اچھی لگیں اُن کے نام آکھ کا بال دلدل دیر نہ ہو جائے میں ہاری سیاں وطن واپسی اور زرافشاں کا مضمون بھی عمدہ تھا۔ باقی سلسلے بھی زبردست تھے۔ ایک کہانی دیو پارس اسی خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں گی۔ افتخار صاحب کو اللہ پاک جنت عطا فرمائے آمین باشرط زندگی اگلے ماہ بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا۔ کھ: بھائی محسن! میں آپ کو دو شیزہ کی محفل میں خوش آمدید کہتی ہوں آپ کو دو شیزہ کی تحریریں اچھی لگیں جان کر خوشی ہوئی امید ہے کہ آمدندہ ماہ مفضل تبصرے کے ساتھ آئیں گے۔

✉ انیلا طالب بھدے شریف کو جبرائیل سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری آئی منزہ سهام صابنہ کیا حال ہے آپ کا امید ہے دشمنوں کے شر سے محفوظ اپنوں کی دعاؤں کے سائے میں ہوں گی۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ کی بے لوث محبت ہے جو مجھے دو شیزہ سے جوڑے ہوئے ہے۔ مجھ سے تقریباً سن سن کر میرے گھر والے بھی آپ کے زبردست فن بن چکے ہیں۔ منزہ آپ کی اچھائی مجھے اچھائی کا قرض میں اکثر دعائیں کر کے اتارتی رہتی ہوں۔ آپ کی آواز مجھے بے حد پسند ہے آپ کہیں مکھن نہ مجھے گالچ کہہ رہی ہوں طبیعت میری خراب ہے ذرا کمر میں تبصرہ کیے بغیر چین پانے والی نہیں اس لیے خط لکھ رہی ہوں۔ شدید سر درد کے باوجود بھی..... تو جناب سب سے پہلے ایک بار پھر سے آپ کا شکریہ آپ کی بدولت دو شیزہ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور میرے بھائیوں زین مسکی اور دانیال مسکی کو بے پناہ خوشیاں دے بہت سو میٹ سی آئی مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ سے میرا نمبر واپس اپ پر بلاک ہو گیا ہے یہ یقیناً غلطی سے ہوا ہو گا میں آپ کو بتا نہیں سکتی مجھے کتنی ٹینشن ہے اس بات کی یوں لگ رہا

ہے جیسے میری کوئی چیز ٹھوکی ہے برائے مہربانی ذرا چپک کر بیچے گا۔ ایک اور بات آپ سے کرنی تھی کہ آپ کی جان میں ایک مضمون صحیح رہی ہوں بہت اہمیت اور مان سے مجھے یقین ہے اگر قابل اشاعت ہوا تو آپ ضرور جلد لگا کر میری عزت رکھ لیں گی۔ اب آئی ہوں تمبرے کی جانب تو ناگل اچھا تھا میرے خیال سے اسے بدل لینا چاہیے اور دوسری بات ڈیز منزہ جی جیسے دو شیرہ کے سرورق پر پہلے ہوتا تھا نا کہ اچھی مصنفات کے نام کی شہ سرخیاں لگتی تھیں یہ بہت ہی کمال لگتا ہے اگر پھر سے ایسا ہو جائے تو بلے بلے ہو جائے سب سے پہلے تو ادارے پر حاحاتوں جیسے الفاظ اور علم و آگاہی کے کئی در کھولنا پایا ویلڈن آئی..... زوارہ سے برکت سیمٹی اور پھر اپنی پیاری مصنفہ الغزیز صاحبہ کا شاندار انٹرویو پڑھا سبیل آئی کا منبر محقق مزہ وے گیا مکالے شاندار اور لا جواب کردار نگاری واہ واہ..... آنکھ کا بال..... لکھنے والے انکل ارسلان ہوں اور پتہ نہ چلے یہ ہو نہیں سکتا نام نے ہی چونکا دیا ناول اچھا ہماریم شہزاد گند..... ہمارے معاشرے کے ایسے برکم الفاظ میں انتہائی شائستگی سے لکھا آپ نے احمد سجاد بابر صاحب تو چھانگے مٹی کی محبت لا کر..... خصوصی مضمون روحانی خوشی دے گیا زرافشاں یہ آپ کی خوش نصیبی ہے ورنہ ایک میں ہوں کہ شدید خواہش کے باوجود نہیں جاسکی حالانکہ ابو جی نے کئی عمرے کیے ہیں امی جی بھی ہوئی ہیں یہاں تک کہ چھوٹا بھائی محمد رضا تو چار پانچ سال کی عمر میں ہو آیا تھا مگر..... کیا کریں ہماری قسمت..... بادِ موسم اور اپنی بیٹا عالیہ کے ناول پسند آئے میں ہماری سانس زبردست سعد یہ سبھی دلدل کمال دو شیرہ میگزین زبردست اعلیٰ اپنی شاعری دیکھ کے بہت ہی خوشی ہوئی اگلے دو شیرہ کا انتظار رہے گا تب تک کے لیے اللہ حافظ۔

بھ: ڈیز انیلا! دو شیرہ پسند کرنے کا شکر یہ تمہارا نمبر بالکل بلاک نہیں ہوا ہے بس میں ذرا جواب کم کم دیتی ہوں۔ عمر کا تقاضا ہے اب نظر کم آتا ہے نا.....! یقیناً بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو میرے نبی ﷺ کے در پہنچ کر اپنے لیے خیر مانگ لیتے ہیں۔ تمہارا مضمون میرے پاس محفوظ ہے اب دیکھوں گی کہ کس میں شائع کروں کیونکہ وہ مزاج کچی کہانیاں کا ہے۔ اللہ ہمیں بھی اپنی امان میں رکھے۔

✉: زمریم لاہور سے لکھتی ہیں۔ ڈیز منزہ سیام السلام علیکم! اللہ آپ پر ہمیشہ مہربان رہے آمین اللہ تعالیٰ سے آپ کی اور ادارے کے تمام اراکین و دوستانہ کی خیریت و عافیت کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے ثم آمین۔ منزہ جی گزشتہ ماہ دو شیرہ کے لیے خط لکھا رہ گیا۔ جبکہ گمان تھا کہ خط ارسال کر چکی ہوں۔ ذہن آج کل اسی طرح الجھا ہوا ہے۔ کرنا کچھ چاہتی ہوں ہو کچھ جاتا ہے۔ اللہ کی رضا اور مسکین جیسی ناقص و اطفال کہاں سمجھ پاتی ہے۔ بہر حال یہی زندگی ہے اور اس کے رموز و اوقاف سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ مشکل تو آج کل ایک بینک اکاؤنٹ کھلوانا بھی ٹھہرا۔ کیا ہاؤس گزشتہ ماہ اسی خواری میں گزرا۔ بھی دل پریشان ذہن الجھا رہا۔ آپ بھی کہیں گی ایسی کیا مصیبت بڑی تھی کہ خواری جھینٹی پڑی تو روداد تم یہ ہے میری پیاری دوستوں کی دعاؤں اور بالخصوص فیصحا آصف جیسی شخص و بے لوث دوست کی بھرپور کاوشوں کے نتیجے میں ہالٹا خر میرے ناول روشنی میرا استعارہ کی نقالی کو اس صورت تسلیم کیا گیا کہ مرکزی خیال میں میرا نام نشر ہو ہی گیا۔ اور ہر جانہ کہوں یا محافضہ صرف بیس ہزار چپک کی صورت میں ایک ایکریمنٹ کے بعد ادا کیا گیا۔ چپک کیش کروانے کے لیے اکاؤنٹ کی ضرورت تھی۔ سو کئی پا پڑیلے

بڑے شکر ہے کہ یہ مرحلے ہوا۔ میں سبکی کی مشکور ہوں جس نے بھی میرے حق میں احتجاج کا ایک لفظ
 نجی ادا کیا۔ اللہ اسے اجر عظیم عطا کرے آمین۔ گو کہ دل مطمئن نہیں ہوا اب بات ہو جائے دو شیزہ کے بارے
 میں گزشتہ ماہ کی طرح اس بار بھی سرورق پر امین نیب اپنے معنوی بالوں کا اسیر کرنے کی کوشش میں نظر آئی۔
 اشتہارات پر سرسری نظر دوڑاتے دوڑاتے نگاہ فہرست پر نہ صرف ٹھہر گئی۔ سبکی نام معتبر اور تحریروں دلاویز
 معلوم ہوئیں اسی لیے فوراً صفحہ پلٹا آپ کا ادارہ ہمیشہ کی طرح آپ کی حساسیت کی غمازی کرتا ہوا ہمارے
 احساس کے تاریخی جھنجھٹا گیا۔ ہم سبکی انکسرتدار کی فرض شناسی کو قابل تحسین نہیں گردانتے مگر اللہ سے زیادہ
 کون مہربان ہوگا جو جانتا ہے ہر بات ہر پیر غزالہ عزیز کی کاوشوں کو سلام ہے۔ ام المومنین کے بارے میں
 ہماری معلومات کو مزید جلا دے رہی ہیں۔ دو شیزہ محفل کی رونق قدرے ماند محسوس ہوئی۔ مجھ سمیت بہت سے
 قاری اور لکھاری محفل سے غائب تھے۔ پھر بھی فرحت صدیقی صاحبہ، خولہ عرفان، سنبل، فہیمہ آصف، انیلا
 طالب، عروج فاطمہ نے اپنے منفصل تبصروں سے نہ صرف قارئین کی ترجمانی کی بلکہ لکھاریوں کی بھی صحیح
 توصیف و تعریف کر کے حق ادا کیا۔ نومبر کا شمارہ واقعی بے مثال تھا اور لا جواب تو دسمبر کے شمارے کی تحریروں
 بھی ہیں۔ ناول میں سرفہرست بادسوم ہے۔ تیسری رخ ہمیشہ کی طرح بہت منفرد انداز تحریر اور موضوع کو ہماری
 بصارتوں کی تسکین اور احساسات کی آبیاری کے لیے لے کر آئی ہیں۔ سنبل اور حبیبہ عیسوی بھی اپنے انداز تحریر
 سے متاثر کر رہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ..... تحسین انجم انصاری کی دلدل نے کئی جگہ ذہن کو متحرک
 اور دل کو گداز کر دیا۔ ہمارے اعمال و افعال ہی ہماری ذات کا عکس ہیں جو سبکی شفاف ہوں تو زندگی خوبصورت
 اور اگر غیر شفاف ہو تو واقعی زندگی کسی دلدل میں جھسی محسوس ہوتی ہے۔ سیما کی ثابت قدمی اور یقین نے
 بلا خرقہ و کجالات کی دلدل سے نکال ہی لیا۔ آنکھ کا بال بھی کافی متاثر کن تحریر ٹھہری۔ احمد سجاد بابر مٹی کی
 محبت اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہم اپنی مٹی کی خوشبو سے کتراتے ہیں۔ اور دیار غیر کی صعوبتوں کو حاصل
 زندگی سمجھ کر اپنے پیادوں کی قربتوں کو بھی ترس جاتے ہیں۔ ناامیدی کا سفر مریم شہزادی کی تحریر سرسری محسوس
 ہوئی۔ جیسے بہت جلدی میں لکھا ہو۔ حالانکہ کہانی میں بھرپور جان ڈالی جاسکتی تھی۔ ڈاکٹر عزیزہ انجم اور پینا عالیہ
 کی تحریروں میں بھی متاثر کن تھیں اور سب سے منفرد اور اثر انگیز زرافشاں فرحین شاہ کوئٹہ کے در پر روحانی طور پر
 جانا لگا۔ زرافشاں فرحین آپ کو وہاں جانا اور وہاں کی فضاؤں میں سانس لینا رب کے حضور جھکنا اپنی دعاؤں
 کے لیے گزرتا مبارک ہو۔ اور نبی کریم ﷺ کے روضے کا دیدار بار بار نصیب ہوا آمین۔ ہمارے لیے بھی دعا
 کیجیے کہ وہ ہمیں یعنی جس جس کے دل میں وہاں جانے کی لگن اور تڑپ ہے اسے جلد از جلد اپنے حضور پیش
 ہونے کی سعادت بخشے آمین ثم آمین۔ غزالہ عزیز کا مکمل تعارف اور اثر دیو بہت اچھا لگا۔ اُن کے بارے میں
 جو ابہام تھا وہ بھی دور ہو گیا۔ یعنی یہ وہ ہماری دوسری راسخ غزالہ عزیز نہیں ہیں جو ذرا سا راسخ ہیں۔ نسیم منیر
 علوی اور غزالہ فرح کو ایوارڈ بہت مبارک ہو۔ انصار الدین مرحوم کو اللہ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور
 لواحقین کو مبرا اور رحمت عطا کرے آمین۔ خط ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ فیصحا صف کے بہنوئی کی اچانک وفات کی
 خبر ملی۔ مرحوم گھر سے اپنے آفس بالکل معمول کے حساب سے پچھلے تھے سنا ہے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی
 رحلت فرما گئے۔ فیصحا اور اُن کی چھوٹی بہن کے لیے یہ بہت دکھ کا دور ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی بھوی

اور آٹھ سالہ بیٹی کو صبر و قرار عطا کرے۔ اور بانی لواحقین کو بھی صبر کی توفیق نصیب کرے آمین اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ منزہ جی زندگی میں مزید کتنا سفر لکھا ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ دسمبر کا سفر اختتام پذیر ہوا چاہتا ہے۔ امید روشن خدا کرے کہ نئے سال کا ہر لمحہ محبتوں، صداقتوں کا امین ٹھہرے۔ اور ہم بھی نہ صرف اپنی ذات کے لیے بلکہ اپنے گھر شہر اور ملک کے لیے کارآمد و کارگزار ثابت ہوں اور ہیں آمین ثم آمین۔ آپ نہ بھی کہیں جب بھی کچھ لکھوں گی انشاء اللہ دوشیزہ کے لیے ہی لکھوں گی کیونکہ مجھے دوشیزہ سے محبتیں بھی ملی ہیں اور مان بھی انشاء اللہ البتہ ہے گادعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

بھئی بھئی زمر! آپ یہ جانتی ہیں کہ دوشیزہ کے صفحات ہمیشہ آپ کی تحریر کے لیے حاضر ہوں گے بس یہی یقین قائم رکھیے گا۔ نصیحوں کے بہنوئی کو اللہ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے یقیناً پیچھے رہ جانے والوں کے لیے اب اعصاب شکن دور شروع ہو رہا ہے اللہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اس قدر مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں کہ انسان چاہ کر بھی خوش نہیں رہ پا رہا ہے۔ پہلے یہ بینک سادہ سا نظام رکھتے تھے مگر چوری چکاری اس لیول پر نہیں ہوئی تھی اور اب جتنا بڑا نام ہے اتنا ہی پیکا پکوان ہے بس اللہ رحم کرے ہم سب پر جتنا دنیا کو جانے انسان اتنی ہی کراہیت آتی ہے اللہ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے دل سے دعا ہے زمر آپ بالکل فکر مت کریں کچھ میری کوتاہی ہے دفتر کو ذرا کم وقت دے رہی ہوں۔ رابطہ میں رہیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

✉ خولہ عرفان کراچی سے لکھتی ہیں۔ بہت عزیز و محترم منزہ سہام، مدیر اعلیٰ ماہنامہ دوشیزہ السلام علیکم! نئی امیدوں، نیک ارادوں اور محبتی دعاؤں کے ساتھ نئے سال میں پھر حاضر محفل ہوں۔ اللہ تعالیٰ پوری امت مسلمہ اور خصوصاً اہل وطن کیلئے اس سال اور آنے والے ہر لمحے کو خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ امر رکھے۔ آمین ماشاء اللہ دوشیزہ پوری آب و تاب کیساتھ وقت مقررہ پر ہمارے ہاتھوں کو رونق بخش چکا ہے اور ادارے سے جو دل نے داد و تحسین کا سلسلہ شروع کیا اس کا اختتام رسالہ کا مطالعہ مکمل ہو کر بھی ختم نہیں ہوا۔ ہر افسانے اور ناول کے اختتام پہ بے ساختہ لبوں پہ "زبردست" چل جاتا تھا۔ خیر منزہ ہجیتا آپ نے جس حقیقت سے اپنے ادارے میں پردہ اٹھا یا وہ انداز بیاں سمیت قابل تعریف ہے۔ غیر منصفانہ مزاج ہماری قوم کا طرہ امتیاز بن چکا ہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے آمین۔ غزالہ عزیز ہمیشہ کی طرح غیر محسوس طریقے سے ہماری مذہبی معلومات میں گراں قدر اضافہ کر دیتی ہیں۔ جزاک اللہ غزالہ..... محفل میں بتا چلا کہ سابق آرٹ ڈیزائنر افتخار الدین اس دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ اللہ انکی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ فیصیحہ میں تہہ دل سے مشکور ہوں کہ محفل میں شامل ہو کر میرا مان رکھا۔ لیکن میری روٹی حینہ اپنا تمبر ضرور دیا کرو۔ تمہارا اور سہیل کا تمبر بڑا دو ٹوک قسم کا ہوتا ہے۔ لکھنے والے کو اصلاح ملتی ہے اور دوشیزہ کو توانائی۔ فرح اسلم اپنی غیر حاضری کے ساتھ سرفہرست ہے۔ غزالہ انکی تحریروں کی طرح آپ کے انٹرویو نے بھی نہ صرف بے تحاشہ متاثر کیا بلکہ حوصلہ و ہمت بھی بڑھادی۔ سہیل کا تمبر عشق پوری خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے خوشی ہوئی کہ اسٹیل اور ہانی کو سونی کے انجیر کا پتا چل گیا اور سہرینہ کی بھی وقت نے اکڑ نکال دی۔ بہت عمدہ سہیل ڈاکٹر سید علی ارسلان کا آٹھ کا بال زبردست ناول تھا حقیقت میں مادیت پرستی انسان کو اس کے

رہنے سے ایسا گراتی ہے کہ انسان اور وحشی درندوں میں فرق نہیں رہتا۔ خوبصورت تحریر بہترین اسلوب
 میاں۔ شاہ کوئین..... زرافٹاں کی حقیقتا ہو گماتی تحریر بھی۔ بہت اچھے ماشا اللہ۔ غزالہ عزیز کا وطن والہی بھی
 حب الوطنی اور مٹی سے محبت کی عکاسی کرتی خوبصورت تحریر بھی۔ ڈاکٹر سیمین کا بادامو متحقیقوں کو خوبصورت
 انداز میں بیان کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف کا مزن ہے۔ البتہ شہزادی کی بے بس موت نے معاشرے کی بے
 حسی کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ویلڈن سمیں۔ احمد سجاد کا مٹی کی محبت حقیقتا اندر تک وطن سے محبت کا درس
 دے گئی زندگی کی لا چاری اور بے بسی کی بہترین انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ مریم شہزاد کا ناامیدی..... ادبی
 حلقوں کیلئے لمحہ فکرمیر ہے حالانکہ اس طرح کی حق تلفیاں تو عام مزاج ہوتا جا رہا ہے لیکن ناامیدی کفر ہے۔
 تحسین انجم کے دلدل کا اختتام خوشگوار رہا حالانکہ اگلے لوگوں کا سدھرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سیما نے جس دانش
 مندی کے ساتھ ناقب کو سنبالا اس میں اس کی کاوشوں کے ساتھ قسمت کا بھی بہت دخل تھا۔ تو اتنا آسان
 نہیں ہوتا کسی مرد کو قائل کرنا۔ سعدی سیکھی کا میں ہادی..... متنوع موضوع کے ساتھ بہت عمدہ تحریر بھی انداز
 تحریر اور کہانی دونوں لا جواب تھے بعض اوقات ہم اپنی اتان کی فتح میں خود کو ہار جاتے ہیں ڈاکٹر عزیزہ کا
 دیرنہ..... ہو جائے طبقاتی فرق کو مد نظر رکھنے والے لوگوں کیلئے سبق آموز کہانی تھی۔ انداز تحریر زبردست
 تھا۔ حبیبہ عمیر کا انجمن ہمسفر کے ساتھ زبردست مقابلے پر ہے۔ تیرے ماتھے..... بیٹا عالیہ کے ناول کے کیا
 کہنے۔ ویسے منزہ اس دفعہ ماشا اللہ سارے افسانے ہی ٹاپ کلاس تھے۔ اس دفعہ کا ایوارڈ کاٹنے کے مقابلے
 پر ہے میرا تو سب کو ہی ایوارڈ دینے کا دل چاہ رہا ہے لیکن میں قطعاً آپ کو زیر یار نہیں کروں گی جو مزاج یار ہو میں
 نے تو سب کو اپنا ایوارڈ دے دیا ہے..... ہا ہا ہا..... سخن زار میں زبردست نظمیں تھیں خاص طور پر ارم ایوب کی
 میرے کوزہ گرد اور ڈاکٹر عزیزہ کی پر زخ۔ بہت اعلیٰ..... دو شیزہ گلستان تو مہکتا ہی ملتا ہے ہمیشہ کی طرح۔ چمن
 کارنر کی ریسپیچ زبردست ہیں فوکل کباب تو ضرور ٹرائی کروں گی۔ حقیقتا اس دفعہ دو شیزہ نے اپنی چمپالیسویں
 سالگرہ منانے کا بھرپور حق ادا کر دیا ہے۔ بہت بہت بہت..... مبارک! منزہ جگ جگ جیش آپ اور آپ کا
 کاروان دو شیزہ آئین نے سال کی مبارکبادیوں اور نیک خواہشات کے ساتھ اجازت دیں۔

بھ: سوخت خولہ! تمہارے تبصرے کا شدت سے انتظار تھا مگر تم صاف ہاتھ بجا کر نکل گئیں یقیناً اس بار
 ایوارڈ کا فیصلہ بہت مشکل ہو رہا تھا کچھ مشکل سنبل نے دور کی اور کچھ کی امید مجھے تم سے تھی خیر کچھ احباب ہیں
 جو اپنی رائے دے چکے ہیں اور مجھے پختہ یقین ہے کہ ان کی رائے مکمل حیرت پر ہوئی ہے۔ لہذا 2018ء کے
 آخری ایوارڈ کا نام آپ سب کے سامنے موجود ہے۔ خولہ یقین کرو تم سب کا ساتھ مجھے بہت تقویت دیتا
 ہے ورنہ تجا میرے لیے کہاں ممکن کہ ایڈیٹر کی کرسی پر اجماع رہ سکوں اور انصاف بھی کر سکوں۔ تم لوگ اپنا
 قیمتی وقت مجھے اور دو شیزہ کو دینے ہو اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں بس دعا ہے کہ میرے دوست اور
 احباب ہمیشہ میرے ساتھ رہیں اور تمہارے خط میں ایوارڈ ونگ لائن نے خوب ہنسیاں فرج اسلم اپنی غیر
 حاضری کے ساتھ سرفہرست ہے۔ واہ واہ مزہ آ گیا۔

اور اس آخری خط کے ساتھ اب اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے دو شیزہ کے حصول دعاؤں کی طالب
 میں اگر کوئی بھی دشواری ہے تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے خوش رہیے خوش رکھیے۔
 منزہ سہام مرزا



راحت و فارا جیوت

~~~~~

کہانی نویس افسانہ نگار اور کالم نویس

راحت و فارا جیوت سے ملاقات

~~~~~

ادارہ

~~~~~

س: زندگی آج کل کیا کہہ رہی ہے؟  
 آج کل زندگی بہت کچھ کہنے کی کوشش میں  
 میرے ساتھ بھاگ رہی ہے۔ اور اس بھاگ دوڑ میں  
 ایک لمحہ میں میرا تھک پڑ کر روک لیتی ہے اور کہتی ہے۔  
 اتنا تیز کیوں بھاگ رہی ہوا  
 آؤ بیٹھ کر پہلے کی طرح باتیں کریں  
 رنگوں کی اور خوشبوؤں کی باتیں  
 دل کھول کر قہقہہ لگائیں!

خوبصورت سالہاں پہن کر دوستوں سے ملنے  
 جائیں شاعری کی کوئی خوبصورت سی کتاب پڑھیں  
 پھولوں کی نمائش دیکھنے چلیں..... مگر زندگی کی باتیں  
 سننے کی فرصت کہاں ہے کا حیات میں۔ ابھی زندگی  
 کو تواب خود کہہ دیتی ہوں:  
 پست حوصلے والے تیرا ساتھ کیا دیں گے  
 زندگی ادھر آ جا ہم تجھے گزاریں گے  
 س: ماضی کے جھروکوں کو دا کرنے پر کیا محسوس  
 کرتی ہیں؟  
 میں ماضی میں جھانکنے سے ہمیشہ ڈرتی ہوں اس  
 لیے کہ جہاں ماضی میں خوشگوار لمحات کی یادیں ہوتی  
 ہیں وہیں جو رشتے ماضی میں ہمارے ساتھ تھے ان کو  
 سوچنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ماں باپ تھے تو ہر دکھ  
 پریشانی میں بھی سہارا ملتا تھا اس لیے ماضی کے لمحات  
 جو خوبصورت تھے خوشگوار تھے ان کی یاد ہونوں پر  
 مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ تو دوسری طرف بچھڑے  
 ہوؤں کی یاد آنکھیں بھی نم کر دیتی ہے۔  
 س: گلے کا آغاز کب کیا اور کیا مطمئن ہیں جو  
 آجکل چھپ رہا ہے؟  
 جب سے لفظوں سے آشنائی ہوئی ہے جب  
 حرف جوڑ کر لفظ بنانا سیکھا تب سے لکھنا اچھا لگتا ہے  
 میں بہت چھوٹی کلاس سے ہی اخبار پڑھنے لگی تھی  
 مشکل سے مشکل لفظ بھی جوڑ کر پڑھ لیتی اور لکھ لیتی  
 تھی۔ میں نے پہلے بچوں کی کہانیاں لکھیں میں نے  
 سب سے پہلے افسانہ ہی لکھا تھا اور وہ بھی رومینک۔  
 پھر یہ سلسلہ چل نکلا شاعری بھی کہانیاں افسانے اور  
 اب اخبار میں کالم اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی  
 افسانے شاعری اور کالم لکھ لیتی ہوں اللہ کا شکر ہے!



دکھاتی ہے۔ اب بھی خوشی ہوتی ہے مگر ماں کے  
آنکھوں میں بارش بہت خوبصورت لگتی تھی۔ یہی یادیں  
بارش میں آنکھیں نم کر دیتی ہیں۔

کیسے رنگ سجائی ہے

کتنے خواب دکھاتی ہے

بارش میری آنکھوں کو

آنسو کیوں دے جاتی ہے

س: فلموں سے دلچسپی ہے کیسی فلمیں پسند ہیں؟

ایک زمانہ تھا جب فلموں کا بہت شوق تھا  
رومیٹک فلمیں پسند ہیں انکی پھلکی فلمیں ایک ہیرو  
ایک ہیروئن والی فلمیں اب تو چار چار جوڑیاں ہوتی  
ہیں فلم میں اس لیے ایسی فلمیں نہیں دیکھتی۔

پاکیزہ ایک ایسا فلم ہے جسے میں جب بھی  
دیکھوں بہت اچھا لگتا ہے اب پاکستان میں اچھی  
فلمیں بننے لگی ہیں مگر برائی فلموں کا اپنا ہی مزہ ہے۔

س: کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ زندگی سے کیا سیکھا؟  
لوگوں کو پہچانا بہت مشکل ہے یہ ایک ایسا فن  
ہے جو مجھے بالکل نہیں آتا ہر بار میرا اعزازہ دوسروں

کے بارے میں غلط لگتا ہے۔ مجھے خوش حزان لوگ  
اچھے لگتے ہیں جن کی سٹس آف ہیو مرزہ دست ہو  
اس کے علاوہ باذوق لوگ پسند ہیں۔ ادب شناس

لوگ ایسے لوگوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے  
زندگی سے بھرپور لوگ.....

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ  
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں  
زندگی بہت خوبصورت ہے بہت بڑی نعمت ہے

اس لیے ہزار دکھ تکلیفیں بھی ہوں تو پھر بھی زندگی کا  
ہونا بہت قیمتی ہے۔

عمر کا تھے ماہ سال گزارنے کے بعد ایک سبق  
جو زندگی سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ آپ خدا اپنے آپ  
کی عزت کریں تو دوسرے بھی عزت کریں گے۔

آپ کو اہمیت دیں گے تو دوسروں کی نظر

جو کچھ آج کل لکھا جا رہا ہے وہ بھی اچھا ہے مگر  
ایک فرق کہ پہلے دل سے لکھا جاتا تھا اب گوگل سے  
لی گئی معلومات پر کہانی لکھی جاتی ہے اسی لیے تو آج  
کل کوئی کلاسک ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے پہلے ایک  
جملہ یا پیرا گراف پڑھ کر پتہ چل جاتا تھا کہ یہ فلاں  
رائٹر نے لکھا ہے اب لکھا جاتا ہے پیسے کمانے کے  
لیے پہلے ادب زندگی کا سلیقہ سکھانے کے لیے لکھا  
جاتا تھا تو یہ کہنا چاہیے کہ

اب ادب بھی کمرشل ہو گیا ہے

س: تبدیلی پر یقین رکھتی ہیں؟  
بالکل تبدیلی پر یقین رکھتی ہوں کیونکہ تبدیلی  
کائنات کا حسن اور فطرت کا قانون ہے۔ انسان

ہمیشہ تبدیلی پسند رہا ہے۔ یکسانیت طبیعت کو پروردہ  
کرو دیتی ہے۔ ایک جیسے منظر آنکھوں کو تھکا دیتے  
ہیں اس لیے تبدیلی ضروری ہے مگر محبت بھرے

روئے تبدیلی نہیں ہونے چاہئیں ایک دوسرے کے  
دلوں تک جانے والے راستے تبدیل نہ ہوں۔  
رشتوں اور ان سے جڑے احساسات تبدیل نہ ہوں

ایسی تبدیلیاں انسان کو روگ لگا جاتی ہیں۔  
س: کون سے روئے دکھ دیتے ہیں۔

جب ہم دوسروں کے ساتھ غلطیوں ہوں ان کے  
ساتھ پوری ایمانداری سے چل رہے ہوں اور وہ  
لوگ ہمارے خلوص محبت کا مذاق اڑائیں۔ فائدہ

اٹھائیں جب بہت دکھ ہوتا ہے۔  
س: سردیوں کی بارش سے خوش محسوس ہوتی ہے

یاد کے جنمو آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں۔  
بارش کی یونوں کو تھیلیوں پر محسوس کرتا ہمیشہ

سے اچھا لگتا ہے بارش مجھے جنون کی حد تک پسند ہے  
سارے کام چھوڑ کر بارش انجوائے کرنا اچھا لگتا ہے  
- سردیوں کی بارش یادوں کے در سے پھول دیتی

ہے۔ وہ لمحات جب دوستوں کے ساتھ بارش میں  
بھیٹنا دل خوش کر دیتا تھا بارش سیکے کی الگ ہی رنگ

## اعتراف

زندگی کے ستم  
اس قدر ہیں کہ ہم  
تجھ کو اے جانِ جاں  
پہلے کی طرح نہیں سوچتے  
کوئی آواز ہو  
کیسا بھی ساز ہو  
تیرا لہجہ کسی میں نہیں ڈھونڈتے  
پھر بھی یہ نہ سمجھ  
تجھ کو بھولے ہیں ہم  
تو ہمیں یاد ہے دل میں آباد ہے  
بس زندگی کے ستم اس قدر ہیں کہ ہم  
تجھ کو پہلے کی طرح نہیں سوچتے

## ارادہ

اپنے کمرے کی دیوار سے  
پچھلے سال کا کلیفڈ راتارتے ہوئے  
میں نے سوچا  
کہ اب تمہیں کبھی نہیں سوچوں گی  
اور پھر  
دیوار پر نئے سال کا کلیفڈ لگاتے ہوئے  
میں نے سوچا  
کہ اپنے کمرے کی دیوار سے  
پچھلے سال  
کا کلیفڈ راتارتے ہوئے  
تم نے بھلا کیا سوچا ہوگا.....؟

راحت و قارچہوت

میں میں بھی آپ کی اہمیت ہوگی اس لیے اپنا خیال  
بھی رکھیے۔ بھی کسی کے لیے اپنے آپ کو مانس نہ  
کریں میں نے بھی یہ سبق بہت دیر سے سیکھا ہے کہ  
اپنی ذاتی اپنی اتان کی حفاظت آپ کے ہاتھ میں ہے۔  
بالا آخر تک ہمارے یارو ہم نے تو تسلیم کیا  
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں  
س: دوشیزہ کا ساتھ کیسا پایا؟

دوشیزہ سے میرا رابطہ میری بہت ہی محترم دوست  
رضوانہ کوثر نے کروایا ان سے فون پر رابطہ ہوا انہوں نے  
دوشیزہ کی بہت تعریفیں کیں اور مجھے کہا کہ اس میں کچھ  
لکھوں۔ جب جنوری دوشیزہ پندرہ میں میرا بھیجا ہوا  
پہلا افسانہ محبت شائع ہوا۔ اور جب بھیجا اگلے ہی ماہ  
شائع ہو گیا یعنی دوشیزہ نے میری محنت کو قبول کر لیا اور  
بدلے میں ڈھیر ساری محبتیں دیں پھر کئی کہانیاں میں  
بھی تحریریں بھیجیں اگلے ہی سال راسٹر ایوارڈ مل گیا  
اتنے کم عرصے میں اتنی عزت سے نوازا گیا۔ مجھے بے  
حد خوشی ہے اور میں شکر گزار ہوں دوشیزہ کی۔ میری  
شاعری افسانہ کہانی سب کو اہمیت ملی۔ منظرہ سہام سے  
بات ہوئی تو اتنی نرمی اور محبت سے انہوں نے مخاطب  
کیا کہ دوشیزہ سے محبت اور بڑھ گئی۔

دوشیزہ کا ایک اور بڑا احسان ایوارڈ تقریب میں  
ان راسٹرز سے ملاقات ہوئی جن کے نام سے ہی  
واقفیت تھی۔ ان سب سے مل کر بہت اچھا لگا خوشگوار  
حیرت سب سے ملے۔ اب میں زیادہ تر کالم ہی لکھتی  
ہوں مگر دوشیزہ اور کئی کہانیاں کے لیے اپنی تحریر  
ضرور بھیجتی ہوں۔

اللہ دوشیزہ اور کئی کہانیاں اور اس ادارے کو  
اور عزت و وقار عطا کرے۔

آخر میں سب کے لیے  
غم بانٹنے کی چیز نہیں پھر بھی دوستو  
اک دوسرے کے حال سے واقف رہا کرو

☆☆.....☆☆

# منبر عشق

قسط نمبر (12)

محبت قربانی مانگتی ہے اور جہاں قربانی کا جذبہ نہیں ہوتا وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا...

خوبصورت جذبوں سے کندھی تحریر جو آپ کو بے حد حسین دنیا کی سیر کرائے گی

آدھی کلاس سو رہی ہوتی ہے آدھی جمائیاں لے رہی ہوتی ہے، اور ویسے یہ یا جوج ماجوج کہاں ہیں "شائم نے لمبی تقریر کے بعد پوچھا۔

"ایک نمبر کی جھوٹی ہونم، اتنا اچھا سمجھاتی ہیں مسز بخت پوری کلاس دلچسپی لیتی ہے ان کی کلاس میں اور تم دونوں کو ہی کہاں ہیں یا جوج ماجوج" لیلیٰ نے پورے خلوص سے بتایا۔

"وجہ بتانا پسند کریں گی" شائم نے چون چڑھائے۔ "جملہ خصوصیات کی بناء پر انکی بھی جملہ خصوصیات یہی ہوں گی کہ وہ دنیا میں موجود سب کچھ کھانی کر ختم کر دیں گے اور آپ دونوں بھی کینٹین میں ہر وقت اسی فکر میں جلا ہوتے ہیں" اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"دیکھ رہے ہو بھائی! تمہاری ہونے والی نصف بہتر ابھی سے ہمارے کھانے کو نظر لگا رہی ہے" شائم نے بھائی سے شکایت لگائی۔ "بھئی یہ تم دونوں تند بھادج کا ذاتی معاملہ ہے" اسامہ نے جان بچائی۔ "تو ہونے والی بھابھی! تیار رہنا شادی کے بعد بڑے معرکے ہونے والے ہیں" شائم نے وارننگ دی۔ "ہونے والی تند میں تیار ہوں" لیلیٰ نے شانہ انداز میں کہا اور اس کے بعد وہ تینوں ساری ایکٹنگ بھول بھال کر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے۔ کہ سب مزمز کر ان کو ذہین بنائے گئے۔ "ہم کو دھمکیں دو تمہیں اپنے جیسا بنالیا اور نہ کتنے سڑے ہوئے مزاج کی تمہیں تم" شائم نے فرضی کارکردگی سے کیے۔ "نوازش ہے آپ کی" لیلیٰ نے ترنٹ کہا اور شائم نے معنی خیزی سے اسے دیکھا

☆.....

علیہ کو اپنے بہن بھائیوں کے رویے سے بہت بڑا دھچکا تو لگا ہی تھا اور انہوں نے ساری زندگی جو روار کھا





تھا اپنے بہن بھائیوں کے ہمراہ وہ سلوک، وہ عنایات وہ دن رات یاد کرتی تھیں اب ان کے بہن بھائی جو ہفتے میں تین سے چار بار ضرور ان کے گھر کو روتی بٹختے تھے ان مہینوں ان کے گھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ انہیں اب اپنی بے وقوفیوں پر رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ اپنے مطلبی اور خود غرض بھائیوں اور بہنوں پر یوں کھلے دل سے نہ لٹا تیں تو آج ان کا بھی ایک گھر تو ضرور ہوتا۔ ایک سال ہونے کو آیا تھا اب ان کے بہن بھائی کم ہی ان کے گھر کا رخ کرتے تھے۔ آتے بھی تھے تو شاید یہ اندازہ کرنے آتے تھے کہ اگر ان کے حالات بہتر ہو جائیں تو انہیں پھر سے لوٹنے کی ابتدا کی جائے مگر اب ایسا ناممکن تھا۔ ان کے سامنے ان کے بہن بھائیوں کی منتیں ظاہر ہو چکی تھیں۔ ہاں ان کے بہن بھائیوں کے نہ آنے سے ایک فائدہ ہوا تھا روزانہ کا لنگر بند ہوا تو بچت ہوئے لگی تھی ورنہ مانی کے منع کرنے کے باوجود وہ روزانہ تین سے چار قسم کے کھانے بنا کر ضرور اپنے بہن بھائیوں کے آگے رکھتی تھیں اور چھوٹی موٹی رقوم تو وہ خود ہی اپنے بہن بھائیوں کو دے دیتی تھیں اب یہ بچت ہونے لگی تھی اور اس رقم کو وہ پس انداز کرنے لگی تھیں۔ لیکن مہراں کے ساتھ اب بھی وہ کوئی رعایت کرنے کو تیار نہ تھیں ان کے ساتھ ان کا اور بچوں کا رویہ ہنوز تھا۔ ان کے پاس سے پانی پانی نکلوانے کی کوشش کرتی تھیں مگر وہ بھی انہی کی مانند ہوشیار ہو چکے تھے اب وہ ان کے دام میں نہیں آتے تھے انسٹانٹ اور لٹل کے لیے کی جانے والی saving کے پیسے پچھلے واقعے کے بعد سے انہوں نے گھر لانے ہی چھوڑ دیے تھے اب پہلے وہ انسٹانٹ کی رقم جمع کرواتے تھے پیسے بینک میں جمع کرواتے تھے پھر گھر آتے تھے اب وہ کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ بیٹوں میں ان کے دیسے بھی لا اُنہی پن تھا وہ اپنی دنیا میں مست و مگن تھے اور پھر انہیں اُن کی ماں نے بھی حالات سے لاپرواہ بنا دیا تھا۔ دیسے بھی مہراں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے پہلے جلد از جلد تعلیم مکمل کر لیں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں پھر وہ ان پر ڈسے واریاں اور بوجھ ڈالیں۔



گز رے سال میں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ سوئی اب بہت ڈرنے لگی تھی بات بات پر ڈر جاتی تھی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ اب سوئی نے ان لوگوں کے ہمراہ ہی رہنا شروع کر دیا تھا اس پر گروپ کی لڑکیوں نے باقاعدہ اس کا ریکارڈ لگایا تھا۔ ”ارے بھی! بڑے بڑے لوگ ہمارے گروپ کو عزت دینے چلے آئے ہیں“ متاثر نہ ہوا باقاعدہ سوئی کو ان لوگوں کے ساتھ دیکھ کر آواز لگاتی تھی اور سوئی نے شرمندگی سے سر جھکایا۔ ”بکواس بند کر دناشی! وہ شروع سے ہی ہمارے گروپ میں تھی بس کچھ عرصے کے لیے راستہ بھٹک گئی تھی“ نائلہ نے کہا۔ ”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو میں راستہ نہیں بھٹکی تھی راستہ بھول گئی تھی“ میں ڈارے پچھڑی پچھڑی بن گئی تھی جسے نہ اپنی ڈالرتی تھی نہ راستہ سوچتا تھا“ وہ شرمندگی سے بولی۔ ”بس کر دو، وہ پہلے ہی شرمندہ ہے اسے اور کتنا شرمندہ کرو گی“ ابھن نے سب کو شرم دلوائی۔ ”نہیں بھی! ایسے کیسے معاف کر دیں ٹریٹ تو بنتی ہے“ متاثر نہ ہوئے عیدے بن سے کہا تو سب نے چونک کر اسے دیکھا اور سب کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی۔ ”واقعی ٹریٹ تو بنتی ہے“ ان سب نے کورس میں کہا اور سوئی پہلی بار کھل کر مسکرائی۔



اور پھر کچھ ہی عرصے بعد اسے ایسا نہ پکڑ لیا۔

”کیا بات ہے سونی! مجھ سے کیا خطا کیا قصور ہوا ہے جو تم نے مجھ سے ملنا اور بات کرنا چھوڑ دی ہے، انصاف تم دونوں کا خود کا تھا۔ میں تو اس میں بھی کہیں انوالو نہیں تھی اب مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس قدر کمینہ ہے اور اس طرح سے بلیک میلنگ پر اتر آئے گا اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں خود تمہیں اس کی طرف بڑھنے سے روک دیتی، بہر حال ایٹا نے واقعی خود کو اس معاملے میں صاف ہی رکھا تھا۔ سونی اب وہ پہلے والی سونی تو رہی نہیں تھی، بے باک و منہ پھٹ اب اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے ابھی بھی ایٹا کو دیکھ کر اس کے ہاتھوں میں لرزش آگئی تھی اور بدل بھی لرزے لگتا تھا۔ ”وہ ایٹا! بات یہ ہے کہ بابا نے مجھے منع کیا ہوا ہے کسی کے بھی ساتھ رہنے سے“ سونی با مشکل بولی تھی اور اس میں بھی اس کی آواز کی لرزش بخوبی محسوس کی جا سکتی تھی۔ اور ایٹا نے اسے دلچسپی سے دیکھا یہ تو ذری ہوئی سہمی ہوئی چڑیا ہے اس کے پر کاٹنے تو بہت آسان کام ہے فواد کو بلانا پڑے گا مگر کچھ وقت درکار ہے۔ اسی وقت سامنے سے ایشل اور ہانی آئیں۔ ”سونی چلو یہاں کھڑی ہو“ ہانی نے ایٹا کو نظر انداز کر کے اس کے برف کی طرح سرد ہاتھ تھامے۔

”اچھا نیلی! ہم بات کر رہے تھے، میں سونی سے شکوہ کر رہی تھی کہ اس نے تو مجھے قطعی طور پر بھلا دیا ہے مگر آتا تو دور کی بات ملنا بات کرنا حتیٰ کہ فون تک کرنا چھوڑ دیا ہے، بڑی بے وفادار دوست ہے سونی“ ایٹا نے بڑے ناز سے کہا۔

”وہ بات یہ ہے محترمہ ایٹا صاحبہ! کیونکہ فواد آپ کا ہی کزن تھا بلکہ ہے تو آپ بھی ہمارے شک کے دائرے میں شامل ہیں۔ اسی لیے آپ سے ملنے پر پابندی ہے اور اگر آپ میں بھی ذرا بھی شرم و حیا لحاظ ہوتا تو آپ کبھی بھی دوبارہ اس کے سامنے نہ آتیں۔ نہ کہ آپ اس سے بات کرنے کھڑی ہو گئیں“ ہانی نے خاصے کڑوے لہجے میں چبا چبا کر کہا ”آپ سونی سے معلوم کر لیں کہ میں اس سارے معاملے میں کہیں انوالو ہوں یہ ان دونوں کا آپس کا معاملہ تھا تو پھر میں کیوں شرمندہ ہوتی پھروں“ ایٹا کی ڈھٹائی قابلِ دید تھی۔ ”ہمیں سونی سے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہماری اپنی معلومات خاصی وسیع ہیں اس لیے آپ اپنا راستہ لیں تو زیادہ بہتر ہے“ ایشل نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے ایٹا کی آنکھوں میں دیکھا اور پہلی بار ایٹا نے گھبرا کر نظر چرا لیا اور اس کے بعد ایٹا پورے سال میں بھی سونی کے سامنے نہیں آئی۔ ہاں لیکن جاتے جاتے نور کو جگانا نہیں بھولی تھی ”تم کر کیا رہی ہو یہاں بیٹے کر کام تیز کرو مجھے اس ایشل کے جلد از جلد پر کترنے ہیں“ وہ جلی ہوئی ایشل نے اس کی ذم پر پیر رکھ دیا تھا، نور یا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ”وہ بی بی پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تم پر کترنا چاہتی ہو“ وہ کہہ کر دوبارہ ہنسنے لگی۔ ”بی سیر لیس! تو میرا اس معاملے کو جلد از جلد فائل کرو۔ مجھے ایشل اپنے آگے گروٹھراتی ہوئی چاہیے“ ایٹا نے کہا اور نور یا پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ ”تمہی ہی نے تو کہا تھا ان نانیوں، دادیوں، نائپ لڑکیوں پر زیادہ وقت لگانا پڑتا ہے، یہاں بہت برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور شہنشاہ کر کے کھانے کی عادت ڈالو وغیرہ وغیرہ کہاں گئے ایٹا بی بی! آپ کے وہ عظیم افکارات۔ اب آپ کو پتہ لگا ہے کہ آپ مجھے کتنی مشکل لڑی پیچھے لگا کر گئی ہیں۔ کوئی ایک بات کر دو تو ایک کھٹنے کا وعظ تو پا ہوتا ہے کبھی آپ بھی کچھ کہہ کر مستفید ہوئیے گا“ وہ طنز یہ بولی۔

”مجھے اس کے سامنے نہیں آنا ہے اس سلسلے میں ورنہ میں دکھائی تمہیں کہ یہ کام اتنا بھی مشکل نہیں ہے جتنا تم

لے بنا دیا ہے وہ تپ لڑبولی اور نوبل ایک بار پھر ہنس پڑی۔ ”سوئی پر ورک کرتے ہوئے جی بارلوس کو آپ نے بھی کی تھی ایٹل کو گھیرنے کی ہمیشہ منہ کی ہی کھائی تھی اور سوئی پر کون سا بڑا شاندار ورک کیا ہے ہمارے آدھے ورکرز کو انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا ہے اس لیے ایناجی! پلیز میرے سامنے اپنی عظمتوں کے گن مت گایا کریں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کی کارکردگی ”نویرانے نخوت سے کہا اور اینا غصے سے پاؤں پٹختی وہاں سے چل دی اور نویرا نے لا پرواہی سے سر جھٹکا اور پاکٹ آئینہ نکال کر اپنا جائزہ لے کر لپ اسٹک نکال کر ہونٹوں کو شپ دینے لگی۔

.....☆.....

اسامہ یونیورسٹی کے ہمراہ پاکستان ٹور پر جا رہا تھا اور لیلیٰ اسے بہت بار منع کر چکی تھی کہ وہ نہ جائے مگر وہ مان ہی نہ رہا تھا۔ ”اسامہ! پلیز نہ جاؤ یہ نہیں کیوں یہ بات سنتے ہی میرا دل گھبرانے لگتا ہے، لیلیٰ نے بڑی بے چارگی سے کہا تھا حالانکہ ساتھ شام بھی جا رہی تھی۔ مگر یہ نہیں لیلیٰ کو شام کے حوالے سے نہیں مگر اسامہ کے حوالے سے بڑی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ”اوہو اتنی محبت..... یہ کب ہوا بھی“ اسامہ نے شرارت سے پوچھا۔ ”اسامہ فضول بات نہ کرو پلیز، مت جاؤ“ اس نے پھر سے کہا۔ ”بھائی! اگر وہ کہہ رہی ہے کہ اس کا دل گھبرا رہا ہے تو نہیں جانتے یہ نہیں کیوں جانے کو تو میرا بھی دل نہیں چاہ رہا ہے، دل خالی خالی سا ہو رہا ہے کوئی excitement کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی ہے ورنہ یہاں پلنگ پر بھی جانے کا ہوتا ہے تو کتنی خوشی ہوتی ہے“ شام نے پہلی بار اسامہ سے اپنی فیکنگ شیر کیں۔

”ایک تو تم عورتیں بڑی ہی وہمی ہوتی ہو۔ اپنے افکارات و خیالات میں آدھے سے زیادہ ہندو اندہ ذہنیت کی حامل۔ اور جو کچھ جیسے ہوتا ملے ہوتا ہے وہ ویسے ہی ظہور پذیر ہوتا ہے خواہ میں ٹرپ پر جاؤں یا نہ جاؤں جو میرے لیے لکھا ہے وہ ویسے ہی ہوگا“ اسامہ نے دونوں کو سمجھایا۔

”بھائی یہ عورتیں کسے کہا ہے“ شام نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔ ”آف کورس تم دونوں کو.....“ اسامہ نے مسکراہٹ لبوں تلے دبائی تھی۔ ”بھائی! پہلی فرصت میں نظر چیک کر دائیں۔ یہ دو تھی تھی بچیاں آپ کو عورتیں نظر آ رہی ہیں“ شام نے زروٹھے پن سے کہا۔

”اللہ کو مانو شامی! ننھی ننھی بچیاں اب ایسے سفید جھوٹ بھی نہ بولو جو ہضم ہی نہ ہو۔ تم تو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسی چلی آتی ہو“ وہ تہقیر لگاتے ہوئے بولا۔

”بھائی زیادہ بدتمیزی ہو گئی ہے تو ہاضمو لا دیں مگر آئندہ آپ نے ہم دونوں کو عورتیں کہا تو یہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگا“ ان دونوں کی شوخیاں اسے عروج پر تھیں مگر لیلیٰ سن دل و دماغ سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اسے اس بات پر اتنی گھبراہٹ تھی کہ وہ وہ ان دونوں کی کسی بات پر کھل کر مسکرا بھی نہیں سکتی تھی۔ اور اس بات کو اسامہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔

.....☆.....

صبح سوئی نے اٹھ کر اپنا موبائل چیک کیا تو ایک unknown نمبر سے میسج تھا کہ ”میں تمہیں کالج کے باہر ملوں گا“ اور وہ سرتاپا کانپ گئی یہ نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ یہ کوئی اور نہیں فواد ہی ہے۔ اس نے تیزی سے یہاں وہاں دیکھا اور شہر و ز نے اسے اس طرح دیکھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے سوئی، کچھ چاہیے کیا؟“

دو نمبر 32

نہ

”نہیں بابا وہ بھائی کہاں ہیں، نظر نہیں آ رہے“ اس نے تیزی سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا۔ ”اس کی آج کوئی بہت اہم میٹنگ تھی اس لیے وہ جلدی نکل گیا ہے۔ کوئی کام ہے اس سے؟“ انہوں نے بتا کر پوچھا۔

”نہیں بابا..... وہ میری بھی ایک ضروری کلاس تھی تو میں نے سوچا کہ میں جلدی چلی جاؤں گی بھائی کے ساتھ ہی“ اس نے بات بتائی۔ ”زیادہ ضروری ہے تو میرے ساتھ چلو میں تم تینوں کو چھوڑ دیتا ہوں“ شہروز نے آفر کی۔ ”نہیں بابا اب تو دین آئے والی ہے ہم چلے جائیں گے“ سونی نے تیزی سے کہا پہلے اس نے سوچا کہ وہ چھٹی کر لے مگر پھر سوچا جب تک۔ کیا کیوڑ کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ نکل جاتا ہے اور وہ ایسکی تو نہیں ہوتی اس کے ساتھ ہانی اور ایٹل بھی تو ہوتی ہیں اور دوسرے ہی لمحے وہ جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

.....☆.....

بالکل آخری لمحات میں شام کا جانا کینسل ہو گیا اور اب تو لیلی کے دل کو کچھ لگ گئے تھے۔ مگر اسامہ تھا کہ اس کی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا اور پھر وہ چلا گیا وہ ہر خوبصورت اور حسین شام کی تصویر لے کر اسے بھجوتا سوات، کالام، اوشو، گلکشمر مری، شکر پڑیاں، ایویہ، تھیاگلی اور وہیں اچانک ہی اسے climbing کا شوق چڑھا اور اس دوران وہ مختلف میڑے میڑھے اور اونچے پہاڑوں پر climbing کرتے ہوئے..... اپنے دوستوں کے ہمراہ تصاویر بھجوتا اور وہ اس کے لیے نفل پڑھ پڑھ کر اس کی لمبی زندگی اور صحت کی طویل دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اسے منع بھی کرتی اس ایڈوچر سے مگر وہ سنتا ہی کہاں تھا۔ اس کی زندگی ایک فن تھی ایک مستی تھی۔ اور بالآخر اس نے یہ مژدہ جانفزا سنا یا کہ دو دن بعد اس کی واپسی ہے اور اسی دن اس نے شکرانے کے نفل پڑھے اور بہت دنوں بعد وہ سکون کی نیند سوتی تھی۔

.....☆.....

ایٹل چلتے چلتے ایک دم سے سونی کو دیکھ کر چونک کر رہی اور پھر اس نے سونی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور فوری طور پر اس کا ہاتھ اپنے بیک کے اندر گھوما اور باہر نکلا تو اس میں موبائل تھا۔ اور اس نے ساتھ لاپرواہی سے چلتی ہانی کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا ”چلو آؤ سیٹھی لیٹے ہیں“ اس نے ہانی سے کہا اور ہانی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہنہ۔ یہ تمہیں کیا شوق کہاں سے لگا ہے“ اس نے ایٹل کو دیکھا۔ ”بس لگ گیا ہے اب ادھر آؤ جلدی ہے“ ایٹل نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا اور ہانی نے سمجھنے والی اداکاری کرتے ہوئے موبائل کی جانب دیکھا۔ ”یہ کیسی سیٹھی ہے جس میں ہم نظر نہیں آ رہے بلکہ بیک پر موجود لوگ نظر آ رہے ہیں“ اس نے حیرت سے ایٹل کو دیکھتے ہوئے کہا جو انداز ایسا بنائے کھڑی تھی جیسے سیٹھی لے رہی ہو مگر گیٹ سے باہر نکلنے کے درخت کے نیچے کھڑے لڑکے کو فوکس کر رہی تھی۔

”ایٹل ایہ کیا حرکت ہے یہ نہ ہماری تعلیمات ہیں اور نہ ہی ہماری تربیت“ ہانی نے برہمی سے کہا۔ ”ارے گولی مارو تعلیمات اور تربیت کو یہ بتاؤ اگر اس لڑکے کی فریج داڑھی اڑا دی جائے، بال بڑھا کر گلاسز اتار دیے جائیں تو کیا یہ لڑکا فوڈ نہیں ہے“ ایٹل نے اس لڑکے کی تصویر کو capture کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں واقعی مگر تم نے کیسے پہچانا اسے یہ تو بالکل بدلا ہوا لگ رہا ہے“ ہانی نے فوراً تصدیق کی مہر ثبت کی۔

”میں نے نہیں پہچانا سونی اسے دیکھ کر ڈر رہی تھی اور غالباً ابھی بھی اسی ٹرانس میں ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں





ہے کہ ہم اس کے ساتھ چل رہے ہیں، ایشل نے تصویر گیلری میں جا کر دیکھی۔

”اتنا بُرا کچلکی ہے خود کے ساتھ مگر باتیں چھپاتا نہیں چھوڑے گی“ ہانی نے جل کر کہا۔ ”پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ..... تم اسے سنبھالو مخالف بیان داغنے کے بجائے میں ایک کام کر کے آتی ہوں“ ایشل نے ہانی کو سونی کی جانب روانہ کیا اور خود نواد کی تصویر شان اور فرہاد کو سینڈ کر دی۔ ساتھ ہی میسج بھی کہ نواد نئے گیٹ اپ میں کالج کے باہر۔ اور موبائل بیک میں ڈال کر ان دونوں کی جانب چل دی۔

☆.....

نواد گینگ پڑا گیا کیس کو میڈیا پر نہیں آنے دیا گیا تھا بہت چھوٹی سی خبر دی گئی تھی کہ راجیل صاحب کے مطابق ان کی بیک پر بڑے بڑے مگر چھ ہوتے ہیں مگر مام، اینا، نویر، نواد، اور عالم کے علاوہ بھی کئی لڑکے لڑکیاں اور مام تھیں۔ فرہاد نے انہیں ان سب کی تصویر دکھائی تھی اور ایشل کھڑے قد سے بیڈ پر بیٹھی تھی اور فرہاد اور ہانی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”کہا ہوا ایٹو..... طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ فرہاد نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہانی یہ نویر ہے۔ یہ اکثر مجھے اکیلے میں ملتی تھی اور اپنے کزن کے حوالے سے فورس کرتی تھی وہ تو میں ہی اس کے دام میں نہیں آتی۔“ ایشل ایک تصویر پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی اور ہانی اور سونی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تو گویا یہ گروہ تمہارے بھی چکر میں تھا۔“ ہانی کی خوفزدہ سی آواز نکلی۔ ”تمہیں پتہ ہے ایٹو! تم کیوں ان کے چنگل سے بچ نکلیں کیونکہ تم بہت سی دعاؤں کی امان میں ہو۔ تم پردادی اور تانی امی کی تربیت کے رنگ بڑے گہرے ہیں۔ ہم پر شاید دعاؤں کی امان تو سے دادی کی..... کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا مگر تربیت سے عاری..... لڑتے جھگڑتے ماں باپ کے بچے یوں ہی بگڑ جاتے ہیں حالات کے پھور میں پھنس جاتے ہیں“ سونی نے دکھ سے کہا۔

”ضروری نہیں ہے سونی! ہم دونوں بھی انہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور same حالات سے ہم بھی suffer کر رہے ہیں بس بات یہ ہے کہ کون حالات کو مثبت انداز میں لیتا ہے اور کون منفی حالات میں..... میں نے اور بھائی نے حالات سے سبق سیکھا فرار نہیں اور تم نے فرار سیکھا سبق نہیں“ ہانی نے بغیر کسی رعایت کے کہا اور سونی نے شرمندگی سے سر جھکا یا۔

”ایک اور بات بھی ہے ہانی..... کچھ بچے حساس بھی زیادہ ہوتے ہیں وہ حالات کے کشمکش کو زیادہ محسوس کر کے خود پر حاوی کر لیتے ہیں اور پھر فرار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے“ ایشل نے آہستگی سے سونی کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنایا اور اس نے ممنونیت سے ایشل کو دیکھا ”ہاں اور ایسا عمو آسب سے چھوٹے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ تم کو کہتم اور سونی جڑواں ہو مگر ہم نے ہمیشہ ہی سونی کو گھر کے سب سے چھوٹے بچے کی طرح ٹریٹ کیا ہے سو میں سونی کو اتنا تصور دار نہیں سمجھتا۔ کچھ فرائض بطور بہن بھائی ہمارے بھی تھے جن سے ہم غافل رہے ہیں“ فرہاد نے ایشل کی بات کی تائید کی۔ اور سونی کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

”نہیں بھائی! اب ایسا بھی نہیں ہے میں نے بہت بار سونی کو اینا کی گید رنگ سے دور رہنے کو کہا جب یہ ڈسٹرب تھی تب بھی میں نے بہت بار اس سے پوچھا مگر اس نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا“ ہانی کو آنسو بہت تھا۔

”جی بھائی ہانی درست کہہ رہی ہے اس نے مجھے آگ میں کودنے سے بہت منع کیا تھا مگر میں خود ہی اس آگ میں کودنے کو تیار تھی اور یوں بھی انسان بڑا نادان ہے وہ شر ایسے مانگتا ہے جیسے خیر“ وہ نم لہجے میں بولی۔

”چلو چھوڑو پرانی باتوں کو..... سانپ تو نکل گیا اب لکیر سینے کا فائدہ“ ایشل کی اردو دادی کی سنگت کی وجہ سے خاصی باعناد رہ گئی۔ ”اور اب تو یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے“ ایشل نے ہاتھ جھاڑے۔ ”نہیں ایشل ایہ مسئلہ حل نہیں ہوا ہے وہ لوگ اتنے بھی ہلکے نہیں ہیں، میڈیا تک نے تو کوریج کی نہیں اس خبر کی بلکہ میڈیا میں تو بہت ہلکے پھلکے انداز میں یہ خبر دی گئی ہے“ ہانی نے فکرمندی سے کہا۔

”ہاں ہانی ٹھیک کہہ رہی ہے ایشل! ان لوگوں کو جلد از جلد چھڑوا لیا جائے گا اور کیس بھی کسی نہ کسی طرح کمزور کر دیا جائے گا اس لیے تم تینوں کو ہی careful رہنے کی ضرورت ہے“ فرہاد نے ہانی کی بات کی تائید کی۔



لیلیٰ نے بڑا خوفناک خواب دیکھا تھا۔ اس نے خود کو صحرائ میں رہ رہے پابھاگتے ہوئے دیکھا تھا یہ نہیں کتنی مسافتیں چلنے کے بعد اسے نخلستان نظر آتا ہے وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھتی ہے تو یہ نہیں کہاں سے بہت سے لوگ ہاتھوں میں پتھر لیے نکل آتے ہیں اور اسے مارنے لگتے ہیں وہ ان سے بچنے کے لیے دوبارہ صحرا کی طرف بھاگتی ہے اور بھاگتے قدم کے ساتھ پتھروں میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے وہ لہو لہان ہو کر گر جاتی ہے تو سامنے سے مشعل برادر آ جاتے ہیں اسے جلانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور منظر کے ساتھ ہی گھبرا کر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور جب وہ جاگتی تو اسپلٹ کی کولنگ کے باوجود پوری پسینے میں نہائی ہوئی تھی اور پیاس سے اس کی زبان ترش رہی تھی اور حلق میں کانٹے چھو رہے تھے۔ اس نے تیزی سے سانس ٹھیک پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل اٹھا کر لیوں سے لگائی۔ اور اس میں موجود سارا پانی اپنے اندر اٹھ لیا۔ اس کو گھبراہٹ اتنی شدید تھی کہ بلا وجہ ہی اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کے لیے کمرے میں رکنا محال تھا۔ اور وہ ننگے پاؤں باہر کی جانب بھاگی جہاں اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی عالی لاؤنج میں بیٹھی رو رہی تھیں اور سکندر انہیں چپ کر وارہے تھے۔

”ماما کیا ہوا ہے، کیا بات ہے؟ مجھے بتائیں“ وہ بھاگتی ہوئی جا کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”بیٹا کچھ نہیں ہوا ہے..... وہ ذرا بی بی جان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے ان کو ہسپتال لے کر گئے ہیں اسی وجہ سے تمہاری ماما رو رہی ہیں تمہیں پتہ تو ہے دل کی کتنی چھوٹی ہیں یہ۔ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہیں“ سکندر نے کہا مگر اس نے تو جیسے سکندر کو سنا ہی نہیں..... ”ماما اسامہ کو کچھ ہوا ہے نا؟“ اس کا لہجہ سرد اور نظریں اندر تک اترنے والی تھیں اور سکندر اور عالی دونوں کی رینڈھ کی ہڈی میں سردی لہر گزری اور دونوں نے ہی چونک کر اسے دیکھا۔ جو بغیر پلکیں جھپکے ماما کو دیکھ رہی تھی۔ اور ان دونوں سے جھوٹ بولنا ناممکن ہو گیا۔ ”بیٹا صبر کرو رب کی یہی مرضی تھی“ سکندر نے اس کا کاندھا تھپکا۔

”کتنا صبر کروں بابا! اور ہر بار میں ہی کیوں صبر کروں بابا!“ آنسو موتیوں کی قطاروں کی مانند اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے اور عالی۔ نہ اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ”ماما کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟“ وہ سرگوشی میں بولی تھی۔



”اپنے دوست کو ڈوبنے سے بچانے کے چکر میں وہ خود بھی دریائے سوات کی تندی و تیزی کا شکار بن گیا“ عالی کے آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے۔

”پھر تو وہ شہید ہوا ماما! کسی کی جان کی حفاظت کرنے کے لیے اس نے اپنی جان دی ہے“ اس نے اس بار آنسو پونچھ کر بڑے صبر و حوصلے سے کہا اور اس بار سکندر بھی آنکھوں کی نمی پر قابو نہ پاسکے۔

.....☆.....

اسامہ کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ایسی جوان موت۔ اور ایسا زندہ دل اور چٹکے چھوڑتا وجود خاک ہو گیا تھا۔ لیلیٰ کی فیملی سے سب ہی لوگ آئے تھے۔ جب لیلیٰ، سکندر اور عالی آئے تو شائع بھاگتی ہوئی آکر اس کے گلے لگ گئی۔ ”کتنا منع کیا تھا تم نے لیلیٰ! مگر بھائی نہیں مانتے۔ وہ مانتے بھی کیسے انہیں تو وہ مقامات ابدی نیند سلانے کے لیے ہمارے تھے۔“ وہ بول رہی تھی اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے چہرے پر گر رہے تھے۔

”ہنہ! منحوس جس کے نصیب پر پڑتی ہے اس کے نصیب پر سیاهی پھیر دیتی ہے“ آمنہ نے نخوت سے کہا۔  
”آمنہ! موت چوتھیں ہو اس وقت تو دل کی تختی کم کر لو.....“ سبرینہ نے تنبیہ کی۔ ”تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں سبرینہ!“ آمنہ نے استہزائیہ انداز میں چوٹ کی۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو میں بھی تو انہی لوگوں میں شامل رہی ہوں جنہوں نے عرصے تک بلاوجہ اس معصوم بچی کو پتھروں کی زد میں رکھا ہے“ انہوں نے آہ بھری۔

مگر ان باتوں کا کچھ نہ کچھ شائع کی کانوں میں جا پڑا۔ ”خبردار! جو کسی نے اسے منحوس کہا اگر بھائی اس کی بات مان لیتے تو آج ہمارے درمیان ہوتے۔“ شائع نے روتے ہوئے چیخ کر کہا اور لوگوں کو گوسپ کے لیے ایک اور موضوع مل گیا اور لیلیٰ کے ماتھے پر ایک اور داغ لگ گیا طلاق یافتہ ماں کی بیٹی کے ساتھ ساتھ اب وہ منحوس بھی ہو گئی تھی۔

.....☆.....

واپسی پر بی بی جان اور بابا جان ان تینوں کو اپنے ہمراہ گھر لے آئے تھے۔ ایٹل نے لیلیٰ کو کچھ کھلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ بھی کھانے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اور اس کے حلق سے جب سے اس نے یہ خبر سنی تھی کچھ نہیں اترتا تھا۔ اور پھر ایٹل اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اور گرم دودھ میں زنگولائز ملا کر اسے زبردستی اپنی قسم دے کر پلایا اور اب وہ پورے دو دن بعد سوئی تھی۔ کیونکہ اسامہ کی ڈیڈ باڈی کراچی آنے میں پورا ایک دن لگا تھا۔ ایٹل کمرے کی لائٹ اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی آج وہ بہت دھکی دھکی کہہ چکی تھی کہ پونچھ لیلیٰ کا بھی کیسا نصیب ہے کوئی بھی خوشی ان کی زندگی کا مستقل حصہ بنتی ہی نہیں ہے سوچتے سوچتے وہ لاؤنچ میں آگئی جہاں عالی بی بی جان کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھیں اور آنسو ایک تو اترے ان کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ”مجھے سمجھ نہیں آتا بی بی جان مجھ سے یا میری بیٹی سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی پکڑ قسم ہی نہیں ہوتی“ وہ بری طرح سسکی تھیں اس ایک سال میں اسامہ انہیں بے حد عزیز ہو گیا تھا اور وہ تھا بھی ایسا ہی جودلوں میں اترنے کے فن سے واقف تھا۔

”اب اگر میں کچھ کہوں گی تو تمہارے بابا اور تمہیں دونوں کو ہی برا لگے گا“ بی بی جان نے کہا۔ ”نہیں بی بی

جان! آپ بتائیں مجھے کہ مجھ سے یا میری بیٹی سے کی کوتاہی ہوئی ہے؟“ عالی نے ہمت سے کہا۔

”عالی! میرے بچے! ایک فیصلہ ہمارا ہوتا ہے اور ایک فیصلہ اللہ کا ہوتا ہے وہ اپنا فیصلہ بار بار ہمارے سامنے لاتا ہے اور ہم کبھی اپنی انا کے زعم میں اور کبھی اپنے تحفظات کے سلسلے میں اس فیصلے کو بار بار رد کرتے ہیں اس فیصلے سے بار بار نکرانے ہیں اور بہر حال ہوتا وہی ہے جو اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے اور ہم رد کرنے والے اور بار بار نکرانے والے پاش پاش ہو جاتے ہیں کیونکہ اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں لوح محفوظ پر رقم ہوتے ہیں کوئی مضبوط سے مضبوط چٹان بھی اللہ کے فیصلے کے آگے بھربھری مٹی کا ڈھیر ہے“ بی بی جان آہستہ آہستہ بولتی چلی گئیں اور عالی ایک لمبے اسٹریس سے ابھی تازہ تازہ گزری تھیں لہذا ساری بات وہ نا سمجھی سے سنتی رہیں ”میں سمجھی نہیں بی بی جان! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“ وہ نا سمجھی سے بولیں۔

”تم دونوں میاں بیوی مان کیوں نہیں لیتے کہ شان اور لیلیٰ کا ساتھ رب کا فیصلہ ہے جسے تم دونوں اپنی انا اور تحفظات میں شکر اے چلے جا رہے ہو اب تو سرینہ بالکل بدل چکی ہے لیکن جب وہ بدلی نہیں تھی میں نے تب بھی تم سے کہا تھا کہ کچھ چیزیں اللہ کے لیے بھی چھوڑ دو ہر یو جھم دوں میاں بیوی نے ہی اٹھا رکھا ہے اور جب پاش پاش ہو رہے ہو تو اپنے گناہ، خامیاں اور خطائیں ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے ہو حالانکہ تمہاری خطا تو بالکل سامنے ہے“ بی بی جان نے دو ٹوک کہا۔

”وہ ہماری بیٹی ہے بی بی جان! کیا ہمیں اس کی شادی اپنی مرضی سے کرنے کا حق نہیں ہے؟“ عالی نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

”ہے بالکل ہے مگر جب ایک چیز بار بار سامنے آ رہی ہے بار بار لائی جا رہی ہے تو سے قبول کرنے میں کیا عار ہے جبکہ سامنے کیے گئے فیصلوں کی برائیاں اور خامیاں بھی تمہارے سامنے عیاں ہو رہی ہیں اور پھر اس بچے میں کوئی برائی کوئی خامی بھی تو ہو کہ یہ کفرانِ نعمت بھی تو ہے، تمہیں سرینہ سے اختلافات تھے چلو اب وہ بھی ٹھیک ہو گئیں اب کیا مسئلہ تھا“ بی بی جان آج عالی کو کسی طور پر بخشنے کو تیار نہیں تھیں۔

”بی بی جان! ہم اسامہ کے گھر والوں کو ہاں کر چکے تھے وہ بھی بھلا کچھ تھا اب اس کی زندگی ہی کم تھی تو کوئی کیا کرتا“ عالی نے دکھ سے کہا۔

”چلو یہ سب تو منجانب اللہ ہے ایسا ہی ہونا لکھا تھا بہر حال اب اگر سرینہ رشتہ دیں تو انکار مت کرنا اور سکندر کو بھی سمجھا تا کہ وہ کفرانِ نعمت نہ کریں“ بی بی جان نے سمجھا یا۔

”وہ بھی اب شاید ہی رشتہ دیں کیونکہ اب تو میری بیٹی پر منحویت کا ٹھپہ بھی لگا دیا ہے آپ کی چھوٹی بہو نے“ عالی نے آنکھوں کی نمی کو دودھنے کے کنارے میں جذب کیا۔

”ان کو جواب بھی تو سرینہ نے ہی دیا تھا“ بی بی جان نے فوراً جواب دیا۔

”ہاں دیا تو تھا مگر خیر دیکھتے ہیں ابھی تو لیلیٰ کی مینٹل کنڈیشن بہت خراب ہے، ابھی تو جب تک اس کی کنڈیشن stable نہیں ہوتی مجھے ایسی کوئی بات نہیں کرنی بہت suffer کر لیا ہے میری بیٹی نے“ عالی نے قطعی لہجے میں کہا۔

”وہ تو سنبھل جائے گی ان شاء اللہ۔ پہلے تم خود کو سنبھال لو اور سمجھا بھی لو اب غلطی مت کرنا اب تمہارے



پاس غلطی کی کوئی گنجائش باقی نہیں بچی ہے“ بی بی جان نے کہا اور انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”بیٹا! تمہاری بی بی جان بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سکندر کو کبھی سمجھانا اس سلسلے میں اگر وہ نہ سمجھیں تو مجھے  
 بیٹا میں سمجھاؤں گا ان کو“ بابا جان نے بی بی جان کی تائید کی۔

”ابھی تو سب سے زیادہ بابا جان نہیں خود کو سمجھانا ہے، بڑا عزیز ہو گیا تھا اسامہ اس ایک سال کے عرصے  
 میں ہم دونوں کو۔ اور لیلیٰ کے لیے تو یہ ہم سے بھی بڑا سنا ہے۔ اس کی کچھ ہی عرصے میں اسامہ سے شادی  
 ہونے والی تھی۔ ظاہر ہے اس کی توجہ بانی واسطی بھی ہو چکی ہوگی اسامہ سے“ عالی نے سسکی روکی تھی۔

”بیٹا! وقت سب سے بڑا مرہم ہے، انشاء اللہ ابھی کچھ وقت گزرے گا تو ہم سب اس phase سے نکل  
 آئیں گے کہ ہائے یہ کیا ہو گیا اب کیا ہوگا آگے تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور یہ تو تمہیں پتہ ہے ناں جب  
 اندھیرا گہرا ہو جائے تو سحر نزدیک ہوتی ہے اور جب اللہ ہم سے کوئی بہتر چیز دلائیں لے لیتا ہے تو بدلے میں  
 بہترین چیز عطا کرتا ہے“ بابا نے یہ کہہ کر عالی کو احساس دلایا کہ وہ اس موقع پر تہمتیں ہیں سب ان کے ساتھ  
 ہیں اور عالی کو شرمندگی ہوئی کہ انہوں نے صرف اس غم کو اپنے گھر کا غم سمجھا۔

”جی بابا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں“ عالی نے سعادت مندی سے کہا۔ ”بہر حال عالی اس بار لیلیٰ کو بہت  
 طریقے سے سمجھانا۔ اس بار واقعی چوٹ بڑی شدید ہے“ بابا جان نے کہا تو عالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بلکہ ایسا کرو اسے کچھ دن میٹیں رہنے دوا کیلئے گھر میں وہ سوچے گی زیادہ اور خود کو پیار کرے گی، یہاں  
 بچوں کے ساتھ لگ کر جلدی اس phase سے نکل آئے گی“ بی بی جان نے بابا جان کی بات کے جواب میں کہا۔  
 ”ابھی تو اسے آرام کرنے دیں، اٹھے گی تو معلوم کر لوں گی جیسا وہ کہے“ عالی نے کہا اور ان دونوں نے سر ہلایا۔  
 صالحہ اور ایٹل کچن میں کھانا بنا رہی تھیں ان لوگوں کا ارادہ تو آج عالی وغیرہ کو نہیں روکنے کا تھا۔



اور اگلا دن طلوع ہوا تھا تو عالی اور سکندر تو گھر چلے گئے مگر بی بی جان نے لیلیٰ کو دو دن کے لیے روک لیا اور  
 ان دونوں میں ایٹل، ہانی اور سونی ہر وقت ہی لیلیٰ کا سایہ بنی رہی تھیں۔ اور صبح بھی جب ایٹل نے ہانی اور  
 سونی کو بلایا اور وہ ماں کو بتا کر ان کی طرف آئے لگیں تو آمنہ نے بڑے کڑوے لہجے میں کہا تھا ”ارے وہ بڑی  
 بڑی نخوس ہے اس کے سائے سے بھی تم دونوں خود کو بچاؤ آتے ہی ماں باپ کا رشتہ کھا گئی اب خدا خدا کر کے  
 رشتہ جڑا تو سنگیتر کو کھا گئی“ مگر وہ دونوں سر جھٹک کر چل دیں۔ ”تمہیں ڈرنہیں لگتا آمنہ!“ ان کے لہجے میں آج  
 غصہ نہیں تھا صرف اور صرف غم، تکلیف اور دکھ ہی دکھ تھا۔

”تو کوئی غلط کہہ رہی ہوں“ آمنہ نے غصے سے پہلو بدلا وہ پہلے ہی سونی اور ہانی کے نہ ماننے پر جلی ہوئی تھیں۔  
 ”اللہ سے توبہ کرنی رہا کرو آمنہ! کہ کہیں تم اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ کی پکڑ میں نہ آ جاؤ“ انہوں نے  
 اذیت سے کہا تھا وہ حقیقتاً لیلیٰ اور عالی کے دکھ پر بہت دھی تھے ان کے بس میں ہوتا تو وہ لیلیٰ کی تکلیف اپنے سر  
 لے لیتے۔

انہوں نے بار بار سوچا کہ وہ لیلیٰ کو فرہاد کے لیے لے کیا ہوا اگر لیلیٰ فرہاد سے دو یا تین سال بڑی بھی ہے مگر  
 ایک دو چیزوں کی وجہ سے وہ رک جاتے تھے ایک تو قریب رہنے کی وجہ سے اور رشتوں کے احترام کی وجہ سے



بھی ہمیشہ انہوں نے اپنے بچوں خصوصاً فرہاد کے ہر انداز میں لیلیٰ کے لیے احترام ہی دیکھا جیسا کہ ہر ایک چھوٹا بڑے کا کرتا ہے۔ گوکہ تینوں ہی اس کا نام لیتے تھے مگر ایک بڑوں والا احترام ضرور دیتے تھے۔ اور دوسری بڑی وجہ آمنہ ہی تھیں جو اتنی دور دور رہنے کے باوجود ان کی بہن اور بھانجی کو چھوڑنے بلکہ بخشے کو تیار نہیں تھیں جبکہ وہ دونوں نہ ان لینے میں تھیں نہ دینے میں تو اگر وہ لیلیٰ کے لیے اٹھ بھی کھڑے ہوتے تب بھی آمنہ نے لیلیٰ کو اس گھر میں بسے نہیں دینا تھا سو وہ ہر بار ہی دل سوس کر رہ جاتے تھے اور ان اوقات میں انہیں بی بی جان پر بہت غصہ آتا تھا جنہوں نے ان کے بجائے ایک غیر لڑکی پر اعتبار کر کے ان کی زندگی تباہ کر دی تھی۔

.....☆.....

لیلیٰ بہت خاموش ہو گئی تھی یہ بات گزرتے لمحوں نے ان تینوں کو بخوبی محسوس کرائی تھی اور لیلیٰ نارمل ایک انسان ہی تو تھی کتنا اور کب تک برداشت کرتی وہ اکثر ان لوگوں کے درمیان ہو کر بھی ان لوگوں کے درمیان موجود نہیں ہوتی تھی وہ نہ جانے خلاؤں میں کہا تلاش کرتی رہتی تھی اس کی اسامہ سے کوئی آج کی دوستی نہیں تھی یہ سو سال پر محیط تھی ان تینوں کا گروپ تھا وہ تینوں ہر جگہ ساتھ ہوتے تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی اکثر اسے ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے اوٹ پٹائیاں حرکتیں کیا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایسے ایسے چٹکلے چھوڑتے کہ وہ بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جاتی تھی وہ دونوں ہی اسے خوش دیکھنا چاہتے تھے وہ دونوں ہی اسے ماضی کی تکلیف وہ یادوں سے نجات دلانا چاہتے تھے اسامہ سے اس کی سال بھر سے بات طے تھی مگر اس کے کسی انداز میں عامیانہ پن نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اکیلے میں یا بہن کے سامنے نہ اس نے کبھی اس رشتے کو ڈسکس کیا نہ ہی اس نے اس حوالے سے کبھی لیلیٰ کو چھیڑا تھا وہ کبھی لیلیٰ کے ماضی پر بھی اس سے بات نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ اسے ان باتوں سے کسی تکلیف میں مبتلا نہ کر دے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے جاتے جاتے تکلیف نہیں اذیتوں میں مبتلا کر جائے گا اس کے ماضی میں ایک تکلیف وہ یا ایک اذیت ناک یاد بن کر رہ جائے گا جسے بھلانا اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔

.....☆.....

دودن سے نوفل ایما کو یونیورسٹی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہلے دن تو اس نے توجہ نہیں دی مگر دوسرے دن اس نے اسے کال کی۔ فون بجا رہا مگر کسی نے ریسپونڈ نہیں کیا۔ وہ فوراً ہی گھبرا کر اس کی طرف چلی آئی اور اس دن وہ بہت خاموش تھا۔ ایما اسے کریدنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ بھی منہ سے کچھ پھوٹ کر نہ دیا۔

”یار کیا بوریت پھیلا رہی ہے اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ غم کہہ دینے سے ہلکے ہو جاتے ہیں“ ایما نے چڑ کر کہا

”کچھ غم اے ہوتے ہیں جو ہمارے نصیبوں پر ہمارے ماتھوں پر چسپاں کر دیے جاتے ہیں وہ کہہ دیا رگڑ رگڑ کر ماتھے دھولو کہیں نہیں جاتے وہیں جھے کھڑے رہتے ہیں“ نوفل نے غمی سے کہا۔

’ایشل ٹھیک ہے ناں! ایما نے عجیب خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

’ہاں شکر الحمد للہ وہ خیریت سے ہے لیلیٰ کے متغیر کی اپنے دوست کو ڈوبنے سے بچاتے ہوئے خود بھی ڈوبنے پر خود بھی ڈبھ ہو گئی ہے‘ نوفل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔



’اوہ نو! سو سیڈ! آئی ایم سوری نوفل! مجھے پتہ نہ تھا‘ وہ شدید دکھ سے بولی۔

’پتہ نہیں میری بہن کا نصیب کیسا ہے اس میں کیا لکھا ہے؟ کہ اس کے نصیب ہی نہیں کھلتے، ہر تھوڑے دن بعد ایک نیا دکھ ایک نئی تکلیف ایک نئی اذیت، تمہیں نہیں پتہ ایسی وہ کتنی پیاری نیچر کی ہیں وہ کسی کو دکھا اور تکلیف میں نہیں دیکھ سکتیں وہ فوراً مدد کرتی ہیں لیکن پتہ نہیں ان کا نصیب کیوں اتنا سیاہ ہے۔ وہ کیوں ان تکلیفوں اور اذیتوں میں گھری ہوئی ہیں۔ وہ رو نہیں رہا تھا مگر اس کی آنکھیں نم تھیں۔

’اللہ اپنے محبوب بندوں کی ہی آزمائش کرتا ہے نوفل!‘ وہ خود بہت دکھی ہو رہی تھی۔

’تمہیں پتہ ہے سلی اتنی پیار ہیں کہ جو انہیں ایک بار دیکھ لے وہ رک کر انہیں دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو ان سے بات کر لے وہ ان کا گردیدہ ہو جاتا ہے اور جو ان کی جملہ صفات جان لے وہ ان کو اپنے گھر کی رونق بنانا چاہتا ہے مگر کچھ لوگوں کی مہربانیوں کے باعث ان کا رشتہ ہی طے نہیں ہوتا تھا اور اب اللہ اللہ کر کے طے ہوا تھا تو یہ ہو گیا‘ نوفل کو اس وقت بہترین سامع کی ضرورت تھی اور وہ ایما کی صورت میں اسے میسر آ چکا تھا ’بس یہ سب قسمت کے چکر ہیں اپنے اللہ پر بھروسہ رکھو ایما نے اس کا کا ندھا تھپتہ پایا۔

’اور ہاں تقدیر پر ایمان ہمارے ایمان کا جزو لا ینفک ہے چاہے وہ ہمیں کہیں بھی لا پھینکے‘ وہ تلخ ہوا۔

’بری بات ہے اللہ کے بارے میں برا گمان بھی بری بات ہے‘ وہ ایک نان مسلم اسے سمجھا رہی تھی اور اسے جھٹکا لگاؤ اتنی اس وقت وہ مشرکنا اور شیطانی خیالات کا مرکب ہوا تھا۔

وہ ہمارا رب ہے ہمیں نہیں پتہ کہ کیا ہمارے لیے برا ہے اور کیا بہتر ہے میں اس بیج پر سوچ رہا ہوں کہ سلی کے منگیتر کا انتقال ہو گیا۔ وہ اس بیج پر کیوں نہیں سوچتا کہ یہ سب شادی کے بعد بھی تو ہو سکتا تھا پھر تو زیادہ برا ہوتا اور اس نے توبہ کی اور دھوکہ کر کے نقل ادا کیے اور اللہ سے معافی مانگی وہ دیر تک وہاں روتا اور گر گڑا تا رہا تھا۔



فواد نے دورانِ حراست خود کشی کر لی تھی یا اسے کسی نے مار دیا تھا بہر حال میڈیا پر یہ خبر خوب اچھل رہی تھی اور سونی نے غصے سے LCD بند کر دیا۔

’کیا ہوا دیکھنے دو نا!..... ہانی نے کہا۔

’جو خبر دینے کی تھی وہ تو بادی اب ہماری پولیس کو بدنام کرنے کے لیے یہ خبر خوب اچھالی جا رہی ہے‘ وہ چڑ کر بولی۔

’تو یہ تو ہونا ہی ہے ہمارا میڈیا اور انکرزی آئی اے کے ہاتھوں کبے ہوئے جو ہیں ہانی نے پیلاگ تبصرہ کیا۔

’مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے سونی نے ہانی کو دیکھا۔

’اس کیس کو کمزور کرنے کے لیے کیونکہ اس کیس کا سب سے مضبوط ممبر فواد ہی تھا‘ ہانی نے سوچتے ہوئے کہا۔

’پھر تو یہ لوگ جھوٹ جائیں گے اور معاشرے کا نا سو رہن جائیں گے‘ سونی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

’یہ تو یہ کیونکہ ایسے لوگوں کے پیچھے بڑے بڑے مگر بچھ ہوتے ہیں ہانی نے اس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھا مگر

تم ڈرو نہیں انشا اللہ اب وہ تمہارا کچھ بھی لگا نہیں سکیں گے‘ اس نے بہن کو ساتھ لگایا تو اس کی ڈھارس بندھی۔

اور ہانی نے فون کر کے یہ خبر شان اور فرہاد کو بھی دی مگر ان تک یہ اطلاع پہلے ہی عدیل کے ذریعے پہنچ چکی تھی۔



اسامہ کی موت کو تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس دن سبرینہ انوار بھائی اور مونا کے ہمراہ چلی آئیں۔ عالی اور سکندر خوش ہوئے تھے البتہ لیلیٰ اب خاموش رہنے لگی تھی اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا وہ بھی ایک جگہ بیٹھ کر گفتگوں پہ نہیں کیا سوچے جاتی تھی۔ اس نے ان سے بھی شکر کرنا چھوڑ دیا تھا خود ہی کھلتی چلی جا رہی تھی سبرینہ نے اسے گلے لگایا اور انوار بھائی نے سر پر ہاتھ رکھا مگر وہ شمس بیٹی ہی رہی اور مونا نے ناگواری سے اسے دیکھا مگر یہ ناگواری فوراً ہی ہمدردی میں بدل گئی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو رہی تھی۔ چہرہ اور بال بے رونق تھے اور لباس میلا اور گھٹا ہوا تھا اسے دکھ نے آگیرا کتنی ویل ڈریسڈ اور حسین ہوتی تھی لڑکی اور اب.....

سبرینہ اور انوار بھائی بیٹھ چکے تھے عالی نے ان لوگوں کو پانی پلایا اور اب وہ ان سے کہہ رہی تھیں کہ وہ لوگ کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔

’ہم سب کھائیں گے مگر پہلے ہماری عرض پوری کر دو‘ سبرینہ نے کہا تو عالی اور سکندر نے انہیں الجھ کر دیکھا۔

’کون سی عرض؟‘ عالی نے پوچھا۔

’لیلیٰ کو میری بیٹی بنا دو انہوں نے فوراً کہا۔

’وہ تمہاری بیٹی ہی ہے‘ سبرینہ!‘ سکندر نے کہا۔

’یعنی آپ اسے میرے شان کی دہن بنانے کے لیے تیار ہیں‘ سبرینہ کھلی گئیں اور ان کی بات پر نہ صرف عالی اور سکندر چونکے بلکہ لیلیٰ نے بھی جھٹکے سے سر اٹھایا۔

’نہیں پھپھو! آپ کو چھوٹی مامی نے بتایا نہیں تھا کہ میں منحوس ہوں آپ کو پتہ ہے میں اتنی منحوس ہوں کہ آتے ہی اپنے ماں باپ کا رشتہ کھا گئی ایک بندے نے مجھے ڈھنگ سے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا اور میں اسے بھی کھا گئی وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بولی اور سبرینہ نے اسے دیکھا۔

’میری بچی! کوئی منحوس نہیں ہوتا یہ سب ہندوانہ ذہنیت ہے شگن لینا اور لوگوں اور چیزوں کو منحوس سمجھنا‘ سبرینہ نے پیار سے اسے پککارا۔

’لیکن میں ہوں پھپھو!‘ مجھے پتہ ہے اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔

’لیلیٰ میرے بیٹے پر رحم کر دو یہ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں‘ سبرینہ نے باقاعدہ لیلیٰ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

’پھپھو! آپ خود اپنے بیٹے پر رحم کھالیں کہیں میری منحوسیت کا سایہ بھی ان کی زندگی پر پڑ گیا تو وہ کہیں کے نہیں رہیں گے وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بولی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

’اور ماما! بابا آپ دونوں نے میری وجہ سے بہت سفر کر لیا ہے اب اور نہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اب اور یہاں نہیں رہوں گی۔ میں نے پاپا سے بات کر لی ہے وہ جلد ہی آ کر مجھے لے جائیں گے وہ بالکل ایسے بات کہہ رہی تھی جیسے اپنے اور ان دونوں کے متعلق بات نہ کر رہی ہو کسی غیر کی تیسرے فرد کے متعلق بات کر رہی ہو۔

’دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمہارا تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ سب کرنے کی اگر اس شخص کو تمہارا ایسا ہی درد



ہوتا تو یہ آفراس کی طرف سے آتی "حسب معمول عالی بھڑک انھیں مگر سکندر نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں روکا۔

'بیٹا تمہیں کس نے کہا کہ ہم نے تمہارے لیے سفر کیا ہے' سکندر نے محبت سے کہا۔

'مجھے پتہ ہے بابا! آپ کبھی نہیں کہیں گے مگر میں اب مزید آپ دونوں کو سفر کرنے نہیں دوں گی جو شخص میری ایسی زندگی کا مددگار ہے اسے بھی تو سفر کرنے دیں وہ پہلی بار سسکی تھی سکندر کی اتنی بے پناہ محبت توجہ پر اور پھر بھاگتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

'سکندر! تم لوگ اس کی فزوقہرانی کیوں نہیں کرتے مجھے بچی کی مینٹل کنڈیشن بالکل بھی اسٹبل نہیں لگ رہی ہے' انوار بھائی نے کہا۔

'انوار بھائی! اسامہ کی ذہنیت کے بعد سے اس نے بالکل یوں لپکا چھوڑا ہوا تھا خاموش رہنے لگی تھی آج ہی اس نے اس طرح سے بات کی ہے اور مجھے بھی لگا ہے کہ اسے ضرورت ہے سائیکو تھراپی کی' سکندر سوچ سوچ کر بول رہے تھے اور عالی رونے لگی تھیں اور سیرینہ نے انہیں گلے لگالیا۔

موت روئیں بھابھی انشا اللہ وہ علاج سے بالکل ٹھیک ہو جائے گی ویسے بھی انسان ہی ہے ناں کتنا برداشت کرے اور ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے جوان معاملات پر صبر کر سکے' سیرینہ عالی کو تسلی دینے لگی۔

'لیکن میں پھر کہوں گا سکندر اور عالی کہ تم دونوں نے بچی کی طرف سے بھرپور غفلت برتی ہے کیونکہ کوئی رو دھو کر چیخ چلا کر اگر اپنی بھڑاس نکال لے تو وہ بہتر ہوتا ہے مگر اگر کوئی اچانک بالکل خاموش ہو جائے تو وہ نظر اناز کرنے کے لیے نہیں ہوتا' انوار بھائی نے کہا تو ان دونوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا کیونکہ اس کی خاموشی سے ان دونوں کو ابھنن پریشانی تو ہوتی تھی مگر اس سلسلے میں انہوں نے کوئی اقدامات نہیں کیے تھے۔

'جی انوار بھائی ہم سے غفلت تو ہوئی ہے عالی نے اعتراف کیا۔



اور جب انہوں نے لٹل سے ڈاکٹر کو دکھانے کی بات کی تو اس نے انہیں دیکھا کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے ناقدانہ نظروں سے خود کو دیکھا۔

'اپنی حالت دیکھ رہی ہو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جا رہی ہو چلو چل کر کوئی ٹائم لکھوا کر لاتے ہیں' عالی نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'بچ کیوں نہیں کہتی ماما کہ میں آپ لوگوں کو پاگل لگنے لگی ہوں اور آپ مجھے نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانا چاہتی ہیں مگر میں پاگل نہیں ہوں ماما میں بچ بننے لگی ہوں میں نے Realize کر لیا ہے کہ میرا وجود آپ لوگوں کے لیے باعث آزار ہے اس لیے میں آپ لوگوں کی زندگیوں سے نکل جانا چاہتی ہوں وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

'اولاد کبھی ماں باپ کے لیے باعث آزار نہیں ہوتی ہے جب خود ماں ہوگی ناں تو پتہ چلے گا ماں باپ کو تو وہ اولاد بھی نہیں مہلتی جو کہ Mentally Retarded ہوتی ہے وہ اسے بھی بغیر دشمن مانتے پرلائے پالتے ہیں کبھی آزار نہیں سمجھتے' عالی نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

'چلیں کہاں چلتا ہے اس نے کہا۔



تھوڑے ہی دن میں دو چار سیشن میں وہ نارمل ہو گئی تھی مگر اس کی یہ رٹ نہیں جاتی تھی کہ اب اسے یہاں نہیں رہنا ہے۔ اب وہ مہران کے گھر جانے لگی اور دوسری طرف بریہ مستقل جواب مانگ رہی تھیں مگر سکندر نے ان سے ابھی انتظار کرنے کو کہہ دیا تھا۔

اور ایسے میں ہی ایک دن مہران کا فون آ گیا کہ وہ لیلیٰ کو لینے آرہے ہیں۔ عالی تو پھٹ ہی پڑیں۔  
 ’مسٹر مہران! بڑی جلدی خیال آ گیا آپ کو بیٹی کا۔ وہ ہاں یقیناً آپ کی بیوی کو ملازمہ کی ضرورت ہوگی کیونکہ جو عورت اپنی ساس اور منندوں کو برداشت نہ کر سکی وہ سوتیلی بیٹی کو کیسے برداشت کرے گی اور کیا سلوک کرے گی اس کے ساتھ وہ غصے میں بولتی چلی گئیں اور یہی تحفظات مہران کو بھی تھی مگر وہ بیٹی کی بات کو رد نہیں کر سکتے تھے۔

’عالی میری بیٹی نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کسی خواہش کا اظہار کیا ہے اور میں انکار نہ کر سکا مجھے پتہ ہے علیہ کی فطرت وہ اس کو نکلنے نہیں دے گی مگر لیلیٰ کی خواہش ہے تو کچھ دن کے لیے اسے بھیج دو مہران نے کہا  
 ’عالی نہیں عالیہ سکندر مسٹر مہران عالی نے چاہا کیا کر کہا۔

’اور مسٹر عالی اگر آپ کے گھر میری بیٹی کے ساتھ کچھ برا ہوا تو اچھا نہیں ہوگا‘ عالی نے کہہ کر کھٹ سے ریسیور کریدل پر دے مارا اور لیلیٰ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

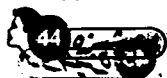
’تمہارے پاپا تمہیں لینے آرہے ہیں دو دن بعد جو سامان باندھنا ہے باندھ لو عالی ساٹ انداز میں کہہ کر باہر کی جانب بڑھیں اور یہ مشورہ لی بی جان کا ہی تھا کہ اسے یہ تجربہ بھی کرنے دو حالانکہ سکندر راضی نہیں تھے اور سونی، ہانی، ایشل اور فرہاد سب اپنے اپنے انداز میں اسے سمجھا چکے تھے جذباتی طور پر بلیک میل کر چکے تھے مگر وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھی اور اتنی ضدی وہ کبھی نہیں رہی تھی۔  
 ’ماما کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں لیلیٰ نے پوچھا تھا۔

جب اولاد محبت کرنے والے ماں باپ سے یہ سلوک کرتی ہے ناں! لیلیٰ تو ناراضگی نہیں ہوتی دل پر ہاتھ پڑتا ہے۔ جب خود ماں بنو گی تو یہ چیلے گا‘ عالی نے کہا اور لیلیٰ نے آنکھ کی نمی پونچھی تھی اور سوچا ماما آپ کو کیا پتہ میں آپ سے اور بابا سے کتنی محبت کرتی ہوں اور آپ دونوں میرے لیے بہت تکلیف جھیل چکے ہیں لیکن بس اب اور نہیں..... اب بابا کو جھیلے دیں جو کہ ان تکلیفات سے ہمیں گزارنے کی اصل وجہ ہیں۔

☆.....

اور جب مانی، لیلیٰ کو لینے آئے تو عالی ان کے سامنے نہیں آئیں حالانکہ جاتے جاتے تک بھی وہ مڑ مڑ کر دیکھتے رہے تھے اور یہ ان کی زندگی کا ایسا ہی تو تھا کہ انہیں عالی سے محبت ان کے اپنی زندگی سے چلے جانے کے بعد ہوئی تھی اور جب وہ ان کی زندگی میں تھیں تو انہوں نے ان کی جنم بنا کر بھی یہاں تک کہ اس بجد پیاری اور گڑیا کی مانند دکھائی دیتی لڑکی کی پیدائش پر انہوں نے اسے تحفے میں طلاق دی تھی مہران نے ان کو گھر سے برسوں میں ہر ہر منٹ، ہر ہر سیکنڈ، ہر ہر گھڑی عالی کو یاد کیا تھا جنہوں نے گھر بنا کر رکھنے کے لیے ان کا ہر ظلم ہر زیادتی برداشت کی تھی ورنہ ان کے گھر میں تو ہنسنا تو دور کی بات وہ مسکراتا تک بھول گئی تھیں۔

☆.....



اور آج کا دن عالی پر بہت کھٹن تھا مہراں کے گھر سے ان کی بہت تلخ و بد صورت یادیں جڑی ہوئی تھیں گو کہ وہ ان سب کو معاف کر چکی تھی مگر ایک ہی خاندان ہونے کی وجہ سے ملنے ملانے والے صرف چٹاڑوں کے لیے انہیں اس گھر میں ہونے والی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات بتاتے تھے اور انہیں باتوں میں مہراں کی بیوی علیہ کی طبیعت اور مزاج کے متعلق وہ سب کچھ جانتی تھیں اور یہ تو آنکھوں دیکھا تھا کہ مہراں کی ماں بیٹے کی موجودگی میں دارالامان میں تھیں اور مہراں کی بہنوں کی زبانوں کی بھی زبان زد عام تھی اور انسان بہر حال جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔

مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ لیلیٰ کو عالی اور سکندر نے بہت ناز و نعم سے پالا تھا اور علیہ کا مزاج یہ تھا کہ وہ کسی کو بھی اپنے گھر میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ وہ ایک انتہائی شقی القلب عورت تھیں اور لیلیٰ پہلے ہی پے در پے ملنے والے صلہ مومن سے چور رہتی تھیں وہ اس عورت کو برداشت کرنے کی قائل نہیں ہو سکتی تھی انہوں نے لیلیٰ کو بہت سمجھایا تھا سکندر نے بابا جان و بی بی جان صالحہ اور زوار یہاں تک کہ شہر و ملک نے اسے سمجھا کر دیکھ لیا تھا مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ نو جوان پارنی نے تو خوب ڈرامے کر کے اور جذباتی بلیک میلنگ سے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں رکی تھی۔ اور اب بھی وہ کمرے میں اندھیرا کھے ہوئے رو رہی تھیں کہ سکندر اندر داخل ہوئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر روشنی کر دی کمرے میں عالی کو روٹا دیکھ کر وہ ٹپ کر ان کے قریب آئے۔

’عالی تمہیں پتہ ہے ناں تمہارے آسو مجھ کس قدر تکلیف دیتے ہیں وہ بڑی بے چینی سے بولے تھے اور عالی جانتی تھیں کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔

’سکندر! اس نے ہماری محبتوں اور خلوص کی قدر نہیں کی وہ سکتی تھیں۔

’عالی! اس کی منسل کنڈیشن کو سمجھنے کی کوشش کرو انسان ہی تو ہے نا‘ پے در پے صدمات سے گزری ہے، ہو جاتا ہے ایسا اور پھر وہ کون سا ہمیشہ کے لیے گئی ہے آجائے گی انہوں نے عالی کے قریب بیٹھ کر انہیں خود سے قریب کر لیا۔

’یہ تو آپ کہہ رہے ہیں اس نے تو ایک بار بھی واپس آنے کی بات نہیں کی وہ لیلیٰ سے بہت شاک تھیں۔

’یہ ہم کہہ ہی نہیں رہے ہم کس کے بھی خود جا کر اپنی بیٹی کو لے کر آئیں گے سکندر نے یقین سے کہا۔

’وہ نہیں آئے گی وہ اپنی خدی بھی نہیں رہی ہے خشتی آج کل ہو گئی ہے عالی نے خفگی سے کہا۔

’آجائے گی تو ذرا سا وقت گزرے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ذہنی طور پر اس شاکنگ فیز سے باہر نکل آجائے پھر آجائے گی اور یوں بھی تم مہراں کی بیوی کے مزاج سے تو واقف ہی ہو وہ نہیں رہ پائے گی اس گھر میں سکندر کو بہت زیادہ یقین تھا۔

’اللہ کرے ایسا ہی ہوا اور مجھے سب سے زیادہ ڈر مہراں کی بیوی کا ہی ہے جو اس اور نندوں کو برداشت نہ کرے وہ سوتیلی بیٹی کا کیا حال کرے گی“ عالی کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔

’انشاء اللہ جلد ایسا ہی ہوگا اور اللہ سے اچھی امید رکھو وہ بہتر کرے گا“ سکندر نے انہیں تسلی دی۔

☆.....

اور اس دن بالکل غیر متوقع طور پر نوفل کا فون آگیا کیونکہ وہ عمو نارات میں فون نہیں کرتا تھا عمو ناوہ علی الصبح



ہی فون کرتا تھا اور دوسرا وہ ورکنگ ڈیز میں تو قطعی فون نہیں کرتا تھا۔

”ماما! آپ پریشان ہیں کیا؟“ اس نے سلام کرتے ہی پہلا سوال یہی کیا۔

”کیوں کسی نے تم سے کچھ کہا ہے؟“ انہیں لگا کہ وہ ایٹل سے بات کر چکا ہے۔

”نہیں ماما! میں دو دن سے مسلسل آپ کو اپنے خوابوں میں پریشان دیکھ رہا ہوں اسی لیے اس نے بتایا اور

انہیں وہ محاورہ یاد آ گیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

”ہاں وہ..... لیلیٰ چلی گئی“ وہ پھر سے رو پڑیں۔

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”اپنے باپ کے پاس“ ان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

”اوہ! تو آپ دونوں اب اکیلے ہیں گھر میں“ اسے حقیقتاً لیلیٰ کی اس حرکت پر دکھ اور افسوس ہوا تھا۔

”ہاں“ وہ بے بسی سے بولیں۔

”ماما آپ فکر نہ کریں لیلیٰ جلد ہی واپس آ جائیں گی“ وہ بڑے یقین سے بولا۔

”کیوں تم باپ بیٹے کو اس بات پر اتنا یقین کیوں ہے؟“ ان کے لہجے میں بھی امید در آئی۔

”پتہ نہیں ماما مگر دل کو یقین سا ہے کہ ایسا ہی ہوگا“ وہ بولا اور انہوں نے دل ہی دل میں آمین ثمہ آمین کہا۔

”اللہ کرے تم باپ بیٹے کا یہ یقین سلامت رہے“ انہوں نے کہا اور نونفل نے فوراً آمین ثمہ آمین کہا۔

اور اس ہی رات بی بی جان نے ان دونوں کو اپنے گھر بلالیا۔

☆.....

لیلیٰ اپنے کپڑوں کے مختصر سے بیگ کے ہمراہ مہراں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو علیہ فوراً لپک کر اٹھ کر آئیں۔

”یہ کس کو منہ اٹھائے گھر میں لیے چلے آ رہے ہو؟“ انہوں نے غور سے اس غیر معمولی حسن رکھنے والی اس

لڑکی کو دیکھا۔

”یہ میری بیٹی ہے“ مہراں نے غصے سے انہیں دیکھ کر کہا۔

”اوہ! وہی بیٹی جس کی پیدائش پر تم نے اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی تو کیا اتنے عرصے بعد یقین آ ہی گیا

کہ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے؟“ علیہ نے بڑے استہزاء سے انداز میں تمہاری کو چپا چپا کر ادا کیا اور لیلیٰ کا دل چاہا کہ وہ

پتھر کی ہو جائے اور اس کی ساعیں سن ہو جائیں۔

اور سامنے ہی صوفے پر بیٹھے کوئی مووی دیکھتے سلمان نے بڑی معنی خیزی سے اپنے باپ اور اس کے

ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھا۔

”مجھے اس وقت بھی اپنی پاکباز بوی پر یقین تھا اور آج بھی ہے مگر اس وقت میری آنکھوں پر تمہاری جھوٹی

محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی“ مہراں نے بھی ادھار نہیں رکھا۔

”بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ لڑکی یہاں نہیں رہے گی“ علیہ نے دو ٹوک کہا۔

”میری بیٹی تو یہیں رہے گی ہاں اگر کسی کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو وہ جاسکتا ہے۔ مہراں نے

بھی دو ٹوک جواب دیا اور سلمان نے چونک کر باپ کو دیکھا۔



”یہ یہاں نہیں رہے یہ خود تم سے یہاں سے جانے کو کہے گی تم مجھے جانے نہیں ہومانی اعلیٰ نام ہے میرا“ وہ بل کھاتی ہوئی ناگن کی مانند پھنکاری تھیں۔

”اگر ایسا ہوتا اعلیٰ تو یہ کیلی نہیں جائے گی میں بھی اپنی بیٹی کے ساتھ ہی جاؤں گا پھر تم اکیلی سنبھالتی پھر نایہ گھر اور اپنے بچے مہران نے قطعیت سے کہا۔

”کیوں کیا اپنی سابقہ بیوی سے ڈیل کر آئے ہو کیا وہ طلاق لے رہی ہے اپنے موجودہ شوہر سے“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی تھیں۔

”بس! مہران دھاڑے تھے اور ان کا ہاتھ بھی اٹھا تھا جسے انہوں نے درمیان میں ہی روک لیا تھا اور سلمان نے اس منظر کو بڑی ناپسندیدگی سے دیکھا تھا جبکہ علیہ نے لیلیٰ کو بڑی نفرت سے۔ اور علیہ نے سوچا تھا کہ ”بی بی تم دو دن بھی اس گھر میں رک گئیں تو میں تمہیں سلام کروں گی۔“ اور لیلیٰ نے سوچا کہ یہ شخص مزید کیا بھٹکتے گا یہ تو حقوق العباد کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں پہلے ہی اپنے اعمال کے سلسلے میں نقدیر کی پلڑ میں ہے۔“

.....☆.....

اور یہ رات لیلیٰ پر بڑی بھاری تھی اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے محبت کرنے والے ماں باپ کے ساتھ کیا کر آئی ہے۔ اس وقت اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ان دونوں کا احساس کیے بغیر انہیں تنہا چھوڑ آئی ہے اور جس شخص کے سہارے وہ اس گھر میں داخل ہوئی وہ کس قدر کمزور اور یو دا تھا وہ دیکھ چکی تھی۔

.....☆.....

گھر میں روز روز ہونے والی کل کل اور مونا کے ہر رشتے میں فشق ڈالنے پر تنگ آ کر انوار بھائی شان اور مان نے ملا کر گھر کے اوپر کنسٹرکشن کروائی شروع کر دی نیچے والا گھر پرانے انداز کا بنا ہوا تھا اب جو اد پر نیا گھر بن رہا تھا اس میں جدید اسٹائل کو مد نظر رکھ کر بنوایا گیا تھا اور پھر نیا بنایا ہوتا ہے اور پر برینہ وغیرہ کو منتقل ہونا تھا مگر گھر دیکھ کر مان کی بیوی نالکہ چل گئی کہ اسے اوپر منتقل ہونا ہے اور مان خود بھی یہی چاہ رہے تھے سو وہ بیوی کو لے کر اس نئی فرمائش سمیت چلے آئے مگر انوار بھائی نے سختی سے ان کی بات رد کر دی۔

”آپ کو پتہ ہے یا اندازہ ہے کہ اوپر کی کنسٹرکشن پر کتنا پیسہ لگا ہے انوار بھائی نے کہا۔

”جی پتہ ہے مان نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”آپ نے جو ردھو کر ڈھائی لاکھ روپیہ دیا ہے وہ میں اور شان جلد ہی آپ کو واپس کر دیں گے جو لوگ آپ کی طرح کسی کے سمجھانے اور پڑھانے پر مکاریوں میں مصروف رہتے ہیں وہ ایسے ہی خالی ہاتھ رہتے ہیں اب ہم آپ کا جب ڈھائی لاکھ دیں گے تو آپ خود ہی نیچے کا حصہ رینووٹ کر لے لے لے گا“ انوار بھائی نے دو ٹوک کہا تو نالکہ پیر پختی چلی گئی اور مان نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

.....☆.....

فواد کی خود کشی کے بعد سے کیس میں کوئی جان ہی نہیں رہی تھی اور وہ تمام لوگ جلد ہی باہر آ گئے۔ اور اس دن فرہاد نے اسے کیئرفل رہنے کو کہا تھا اور اس دن رات میں اس نے فرہاد بھائی اور بابا کی بات



جیت بھی سکتی تھی۔

جس میں بھائی بابا سے سونی کی شادی جلد از جلد کر دینے کا کہہ رہے تھے۔

”لیکن ابھی اس کا گرجونیشن بھی مکمل نہیں ہوا“ شہروز نے کہا۔

”بابا شادی بھی اتنی جلد ہی نہیں ہوتی ابھی سے دیکھنا شروع کریں گے تو اس کی گرجونیشن تک ہی معاملات سیت ہوئیں گے“ فرہاد نے سنجیدگی سے کہا اور شہروز نے اس اپنے بچہ بچہ دار بیٹے کو دیکھا جس انداز میں انہیں سوچنا چاہیے تھا اس انداز میں وہ سوچتا تھا۔

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو مگر ایک بات بتاؤ فرہاد! تم میں اتنی بھرداری کہاں سے آئی؟“ انہوں نے اسے سناٹائی نظروں سے دیکھا۔

”بابا کچھ حالات کی دیں ہے اور کچھ تایا ابواور دادا جان کی محبت کا اثر ہے اس نے جواب دیا اور شہروز کو تھوڑی سی تکلیف ہوئی جہاں ان کا نام آنا چاہیے تھا وہاں ان کے بھائی اور باپ کا نام آیا تھا مگر درست بات یہی تھی۔

اور فرہاد بھی سوچ رہا تھا کہ ہمارے جیسے حالات میں رہنے والے بچے ایسے ہی یا سونی کی طرح غلط ٹریک پر چل نکلتے ہیں اور اگر کوئی سنبھالنے والا نہ ملے تو بگڑ جاتے ہیں یا پھر بہت سمجھدار ہو جاتے ہیں ہانی اور میری طرح۔  
”ہنہ..... شہروز نے ہنکارا بھرا“ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم سونی کے سلسلے میں کچھ تحفظات کا شکار ہو“ شہروز نے اپنا اندازہ بتایا۔

”جی بابا آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں جیسا کہ آپ کو پتہ ہے فواد کے خود کشی کرنے کے بعد جس طرح سے اپنا وغیرہ آزاد ہو گئے ہیں اس وقت سے سونی کے سلسلے میں تحفظات کا شکار ہوں یہ لوگ اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں خصوصاً انہیں جن پر انہوں نے ورک کیا ہو“ فرہاد نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

”ہنہ تو کیا ایسا نہ کریں کہ سونی کا کالج جانا ہی بند کرادیں انگریز ام دے دے گی“ شہروز نے کہا۔  
”نہیں بابا کالج جانے دیں اس کا میں نے انتظام کر دیا ہے وہ لوگ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے“ فرہاد نے کہا اور باہر کھڑی تمام باتیں سنی سنی کو بے اختیار اپنے ذمے دار اور خیال رکھنے والے بھائی پر بھید پیا رہا۔

”ٹھیک ہے میں بابا جان اور بی بی جان سے بات کرتا ہوں“ شہروز نے کہا اور فرہاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

.....☆.....

اور اگلے ہی دن سے علیہ نے لیلیٰ کے خلاف محاذ بنالیا وہ رات میں ہی لیلیٰ سے کہہ چکی تھیں کہ صبح اٹھ کر ناشتا سے بنانا ہے اور یہ تو شروعات تھی۔ علیہ نے آگے گھر کا ہر کام ہی لیلیٰ کے ذمے لگانے کا پلان بنایا ہوا تھا اور لیلیٰ گھر کے کاموں سے نہیں بچ سکتی تھی مگر علیہ کی زبان..... بہر حال پہلے ہی دن ناشتے پر اس کی ملاقات نعمان سے ہوئی سلمان سے تو وہ رات میں مل چکی تھی لیکن لیلیٰ کو اس کی ذہنیت کا اندازہ فوراً ہی ہو گیا تھا۔ وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آیا جب لیلیٰ گرم گرم پرانے اور آلیٹ لے کر آئی۔

(اس ناول کا اگلا حصہ آئندہ ماہ کے دوشیزہ میں ملاحظہ فرمائیے)

## سفر تمام ہوا

مٹی کے برتن میں پانی ڈال کر وہ نیم کی چھواؤں میں رکھ دیتی  
اور پھر چڑیوں کی اچھل کود کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہتی۔

وہ سامنے منڈیر پر بیٹھے کوئے کو غور سے دیکھتی رہی۔ گرمی اور پیاس کی شدت سے وہ کھلی چوچ کے ساتھ ادھر ادھر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس لودہتی گرمی میں دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے پچھلے کمرے کے ساتھ بنی چھوٹی سی گیلری میں اماں کے پرانے دو پنوں کو دیواروں سے نکال کر چھوٹی چھوٹی کیلوں میں اٹکا کر سایہ سایا لیا تھا۔ چچا دینو کے گھر کا بڑا سائیم کا درخت اس کے بالکل پیچھے تھا اس کا سایہ تو گھر میں نہیں آتا تھا لیکن اس سے چھن چھن کر آنے والی ٹھنڈی ہوائ کے لیے وہ روز دوپہر میں یہاں آ کر لیٹ جاتی تھی حالانکہ رات کے وقت یہی تناور درخت اور اندھیرے اور سنائے کے سبب اس کی جان نکالے رہتا تھا اور اماں کے لاکھ کہنے کے باوجود وہ گھڑوچی پر پانی نکالنے نہیں آتی تھی مگر اندھیرے کے ساتھ دن میں

وہ رات کا خوف بھی ہوا ہو جاتا تھا اسے رات کی باتیں یاد بھی نہیں دیتی تھیں۔ وہ اٹھی مٹی کے پیالے میں پانی بھرا اور اپنے سامنے سے ذرا ہٹ کر سائے میں ہی وہ پیالہ رکھ دیا۔ آن کی آن میں کوئے اور چڑیاں آنا شروع ہو گئے اسے لگا جیسے اس کا حلق تر ہونا جا رہا ہے۔ وہ مسکراتی نظروں سے دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھنے میں لگ گئی۔

زیرینہ تو یہاں لیٹی ہے۔ اتنی گرمی میں چل اندر کمرے میں..... پھڑ پھڑ پھڑ ساری چڑیاں اماں کی آمد کے ساتھ اس کے چہرے پر آئی مسکراہٹ کی طرح غائب ہو گئیں اور اس کا منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اماں کیا ہے..... اس نے دھیمی آواز میں احتجاج کیا۔ کتنے پیاسے تھے بچارے اتنے مزے



سے پانی میں نہا رہے تھے اور پی بھی رہے تھے۔  
 اس کے تصور میں پانی میں پھڑپھڑاتے پانی  
 اچھالتے چڑیا چڑے آگئے۔  
 اچھا چل اندر آ ابھی پھر آ جائیں گے۔ اماں  
 نے اس کی ناراضگی نظر انداز کر کے اپنی بات جاری  
 رکھی اور بازو سے پکڑ کر سامنے کمرے میں لے گئی۔  
 لو لگ جائے گی تجھے میرے بچے..... اماں  
 نے پلنگ پر اپنے ساتھ لٹاتے ہوئے پیار سے کہا۔  
 اب تیرا ویسے ہی کام کے لیے شہر گیا ہوا ہے۔ تجھے  
 کچھ ہو گیا تو اسے کیا جواب دوں گی۔ چاہے نا ابا  
 تجھ سے کتنا پیار کرتا ہے..... اور وہ جو روکھی سی  
 روشندان سے نیم کی شاخ کو دائیں بائیں جھولا  
 جھولتی دیکھ رہی تھی اماں کے سینے میں منہ چھپا کر  
 پیار سے لپٹ گئی۔ جانتی تھی کہ اماں بھی ابا سے کم  
 پیار نہیں کرتی تھی۔ اماں ہے بھی تو بہت پیاری اس

نے اماں کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے سوچا.....  
 گوری رنگت بڑی بڑی کا جل گئی آنکھیں کالے  
 سیاہ لہجے بال اور اس کے کردار کی شرافت جو اس  
 کے چہرے کا احاطہ کیے رہتی تھی۔ اس کو تکتے دیکھ کر  
 اماں نے اس کے ماتھے کو چوم کر پوچھا۔ کیا دیکھ رہی  
 ہے ماری کڑی؟ اس کے اندر ڈھیر ساری ٹھنڈک  
 اتر گئی۔  
 کچھ نہیں اماں..... اور جواب دے کر پھر  
 آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔  
 اماں واقعی بہت خوبصورت تھی۔ کم از کم ابا کو  
 دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی قسمت میں اتنی  
 حسین بیوی ہو سکتی ہے۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ اماں کو  
 ابا آخر پسند کیسے آ گیا؟ اماں کے مقابلے میں تو وہ  
 کچھ بھی نہ تھا نہ شکل میں نہ عمر میں..... بیس سال تو  
 بڑا ہو گا ہی۔ وہ خود اندازے لگاتی رہتی تھی۔ خود اس



کی میں نے پرچی نہ سکا۔ ہاں جاتے جاتے تیری  
ماں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پکڑا گیا۔ کیوں زرینہ کی  
ماں یاد ہے وہ رات کیسے آٹا قانا اس نے مسجد کے  
مولوی صاحب کو بلوایا تھا اور وہیں ڈپنٹری میں  
ہمارے بول بڑھوا دیے تھے۔

اماں کی آنکھوں میں دکھ اور خوشی کے ملے جلے  
تاثر ابھرتے اور پھر وہ جھنجھلا کر کہتی رہنے بھی دے دبو  
کیوں گندری باتیں لے بیٹھتا ہے وہ بھی اپنی ٹھنی  
دھی رانی کے آگے۔

نے مجھے تو بہت اچھا لگے ہے وہ..... اماں کی  
جھنجھلاہٹ سے محفوظ ہوتا اور بولے جاتا.....  
بولے جاتا۔ سن زرینہ میری زندگی تو شروع ہی اسی  
دن ہوئی تھی۔ سب کہتے تھے عبدو تجھے کون اپنی بیٹی  
دے گا اور دیکھ میرے سوئے مولانے نہ صرف  
میرے نصیب میں اتنی سوتی وہی لکھی بلکہ تجھ جیسی  
حسین دھی رانی بھی دے دی۔ اب تو ہی بتا میں  
اتراؤں بھی نہ۔ وہ خوشی سے اسے سینے سے لگا کر  
کہتا۔

اماں بھڑک جاتی تھی اور کہتی..... دھی رانیوں  
سے کوئی ایسی باتیں کرے جیسی تو کرے اور ابا اسی  
طرح مسکرا کر کہتا اب تم ہی لوگ تو ہو میرے اور کس  
سے یہ باتیں کروں؟ کیوں بیٹا رانی؟ وہ اس کی  
طرف تائیدی نظروں سے دیکھتا اور وہ سر ہلاتی۔  
میرا ابا اکتھا اچھا ہے خوبصورت نہیں تو کیا ہم  
سے اتنا پیار تو کرتا ہے تا وہ دل ہی دل میں ابا پر  
واری صدے ہو جاتی۔

یہ سب سوچے سوچے پتا نہیں کب وہ گہری  
نیند سو گئی۔ اماں بھی سو گئی تھی۔ اچانک کچھ گرنے کی  
آواز سے دونوں کی آنکھ کھلی۔

ہٹ زرینہ دیکھو بولی تو بارہی خانے میں نہیں

کی عمر اتنی تو ہو گئی تھی کہ اب وہ ان باتوں کا موازنہ  
کرنے لگی تھی وہ بھی خاص طور پر جب وہ ملک  
صاحب کے گھر جاتی تو انہیں دیکھ کر اسے ضرور  
خیال آتا کہ اماں کے لیے تو کوئی ایسا حسین گہرو ہونا  
چاہیے تھا۔

مگر اماں کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ جھکی نظروں  
سے سلام کر کے چھپا کہ ملک صاحب کی بیوی کے  
کمرے میں گھس جاتی تھی۔ وہ ساتھ ہی ہوتی تھی  
ملک صاحب کی بیوی بیچاری بیمار رہتی تھی۔ اماں  
اس کی مالش کر دیتی تھی دوسرے بچے کی پیدائش  
کے دوران چھپیدگی کے سبب اس سے زیادہ پیٹھا  
نہیں جاتا تھا۔ اماں اس کے کپڑے بھی سی دیتی تھی  
تا کہ کچھ پیسوں کا آسرا بھی رہے۔

ملک صاحب نے یوں تو گاؤں میں ڈپنٹری  
کھولی تھی لیکن یہاں لوگ صرف سیلاب کے دنوں  
میں پناہ لینے یا بھی چھوٹی موٹی دوا دارو کے سلسلے  
میں آ جاتے تھے۔ اماں بتاتی ہے کہ ابا کو وہاں  
کپاؤنڈر کے طور پر ملک صاحب نے رکھا تھا لیکن  
اسے ڈپنٹری اور ابا کو پیسے دینے کی یا سیلاب آنے  
کی صورت میں ہی آتی تھی وہ بھی جب حکومت  
اعداد بھیجتی تب..... اس کا گاؤں اندر ہونے کے  
سبب سیلاب کی تباہ کاریوں سے تو بچا رہتا لیکن  
آفت زدگان کے لیے پناہ گاہ تھا۔

ابا بڑی محبت سے بتاتا تھا کہ تیری اماں بھی  
ایک سیلاب کا ہی تختہ ہے۔ لوگوں کے سیلاب میں  
گھر اجڑتے ہیں پر میرا تو گھر آباد ہوا تھا بڑی  
خوبصورت مسکراہٹ سے وہ اماں کو دیکھتا جاتا اور  
اماں بھی نظریں جھکائے مسکرا مسکرا کر نہ نظر آنے  
والا کام کرتی جاتی تھی۔

تیرا نانا بہت بیمار اور پریشان تھا۔ بڑی خدمت

اماں سر پکڑے پریشان بٹھی تھی۔ لوگوں نے مل جل کر درخت کی ٹہنیاں کاٹ کر اس قابل کیا کہ نقصان کا پتہ چلے مگر اماں کے پاس تھا ہی کیا اوڑھنے پہننے کے کپڑوں اور دو چار بسترؤں کے علاوہ تو اسے ایک صندوق میں کر کے پلنگ کے نیچے رکھ کر آدمی چھت کے نیچے ہی چھوڑ دیا کیونکہ بانی آدمی چھت اور دو طرف کی دیوار آدمی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی۔

اماں کی حالت دیدنی تھی ایک تو گھر ٹوٹ جانے کا دکھ دوسرے ابابھی نہیں تھا اور تیسرے چور اچکوں کے بے دھڑک گھر میں گھسنے کا خوف۔ مانی حاجرہ نے رات کا کھانا بھیج دیا تھا۔ اماں سے بشکل کھایا گیا اور رات کو جب تک وہ سو نہ گئی اس نے اماں کو جاتے اور گھر میں پایا البتہ اس کا خوف تو اماں کے پاس لیتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ اماں دم درود جو کرتی رہتی تھی ویسے اماں واقعی بڑا خوش نصیب تھا کہ اماں کو پڑھنا لکھنا بھی تھوڑا بہت آتا تھا اور اسے قرآن بھی خود پڑھاتی تھی۔

آندھی کے بعد سے موسم کتنا اچھا ہو گیا ہے، ہے ناں اماں!..... وہ کمرے کی ٹوٹی دیوار کی منڈیر پر چڑھی بیٹھی آسمان پر پکڑم پکڑائی کھینچے بادلوں کو دیکھ کر بولی۔ اماں صحن کے پلنگ پر بیٹھی سبزی کاٹتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی دروازے پر کھٹکا ہوا تو اس سے کہنے کے بجائے خود چلی گئی اماں کے پر جوش سلام کی آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ شاید اماں کا کوئی کھویا ہوا رشتے دار آ گیا ہے اس نے بے نیازی سے گردن گھما کر دیکھا تو اماں کے ساتھ کسی اجنبی عورت کو بیٹھے پایا مگر اماں بہت خوش تھی اس کو شٹلے گرم کام پوچھ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی اس نے پھر دور لہلہاتے

گھس گئی اماں اس کا سراپنہ ہاتھ سے ہٹا کر باہر چلی گئی۔ وہ بھی کمرے کی چوکھٹ تک آگئی۔ خوب گہری کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی تیز ہوا کے بھکڑے سے گھڑو پچی پر رکھے گھڑے کاٹھن کا ڈھکن اڑ چکا تھا اور ڈونگا نیچے پڑا تھا۔ اماں نے اسے اندر لے کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ آندھی شدت کی تھی دروازہ بند ہو جانے پر بھی کھڑکھڑا رہا تھا۔

لیٹ جازرینہ! آندھی تھمتے تو کوئی کام ہو۔ وہ ڈر کر ماں کے ساتھ لیٹ کر سو گئی۔ اندھیرا ہو جانے کے سبب اور ہول اٹھ رہا تھا۔

ایک اور زوردار دھماکہ کی آواز آئی اور اماں نے سینے پر دھتے ہوئے ہاتھ رکھ کر کہا یا اللہ خیر! اور روشندان سے جھانکتے ہوئے آسمان صاف ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

ہلکی ہلکی پوندا باندی کے سبب آندھی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ گیلی سٹی کی مہک اس نے محسوس کی اور جانے کب وہ گہری نیند سو گئی اور شاید اماں بھی۔ ارے زریںہ اٹھ! آندھی ختم۔ اماں نے

روشندان سے موسم کا اندازہ کرتے ہوئے کہا اور چند لمحے وہیں بیٹھے بیٹھے بولی سن زریںہ یہ دیکھ چچا دینوں کے نیم کی کوئی بڑی شاخ ٹوٹ کر چھت پر آن گری ہے نیم کے پتوں نے آدھا روشندان بند کر دیا ہے۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنی مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ اماں باہر نکل گئی۔

زریںہ اوڑھ رہی! جلدی آ۔ اماں کی چیخ پر وہ اچھل کر باہر بھاگی اور خود بھی اس خوفناک منظر پر وہیں کی وہیں جم گئی۔

چچا دینوں کا بڑا سانسیم کا درخت تنے سمیت پچھلا کر ہ توڑتا ہوا صحن میں قدم بوس تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں آدھا گاؤں اس کے گھر میں موجود تھا اور

حکم دیا ہے اس طرح نکلے۔ ضروری تو نہیں کچھ برا ہو جسبی اللہ سائیں کا حکم مانا جائے برائی سے بچنے کے لیے مولانا حکامات اتارے ہیں مگر ہم لوگ برا ہو جانے کے بعد اس کا حکم مانتے ہیں۔

اماں تیری باتیں مجھے سمجھ نہیں آتیں۔ وہ اماں سے جھنجھلا کر کہتی۔

پھر مجھ پر تو زیادہ کھی کھی..... نہ ہنسا کر اماں اسے گھر کر دیتی۔

رات اس نے اماں سے پوچھا ”اماں یہ ستوانی کیا ہوتا ہے“ اماں نے کہا ”تو نے سن لیا یہ لفظ“

وہ مشکور خالہ نہیں کہہ رہی تھیں کہ یہ ستوانی نہیں لگتی۔ اماں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا۔

پتا نہیں کیا کیا بولتی رہتی ہے جھلی ہو گئی ہے تیرے ابا کی جاننے والی ہے دانی کا کام کرتی تھی اماں نے بات ختم کرنا چاہی لیکن اس کے ذہن میں پھر سوال کھلایا۔

یہ دانی کیا ہوتا ہے اماں؟  
ارے چھوٹی موٹی ڈاکٹری سمجھ لے..... اماں نے عاجز آ کر بات ختم کی اور کر وٹ لے لی۔

اماں نے صبح اس کے ہاتھ میں کاغذ کا مڑاڑا نکلوا دیا کہ جا کر ملک صاحب کی بیوی کو دے کر آ..... اور جواب بھی لانا۔ اماں نے فون پر درخت گر نے کا ابا کو بتا دیا تھا مگر اس کو آنے میں دو چار دن اور لگ سکتے تھے وہ شہر میں ہی کام دھندل جانے کی دھن میں تھا تا کہ سب کو بلا لے..... بڑا خوش لگ رہا تھا تیرا بازو رینہ۔ اماں نے اسے بتایا۔ لیکن گھر میں کھانے کا سب سامان اب ختم تھا سارا جمع جکڑا تو ابا کو دے کر اماں نے شہر روانہ

کھیتوں کو تنکا شروع کر دیا جو وہاں بیٹھ کر واضح نظر آرہے تھے اوپر بادلوں سے ڈھکا آسمان نیچے ہریالی اور ٹیوب ویل کا پانی..... وہ اس منظر میں غم بھی کہ اماں کی آواز آئی۔

نیچے آ جا زینہ تجھے مہمان سے ملاؤں.....  
اچھا اماں کہہ کر وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ وہ ابا کی عمر کی عورت تھی۔ دل میں ایک خوشگوار امید جاگی کہ شاید اماں یا ابا کا کوئی بہن بھائی ہو۔ اسے بڑا شوق تھا کہ کاش اس کے بھی ماموں زاد خالہ زاد بہن بھائی ہوتے وہ ان کے ساتھ کھیلتی کتنا مزہ آتا لیکن اماں کے سب رشتے سیلاب کی نذر ہو گئے تھے اور اب بھی سنا ہے اکلوتا ہی تھا مگر دور پار کے رشتے دار بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اس کی سوچ میں امیدیں ٹوٹی اور فنی جاری تھیں۔

ان کی باتوں میں وقفہ آیا تو اماں نے کہا مشکور خالہ یہ اپنی زینہ ہے میری بیٹی! خالہ نے اسے محبت سے دیکھا اور اپنے پاس بلا کر سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگیں۔

ارے اس نے تو دس گیارہ سال میں خوب قد کاٹھ نکال لیا کہیں سے ستوانی نہیں لگتی کیوں زلیخا!  
اس نے پہلی دفعہ کسی کے منہ سے اتنی اپنائیت سے اماں کا نام سنا۔ ویسے..... مشکور خالہ کا جملہ ادھورا رہ گیا اماں نے اسے واپس جا کر کھینے کی اجازت دے کر وہاں سے بھیج دیا وہ پھر خوشی خوشی منڈیر پر جا بیٹھی کیونکہ اماں اسے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی اور خود بھی پورا منہ چھپا کر باہر نکلتی تھی وہ اماں کا کبھی کبھی مذاق بھی اڑاتی۔ اماں بالکل ڈاکو لگتی ہو۔ اور اماں اس کو اللہ سائیں کا حکم سنانے لگتی۔

ماری کڑی عورت کو بلا ضرورت باہر پھرنا نہیں چاہیے اور مجبوری ہو تو ڈھک چھپ کر جیسا مولانا

لے لیا اور بیقراری سے پوچھا۔

کچھ دیانی بی بی جی نے۔ اس نے ہاتھ آگے کر دیا اور بھاگتی ہوئی اپنی پسند کی جگہ پر جا بیٹھی۔ اماں کی بڑبڑاہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا جو لفافے میں سے سوسو کے دلالا نوٹ نکالنے پر بڑبڑاہی تھی کہ بڑی سخاوت دکھا دی بی بی جی نے.....

کریم..... اماں نے پڑوس کی مشترکہ دیوار کے ساتھ کرسی رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے آواز دی۔ حاجرہ خالہ کی آواز آئی کیا ہوا زینہ کی ماں؟ ارے ذرا کریم ہوتا اس سے یہ سودا منگا دے اماں نے فہرست اور پیسے دونوں حاجرہ خالہ کو دے دیے۔ حاجرہ خالہ بڑوسی ہونے کا پورا پورا حق ادا کرتی تھی۔ ابا اور خالو بھی آپس میں گھرے دوست تھے۔ ہر غم اور خوشی میں آگے آگے رہتے تھے اور ان کے بچے بھی۔

جب سے درخت گر تھا اماں کمرے کے اندر کی کنڈی لگا کر سوتی تھی اور باہر جانا ہوتا تو اسے اندر بند کر کے باہر سے کنڈی لگا کر نکلتی تھی۔

اس کی ناک بند تھی سوتے سے اچانک آنکھ کھل گئی۔ اماں چار پائی پر نہیں تھی۔ اماں باہر سے بند کر کے گئی ہوگی پانی پینے اس نے دل کو تسلی دی لیکن یہ کیا ہوا کہ زور سے دروازہ کھل گیا۔ وہ سہمی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔

ٹوٹے کمرے سے آواز آرہی تھی۔ وہ اماں ہی کی تھی۔

کیا ابا آ گیا؟ اس کو اطمینان بھری خوشی ہوئی جو لمبے بھر کی تھی۔ اماں کی بھیگی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔

تیری چٹھی میرے پاس ہے جس پر تو نے کام

کیا تھا ابا اپنے گاؤں کا واحد میٹرک پاس تھا۔

اس نے چٹھی میں دبی چٹھی کو دیکھا دل چاہا کہ کھول کر پڑھ لے کہ آخر اماں نے بی بی جی کو کیا لکھا ہے لیکن اسے لگا جیسے اماں اسے دیکھ رہی ہے اس نے ہاتھ نیچے گر لیا اس نے مڑ کر دیکھا گلی اور گھر تو پیچھے رہ گیا تھا اس نے پھر پڑھنے کے خیال سے ہاتھ اوپر کیا۔ اللہ ہر جگہ موجود ہے وہ سب دیکھتا ہے۔ اس کے کانوں میں اماں کی آواز گونجی۔ اس نے خوف سے ہاتھ نیچے کر لیا۔

دو گلی چھوڑ کر ملک صاحب کا گھر تھا۔ وہ باہر ہی کھڑے مل گئے۔

”بی بی جی ہیں؟“

ہاں جاندر ہیں۔ ملک صاحب نے شفقت سے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے کہا۔

اس نے چٹھی بی بی جی کو دے دی انہوں نے پڑھ کر چٹھی ملتے ہوئے پھینکتے ہوئے کہا..... اپنی ماں سے جا کر کہہ دے کہ میں نے حساب پورا کر دیا

تھا فالٹو پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ اس کو اندازہ ہو گیا کہ اماں نے چٹھی میں پیسے مانگے ہوں گے۔

وہ چند لمبے بڑے لوگوں کی چھوٹی سوچ پر حیران سی انہیں دیکھ گئی پھر باہر نکل گئی۔ دو گلی کے کونے پر پہنچی تو پیچھے سے ملک صاحب نے آواز دے کر اسے روکا اور ہاتھ میں سفید لفافہ پکڑاتے ہوئے کہا

یہ لے زینہ بی بی جی نے دیے ہیں اماں کو دے دینا۔ گراتا نہیں کہیں۔ انہوں نے سر پر ہاتھ

پھیر کر تاکید کی اور وہ بی بی جی کی ذلت بھول کر خوشی خوشی ایک ٹانگ پر کبھی دوسری ٹانگ پر اچھلتی واپس آ گئی۔

اماں دردرازے کی جھری سے اسی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جھٹ دردرازہ کھول کر اسے اندر



کے عوض پیسے منگائے ہیں۔ تو نے زبان کھولی تو سب کو دکھا دوں گا۔ مردانہ آواز جانی پہچانی لگی لیکن خوف غالب تھا دھیان نہ دے سکی۔  
اللہ تجھے دیکھے گا ملک..... اماں کی کمزوری آواز سے سنائی دی۔

تو سیدھی طرح مان جاتی تو کا ہے تجھے سوئی چھانے کا جتن کرتا۔ اس کی مکروہ ہنسی رات کی خاموشی میں آہستہ ہونے کے باوجود وہ سن سکتی تھی لیکن کوئی بات اسے سمجھ نہیں آئی۔ وہ بے پاؤں کمرے میں آکر سوئی بن گئی۔ تاک بلکی ہی گھل گئی تھی اس نے گہری سانس لی اور پھر کب سوئی پتا نہیں چلا۔

صبح اماں نے ہمیشہ کی طرح ماتھے پر پیار کر کے اٹھایا اور ابا کے آنے کی بھی خبر دی۔ وہ فوراً خوشی سے اچھل کر بیٹھ گئی۔ رات گئی..... بات گئی۔ اسے یاد بھی نہیں رہا شاید خواب دیکھا تھا۔ وہ خوب چپک رہی تھی پر اماں کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں اداسی تھی۔

ابا دو پہر کو پہنچا بہت تھکا ہوا۔ مگر خوش بھی تھا شہر میں اچھی تنخواہ کے ساتھ کام لگ گیا تھا۔ گھر بونہی چھوڑ کر اس نے زلیخا کو ضروری سامان باندھنے کا کہہ دیا۔ وہ مکان دیکھ آیا تھا۔ ابا واقعی بہت محنتی تھی یا اماں کی محبت نے اس میں طاقت بھر دی تھی۔ اماں بھی اس کے اشارے کی منتظر رہتی تھی۔

دو دن بعد ان لوگوں نے گاؤں کو خیر باد کہہ دیا۔ کسی سے ملے بھی نہیں علاوہ مائی حاجرہ کے۔ اسے دکھ بھی تھا اور شہر دیکھنے کا شوق بھی۔

شہر اور گاؤں کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ گاؤں میں دن گزرتا نہیں تھا اور شہر میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کب دن ڈھلا کب رات ہوئی

اماں نے محلے کے ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا اور وہیں اسے ماسی کا کام بھی مل گیا۔ ہنرمند تو تھی ہی کپڑے اچھے سی لیتی تھی۔ پیسے جمع کر کے سب سے پہلے سلائی مشین خریدی۔ زرتاج کے بعد سرور کی پیدائش نے ابا کو اور جوان کر دیا تھا۔ ڈبل کام کرتا تھا کسی بڑے میڈیکل اسٹور پر بیٹھتا تھا۔ بڑھا لکھا تو تھا دوست کے کہنے پر محنت کر کے میڈیکل اسٹور کھولنے کا اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا پھر گاؤں والا گھر اور تھوڑی بہت جوتہ میں تھی اسے بیچ کر شہر میں ہی اپنا میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ آٹھ دس سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا کبھی بکھار اسے نیم کی ٹھنڈی ہوا یاد آئی مگر اماں نے کبھی ذکر نہیں کیا۔

سن زرتاج کے ابا! رات لیٹتے ہوئے زلیخا نے عبد کو مخاطب کیا جو اپنے میڈیکل اسٹور کے حساب کتاب میں مصروف تھا۔  
ہاں بول زلیخا! کیا بات ہے۔ ابا نے اس کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر پوچھا۔

تو زرتاج کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈ بارہ جماعتیں پڑھ لی ہیں اس نے۔ میں اپنی زندگی میں بچیوں کو اپنے گھر بار کا کرنا چاہتی ہوں۔

ہاں ہاں میں جانتا ہوں تو کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہے۔ اللہ سب بہتر کر دے گا۔ اس نے زلیخا کی تشویش پر اسے مطمئن کرنا چاہا۔

وہ تو ٹھیک ہے اللہ بہتر کرے گا لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ میں پریشان نہ ہوں۔ عبد تیرا احسان میں مر کے بھی نہیں اتار سکتی لیکن بچیوں کا خوف مجھے سونے نہیں دیتا۔ اگر کچھ آگے پیچھے ہو گیا تو اپنے سونے رب کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

اماں کہاں ہے تیری! ابا نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

کمرے میں بھیج دینا اماں کو بات کرنی ہے اس سے ضروری۔ اماں شور کی آواز پر خود آ گئی۔

کیا بات ہے عبدو؟ یہ بے وقت شور کیوں مچا رکھا ہے۔

یہاں آ! بیٹھ جا۔ اس نے بستر پر جگہ بناتے ہوئے کہا۔

اجھاس..... وہ تو نے زرینہ کے رشتے کی بات کی تھی تاہم میں نے کل فضل سے بات کی تھی اس نے اپنے بیٹے رضوان کا رشتہ دیا ہے اپنی زرینہ کے لیے۔ باہر کسی کمپنی میں ملازم ہے اور پہلی بھی لے جاسکتا ہے۔ وہ کل آئیں گے تو چاہے گی تو وہ کمپیوٹر پر تیری اس سے بات بھی کراوے گا اور اگر دمی رانی چاہے تو اس سے بھی بات کرائی جاسکتی ہے۔ عبدو نے پر جوش لہجے کے ساتھ ہی بات ختم کی۔

اے ہے مجھ سے تو ٹھیک ہے یہ دمی رانی سے بات کرنے کی کیا کہی تو نے۔ زلیخا نے اسے ٹوکا۔ اے عبدو کا اتنا براؤ مانڈ ہونا برا لگا۔

ارے برا ماننے کی بات تھوڑی ہے جملی آخر مذہب نے دمی رانی کو بھی تو پسند کرنے کا حق دیا ہے پھر خود تو تو بڑی مذہبی بنی پھرتی ہے اپنی بیٹی کا حق مار رہی ہے۔ اس نے عبدو کو گھوگردیکھا۔ شہر آ کر اسے بڑی باتیں بتانی آ گئی تھیں۔ اس کو دنیا کے رنگ ڈھنگ بھی بتاتا اور مذہبی باتیں بھی سمجھاتا۔

اچھا ٹھیک ہے۔ پہلے میں زرینہ سے بات کر لوں۔ ضرورت پڑی تو بات بھی کرا دوں گی۔ اس نے نیم رضامندی سے کہا۔

تو ناحق پریشان ہو رہی ہے زرینہ کی ماں رب کو اپنا بھی کہتی ہے اور اس پر بھروسہ بھی نہیں کرتی۔ عبدو نے اس کو سرزنش کرتے ہوئے اپنے سامنے بٹھالیا کوئی بات ہوئی ہے کیا؟ عبدو نے تشویشناک انداز میں پوچھا۔

نہیں عبدو بس کبھی کوئی اندر سے کچو کے لگاتا ہے۔ کہاں تو اتنا ذمے دار اور نیک۔ کہاں میں.....

عبدو قرآن میں تو ہے کہ نیک مردوں کو نیک عورتیں ملتی ہیں پھر رب نے اس امتحان کے لیے تجھے کیوں چنا۔ ماضی کے زخموں سے کبھی خون رسنے لگتا تو وہ سسک پڑتی اور عبدو کو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا اور جب سے بچیاں بڑی ہوئی ہیں وہ اکثر اس اذیت سے دوچار ہو جاتی تھی۔

زلیخا تو نیک ہی ہے جبھی میرے نصیب میں آئی جنہوں نے برا کیا رب ان کو پکڑے گا آئندہ اس بات کا ذکر نہ کرنا جب رب نے پردہ پوشی کی ہے تو تو بھی زبان بند رکھ ہاں جس گھر جائیں گی ان کو دھوکے میں نہیں رکھیں گے۔ تیری بیٹیوں کی تو ولدیت میں بھی اللہ نے میرے نام سے پردہ پوشی کر دی ہے کہ عبد اللہ یعنی اللہ کے بندے کی بیٹیاں ہیں۔ زبان سے کوئی ناشکری والا بول نہ نکالا۔ عبد اللہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ایک دو دن میں اپنے دوست فضل سے بات کروں گا اب تو روزینہ سے کہہ کر ایک کپ چائے پلووے..... اس کی توجہ ہٹا کر وہ اپنے کام میں لگ گیا اور وہ روزینہ کو چائے کا کیکھاٹھ لگئی۔

زلیخا! زلیخا! عبدو دو دن بعد دوپہر میں ہی آ گیا اور زلیخا کو بقمرا رہی سے پکارنے لگا۔

کیا ہوا ابا۔ زرینہ میں نے اب کے چہرے پر غیر معمولی خوشی دیکھ کر کہا ارے کچھ نہیں ماری کڑی

وہ بھی فضل بھائی کی فیملی کو جانتی تھی۔ انہوں نے ہی عبد کو حقیقت میں شہر میں سیٹ ہونے میں مدد کی تھی۔ اب عبداللہ کے پاس چھوٹا سی مگر اپنا گھر تھا، روزگار تھا اور وہ لوگ ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ اس نے شہر آکر پھر کبھی مڑ کر گاؤں کی طرف نہیں دیکھا ویسے بھی وہاں تھا ہی کون علاوہ تلخ یادوں کے البتہ اگر اس کے گاؤں سے کوئی آتا تو اس کی مدد ضرور کرتا۔

انہیں لوگوں کے ذریعے اسے پتا چلا کہ دو سال پہلے آنے والے سیلاب نے اس گاؤں کو بھی بڑا متاثر کیا۔ کافی لوگ بے گھر ہو گئے ملک صاحب کا بیٹا ایک گھر کی چھت گرنے کے سبب اپنی ٹانگیں ضائع کر بیٹھا تھا۔ بیوی بھی پانچ چھ سال بعد مر گئی تھی۔ ایک عورت کو وہ اس کی اور اپنی خدمت کے لیے بیاہ کر لے آیا تھا لیکن وہ ان باتوں کا ذکر زرینہ کی ماں یا بچوں سے نہیں کرتا تھا۔

اماں میں اور پڑھنا چاہتی ہوں۔ زرینہ اماں کو کچن میں اکیلا پا کر اس سے مخاطب ہوئی۔ اسے اماں نے رشتے کی بات بتادی تھی۔

دھی میری میں تجھے اس سے زیادہ نہیں رکھ سکتی۔ باقی پڑھنا پڑھانا اپنے گھر جا کر رضوان اچھا بچہ ہے تجھے روکے گا نہیں پڑھنے سے..... ملی ہوں میں اس سے میرا یقین کر رانی اماں نے دو ٹوک جواب دیا اور جب اماں ایک بار فیصلہ کر لے تو اسے بدلتی نہیں اور زرینہ کی بھی ایک نہ چلی۔ زرینہ جلد ہی زرینہ کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو گئی۔

رضوان جتنا اچھا بیٹا تھا اتنا ہی اچھا داماد اور شوہر بھی ثابت ہوا۔ زرینہ خوش تھی کہ اس کی ماں کو یقین تھا کہ جوڑکیاں اپنی ماں باپ کی عزت رکھتی

ہیں سدا سکھی رہتی ہیں۔ رضوان اسے ساتھ دینی لے گیا۔

تین چار سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ زرینہ کے بچے جب اسے مانو کہتے تو اس کا سیرد خون بڑھ جاتا تھا۔

اس دن بھی اس کا زرتاج سے بات کرنے کا دل چاہ رہا تھا مگر اماں نے بتایا کہ ابھی یونیورسٹی سے نہیں آئی تو لگہ کرنے لگی کہ اماں مجھے تو پڑھنے نہیں دیا اور زرتاج کو یونیورسٹی میں بھی ایڈمیشن دلوا دیا۔

زرینہ نے کہا تو ڈھونڈ کوئی رشتہ میری نظر میں ہوتا تو کب کار خست کر چکی ہوگی اور زرینہ کی یہی ٹوک کام کر گئی۔

اس کے شوہر رضوان کے دوست رمیز کے لیے اس کے ماں باپ لڑکی ڈھونڈ رہے تھے زرینہ نے بالابلی بالا انہیں زرتاج کی تصویر دکھا کر ان کی رضامندی پر فون کر کے رشتے کے بارے میں بتایا وہ پوری طرح مطمئن اور خوش تھی کہ اس اجنبی ملک اور لوگوں میں اس کو بہن کی صورت ایک ساسی مل جائے گا۔ اماں نے عبداللہ اور زرتاج سے بات کرنے کے لیے اس سے تھوڑا وقت لینے کو کہا۔



ایکسیکڑی..... مردانہ آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ جواد خان پیچھے کھڑا تھا۔ آپ سے کچھ بات کرنی ہے کیا کہنے میرا چلیں گی میرے ساتھ اس نے جھپٹتے ہوئے آخر اپنا مدعا بیان کر بی دیا۔ یہ لڑکی دو سالوں سے اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ آخری سال تھا اگر ابھی بھی اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا تو ساری عمر علاوہ بچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ احساس اتنا قوی تھا کہ آج

بالکل ٹھیک ہوں مگر میں آپ کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھوں گی میرے ماں باپ کا فیصلہ ہی میرا فیصلہ ہوگا آپ بخوشی اپنے والدین کو بھیجیں لیکن ایک زام ختم ہونے تک آپ اس بات کو ہمیں ختم کر دیجیے۔ وہ اس سے نظر ملائے بغیر وہاں سے اٹھ گئی۔

جواد خان کو اتنے پوزیٹو رویے کی امید نہیں تھی۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہونے کے قریب تھا اس کی آمادگی ہی اس کے لیے بہت بڑا اقرار تھی مگر وہ وعدے کا پابند تھا۔

زرتاج! اماں کی آواز پر اس نے اگلائی لیتے ہوئے کتابیں بند کیں اور نیچے پاؤں چپل تلاش کرتی اماں کے کمرے میں آ گئی۔ اماں بہت خوش لگ رہی تھیں۔ آ بیٹھ جا! اماں نے بستر پر جگہ بناتے ہوئے اس سے کہا۔

کیا ہوا اماں بہت خوش ہیں سرور کی شادی کر رہی ہو کیا؟ اس نے اماں کو چھیڑا۔

ارے سرور کی ابھی سے کیوں..... تو یونیورسٹی میں پڑھی تو وہ نہیں پڑھے گا کیا؟

اچھا اماں خیر تو ہے یہ تو بتادے کیوں بلا تھا۔ اسے پیپر کی تیاری کرنی تھی اس نے اماں کو اٹائی میٹم دیا کہ جلدی بات کرے ورنہ وہ چلی جائے گی۔

اماں نے غصہ برداشت کرتے ہوئے زربینہ کی رشتے والی بات اسے بتادی۔

اماں ابھی مجھے آرزو تو مکمل کر لینے دیں اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

ارے تو ہم کو سا تجھے کل بیاہ دیں گے۔ بات پکی کریں گے۔ شادی اگلے سال ہی ہوگی۔ اماں نے برامتے ہوئے کہا۔

جب شادی ایک سال بعد کرنی ہے تو بات بھی جیسی پکی کر لیجئے گا ابھی سے کیا ضرورت ہے اماں۔

موقع ملے ہی اس نے ہمت کر کے اسے ساتھ چلنے کی آفر کر دی۔ وہ اس کے فرینڈز سرکل میں ہی تھی مگر بہت لیے دیے انداز میں۔ گروپ کے سارے فرینڈز اس کی اس دلچسپی کو جانتے تھے اور شاید وہ بھی لیکن اس نے کبھی اسے توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا ایک تو اماں لڑکوں سے دوستی کے ہی خلاف تھیں دوسرے وہ جان دے سکتی تھی مگر اماں کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے باجواب ہونے کے باوجود جواد خان اس پر کیوں اتنا مرتے ہے یہ اس کی سمجھ سے بالاتر بات تھی۔

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اس نے باقی گروپ ممبرز کے بارے میں پوچھا تو اس نے دوبارہ وہی بات کی کہ میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں پھر یہیں بات کریں جواد صاحب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اس نے نکسا سا جواب دیا۔

دراصل میں اپنے پرنس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں اس کو یوں کھڑے کھڑے پر پوز کرنا بہت برا لگ رہا تھا لیکن محبت کی ضد یہی تھی۔

کیوں..... اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ میرے خیال میں تم اتنی انجان تو نہیں۔ وہ اب اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولا

مگر جواد صاحب اندھیرے میں تیر چھوڑنے کے بہت نقصانات ہوتے ہیں۔ گھبرا کر ساتھ رکھی بیچ پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی گھبرا گیا۔

زرتاج کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ خود فاصلہ رکھ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

چند لمحوں میں اس نے خود کو کنٹرول کیا اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ جی جواد صاحب میں



اس نے پھر بیزاری سے کہا۔

اماں کی چھٹی حس ایک دم جاگ گئی۔ ترچھی نظروں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے انجانے خوف سے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔  
زرتاج کوئی اور بات تو نہیں نا۔ اندیشوں کے سانپ کنڈلی سے باہر نکلنے لگے۔ اس کی خاموشی میں ان کی چھکار واضح ہونے لگی تو بے اختیار آواز اونچی ہو گئی۔

بتا زرتاج! مجھے سولی پر مت لٹکا۔ اماں کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

نہیں..... نہیں اماں کوئی بات نہیں ہے۔ وہ..... اس کی زبان اپنی بات کہتے ہوئے لٹکھڑا رہی تھی مگر ذہن کہہ رہا تھا کہ اس وقت بات کر لینا ہی مناسب ہے اس نے ساری بات اماں کو بتادی۔

مگر سن لے زرتاج! مجھے پسند نہ آیا تو میں اپنی مرضی سے تیری شادی کر دوں گی تو مجھ سے کیا 'کیوں' کیسے جیسے سوالات نہیں کرے گی۔

اماں مجھے اگر اس سے کوئی جذبات لگاؤ ہوتا تو بھی تمہارے فیصلے کے آگے اس سے پیچھے ہٹ جاتی۔ اس وقت ٹالنے کے لیے اس سے وعدہ کر چنچی ہوں میری بات رہ جائے گی ماں صرف اس لیے کہہ رہی ہوں تجھ سے کچھ نہیں چھپا رہی ماں سچ۔ اس نے ماں کے ہاتھ کو یقین کے ساتھ دبایا اور اماں کو پرسکون دیکھ کر واپس آ گئی۔

جب سے زرتاج نے بات کی تھی زلیخا کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ عبد اللہ لاکھ اس کی ہر خوشی اور غم کا ساتھی تھا کوئی بات اس سے چھپی نہیں تھی مگر وہ اپنے اس سب سے بڑے محسن کو دوبارہ کسی اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی اسے ایک ایک بل گزرتا مشکل لگ رہا تھا۔ آخری پیپر والے دن

اس نے زرتاج سے کہہ دیا کہ وہ کل جواد کے گھر والوں کو بلا لے۔ وہ جلد فیصلہ کرنا چاہتی ہے۔ رمیز کے والدین جواب مانگ رہے ہیں۔

جب سے جواد کے ماں باپ مل کر گئے تھے زلیخا زخمی ناگن کی طرح بے چین و متعمر کرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی اس کو جس بات کا دھڑکا تھا وہ ہو گئی تھی زرینہ کو تو اس نے بچا لیا تھا لیکن زرتاج..... وہ سسک بڑی۔ سرور کے ابا مجھے معاف کر دے مجھ سے اور نہیں سہا جاتا۔ عبد اللہ نے اس کو ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی۔

زلیخا تیری اعلیٰ ظرفی اور دور اندیشی نے مجھے خاموش کر دیا تھا میرے دل میں تیرے لیے اتنا سا فرق نہیں آیا تو اب کیوں کمزور ہو رہی ہے۔ رب نے ہماری محبتوں اور خلوص کا اجر سرور کی صورت میں دیا تو اس نے انہونی پر بھی یقین نہیں کرتی کہ رب ہمارے ساتھ ہے۔ اسی نے کل بھی مجھے تیری ڈھارس بنایا تھا اور آج بھی تیرے ساتھ ہوں۔ تو مجھے اور میرے بچوں کو اتنا کم طرف نہ سمجھ۔ ان کو سب پتا ہے۔

کیا مطلب؟ وہ متوحش ہو کر بولی۔  
سہی کہ ان کی ماں کتنی پاکیزہ ہے اور لوگ کتنے خراب ہوتے ہیں۔ تجھے جو کرنا ہے وہ کر جو کہتا ہے وہ کہہ دے اور جہاں جانا ہے مجھے بتا۔ ہم سب تیرے ساتھ ہیں زلیخا! میں مرد ہو کر برداشت کر گیا تو پھر تو بھی دل مضبوط کر کے فیصلہ کر..... عبد اللہ نے ایک بار پھر اپنے اور بچوں کا یقین اس کی جھونکی میں ڈال کر اسے مالا مال کر دیا۔

زرتاج! ذرا زرینہ سے میری بات کرادے۔  
زلیخا نے زرتاج کو سیل فون پر مصروف دیکھا تو فوراً زرینہ سے بات کرنے کا خیال آ گیا۔ صبح کا وقت

زرتاج کے ماں باپ گاؤں آنا چاہ رہے ہیں۔  
 نیک بخت! مہمان آ گئے۔ ملک زوار نے  
 اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی اور بیٹھے کو کہا۔  
 اس کی بیوی بھگم بھاگ آئی اور زلیخا سے  
 گلے مل کر اسے زنان خانے کی طرف لے جانے کو  
 مڑی لیکن زلیخا کی آواز ابھری  
 مجھے ملک سے اور یہیں بات کرنی ہے، ہمیں  
 زیادہ دیر نہیں رکنا۔

ملک کارنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اس کی بیوی  
 نے حیرت سے زلیخا کی طرف دیکھ کر کہا۔  
 ارے آپ بیٹھیں تو..... مگر زلیخا نے ملک کی  
 طرف سے اپنا رخ موڑے بغیر اس کی بات کو  
 نظر انداز کرتے ہوئے کہا

ملک یاد کرو وہ رات جب میں نے تجھے کہا تھا  
 کہ میرا صبر تجھ پر پڑے گا۔ بقول تیرے مجھے تو لٹنے  
 کی عادت ہے عبداللہ ہے نا تیرا پردہ رکھنے کے لیے  
 ..... تو نے رات کی تاریکی اور تنہائی کا فائدہ اٹھا کر  
 میری نیم مڈھوشی میں جو کام کیا تھا اس کا نتیجہ میں  
 تجھے اس دن کے اجالے میں سب لوگوں کے  
 سامنے باہوش و حواس نہ آنی ہوں۔ میرا پردہ  
 رکھنے کے لیے تو رب نے عبداللہ کو بھیج دیا اب تیرا  
 پردہ کون رکھے گا؟ تو نے کل جو میری عزت سے  
 کھیل کر میرے شوہر کے منہ پر چھڑ مارا تھا میں آج  
 اس کی کوئی تجھے نہ سناؤں گی ہوں "ہمارے مذہب  
 میں بہن بھائی کا رشتہ بڑا مقدس ہے یہ بات تو اپنے  
 بیٹے اور بیوی کو سمجھا سکتا ہے تو سمجھالے..... میں  
 نے تیرے بیٹے کو اپنی رضا مندی دے دی ہے.....  
 اب تو اپنی عزت اور نسل بچا سکتا یہ تو بچالے.....  
 زلیخا نے تحقیر بھری نظروں سے ملک کو دیکھا اور  
 عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔ ☆☆

تھا بچے بڑے سب اپنے اسکول اور کام دھندوں پر  
 جا چکے تھے اس لیے بات کرنے کا سنہری موقع تھا۔  
 اچھا اماں! زرتاج نے اماں کو کال ملا کر دے  
 دی۔ سلام دعا اور حال احوال بوجھنے کے بعد اماں  
 مطلب کے موضوع پر آ گئیں۔  
 ہاں زریہہ رمیز کے والدین کب تک آئیں  
 گے؟

اماں وہ تو آپ کے جواب کا انتظار کر رہے  
 ہیں۔ آپ جب کہیں۔  
 اچھا..... اچھا میرا بچہ تو ان کو اگلے اتوار کا کہہ  
 دے۔ اپنی زرتاج بھی راضی ہے اور تیرے ابا نے  
 بھی پوری معلومات کروالی ہیں۔ ہم نکاح پہلے  
 کر لیں گے۔ انہوں نے زرتاج کو بغور دیکھتے  
 ہوئے ایک سانس میں ساری بات بتادی تاکہ  
 زرتاج کو ہتا چل جائے کہ وہ جواد کے لیے راضی  
 نہیں۔ زرتاج کے چہرے پر ایک تاثر ابھرا کر ختم  
 ہو گیا۔

واقعی اماں؟ زریہہ سے خوشی سن بھل نہیں رہی  
 تھی۔ ذرا زرتاج سے میری بات تو کرائیں۔ اپنے  
 سوال کے جواب میں اتنا طویل مثبت جواب سن کر  
 زریہہ نے کہا اور اماں فون زرتاج کے حوالے  
 کر کے کھڑی ہوئیں۔

جو کام کرنا تھا انہوں نے کر لیا جو دیکھنا تھا دیکھ  
 لیا اور کمرے سے نکلے ہوئے زرتاج کی آسودہ و  
 مطمئن آواز انہیں خوش کر گئی۔ اب اسے آخری کام  
 کرنا تھا۔

☆.....☆

آؤ آؤ..... عبداللہ ملک زوار نے حجاب میں  
 موجود زلیخا کی طرف دیکھتے ہوئے جوش سے کہا۔  
 جواد نے کل ہی انہیں فون کر کے بتا دیا تھا کہ



افسانہ  
ہمیں فضل خالق

# آئینے کی پشت

بزرگوں کو سب سے زیادہ خوفزدہ تنہائی کرتی ہے..... اور ان

کو تنہائی کا عذاب دینے والوں کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے  
جب یہ تنہائی ان کا بھی مقدر ہوگی.....

”سارا بیٹی..... کہاں ہو..... بیٹی سارا.....“

”جی..... جی..... جی دادا جان.....“ سارا جانے کس کو نے  
دادا ہاتھ میں انگوڑوں کا لٹافہ لیے مسلسل سارا کو پکار  
سے برا آمد ہوئی دادا سنی دیر میں دھم سے لاؤنج کے  
صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے  
رہے تھے۔

URDU TUBE  
A HUB OF ENTERTAINMENT  
www.urdutube.com



میں ایک دوسرے سے دور نہ رہ پاتیں..... ایک ہی اسکول میں دونوں ایک کلاس میں پڑھتیں اور گھر میں بھی دونوں ساتھ ساتھ رہتیں۔ سارا کے ابو اُس کے بچپن میں وفات پا چکے تھے اُس کا کوئی بہن بھائی نہ تھا اُس کی والدہ مقامی کالج میں پرنسپل تھیں..... سارا گھر میں بہت تنہائی محسوس کرتی تھی اس لیے وہ اکثر سہانہ کے گھر میں پائی جاتی تھی۔ دوسرے سہانہ کے گھر میں اس کے دادا جی تھے جو سہانہ کے ساتھ ساتھ اُس سے بھی بہت شفقت اور محبت سے پیش آیا کرتے تھے اور سارا جو باپ کی محبت کی ترسی ہوئی بیٹی تھی وہ دادا جی کی پُر شفقت ساتھ میں اپنے والد کو تلاش کرتی رہتی..... سہانہ کے والد کا رو بار کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہتے تھے اور سہانہ کے دو بڑے بھائی تھے سہانہ سب سے چھوٹی تھی۔ سہانہ کی والدہ سخت مزاج خاتون تھی لیکن دادا جی سے اُن کا سلوک ظالمانہ ہوتا..... جب سہانہ اسکول سے گھر آتی تو بیچ میں اُس کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے رکھے جاتے لیکن دادا جی کے سامنے پانی جیسا شور بہ رکھا جاتا یہ کہہ کر دوسرے کھانوں سے اُن کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے حالانکہ تب دادا جی کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہ نہ تو اتنے کمزور تھے اور نہ ہی اتنے بوڑھے کہ شور بے کے علاوہ اور کچھ ہضم نہ کر سکیں۔ یہ سب سارا نے کئی بار دیکھا تھا اور اُس کا مقصود دل دادا کے لیے بہت کڑھا کرتا تھا اس لیے وہ اپنے طریقے سے اس کا مدد اس طرح کرتی کہ اگر اپنے فرنگ میں کھیر کا ڈوگر رکھا ہوا پانی یا کوئی اور اچھی چیز..... تو وہ چپکے سے اُس وقت وہ دادا جی کے لیے لاتی جب سہانہ کی امی دوپہر کو قیلولہ کرنے اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔ سارا کی اس محبت پر دادا جی کی آنکھیں پُرم ہو جاتیں۔ وہ اکثر کہتے کہ سہانہ اگر میری ایک آنکھ ہے تو سارا دوسری

سارا نے سلام کیا تو اُسکے سلام کا جواب دے کر دادا نے لفاظی اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ریدی والے سے زبردست قسم کے انکور لایا ہوں سارا بیٹی..... کالمی انکور ہیں..... ایک ایک دانہ پاؤ پاؤ بھر ہے.....“

لفافہ تھام کر سارا نے اُسے کھول کر اندر نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”انکور تو واقعی بہت ریلے لگ رہے ہیں دادا لیکن میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ آئندہ سے آپ کچھ نہیں لائیں گے..... میرے اوپر کوئی پیسہ خرچ نہیں کریں گے.....“

”چھوڑو سارا بیٹی..... کبھی کبھار تو بندے کا دل کرتا ہے کہ اپنے پیادوں پر خرچ کرے..... اچھا چلوئی دی آن کرو..... خبروں کا ٹھیک لگا دو..... سنا ہے نواز شریف کو سزا ہو گئی ہے۔“

”جی دادا جی..... ابھی لگاتی ہوں“ سارا نے پھرتی سے ٹی وی آن کیا اور پھر بولی ”میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا دادا جی..... آج میرا فرنگ ٹوسٹ بنانے کا پروگرام ہے میں کچن میں جا کر اپنے لیے اور آپ کے لیے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔“

”نن..... نہیں سارا بیٹی..... ناشتہ تو میں کر چکا ہوں..... ہاں تمہارے ساتھ ایک کپ چائے پی لوں گا“ دادا کے جواب پر اس کا منہ بن گیا ”بالکل نہیں دادا جی..... آپ میرے ساتھ ناشتہ ضرور کریں گے..... مجھے اکیلے بالکل حرا نہیں آتا۔“

’چلو..... ٹھیک ہے‘ دادا ہنس کر بولے تو وہ قلعہ نہیں بھرتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

دادا اور سارا کے بیچ کوئی سگا رشتہ نہیں تھا۔ کسی زمانے میں دادا اور سارا کے والد کے گھر ایک محلے میں ساتھ ساتھ تھے۔ دادا کے اکلوتے بیٹے کی چھوٹی بیٹی سہانہ اور سارا کی دانت کاٹنے کی دوستی تھی دونوں ایک



آٹکھ..... داداجی سارا کی اُن ساری محرومیوں کی ازالہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے جو باپ نہ ہونے کی صورت میں اُسے لائق تھیں..... دونوں بچیاں جوان ہو گئیں تو سہانہ کی شادی اُس کے کزن جو جرنی میں انجینئر تھے سے اُس کی شادی ہو گئی اور وہ جرنی سدھار گئی..... سارا کی والدہ کو کالج کی طرف سے بنگلہ مل گیا سو وہ یہ کرائے کا گھر چھوڑ کر وہاں شفٹ ہو گئے..... سارا کو سب سے زیادہ غم داداجی کو چھوڑنے کا تھا۔ داداجی بھی اُس کے لیے بہت اداں تھے بار بار کہتے تھے۔ دونوں پوتوں نے اکیلا کر دیا۔ جاتے سے سارا داداجی کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی اُسے ایسے لگ رہا تھا جیسے آج وہ اپنے والد سے بچھڑ گئی ہو۔ بعد میں بھی وہ داداجی سے ملنے اکثر آتی رہتی..... پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ موقوف ہوتا گیا..... اُس کی شادی اشفاق سے طے پا گئی اور یہ شادی کچھ ایسی ایمر جنسی میں ہوئی کہ سارا کسی کو بھی انوائٹ نہ کر سکی اور شادی کے بعد داداجی سے جیسے اُس کا رابطہ ختم ہو گیا حالانکہ دل سے بھی داداجی کا خیال نہیں ہوسکا تھا سارا کے داداجی سے نہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سہانہ کی والدہ کو اُس کی اور دادا کی محبت ایک آنکھ نہ بھائی تھی..... سارا کو وہ سہانہ کی وجہ سے برداشت کرتی تھی اب جب سہانہ دور چلی گئی تو اُسے سارا کی آمد بالکل پسند نہ تھی سارا ایک حساس لڑکی تھی جب بھی وہ سہانہ کی امی کے رویے کا سوچتی تو وہ دادا سے ملنے کا خیال رد کر دیتی۔ اور چاہتے ہوئے بھی وہ وہاں نہ جاپاتی شادی کے بعد سارا نے اپنے شوہر اشفاق کو داداجی کے بارے میں ایک ایک بات بتائی تھی۔ اشفاق ایک کھلے دل اور کھلے ذہن والا بندہ تھا وہ سارا سے بہت محبت کرتا تھا سو اس نے کئی بار سارا کو دادا سے ملنے کے لیے کہا بلکہ خود اُس کو ساتھ جانے کی آفر بھی لی لیکن سارا کو یہ

بھی منظور نہ تھا کہ سہانہ کی امی اشفاق سے اچھی طرح نہ ملے یا ایسا رویہ رکھے جو اسے اشفاق کے سامنے شرمندہ کر کے رکھ دے سو وہ کوئی بہانہ بنا کر انکار کر دیتی۔ سارا اور اشفاق شادی کے بعد اکیلے رہتے تھے اشفاق ایک پرائیویٹ فرم میں انجینئر تھا۔ اُس کی والدہ تھی۔ ایک بہن بھی جو شادی شدہ تھی۔ اشفاق کی شادی کے بعد اُس کی بہن والدہ کو اپنے ساتھ دہلی لے گئی..... اب اشفاق اور سارا ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تبا تھے، گرمیاں آ رہی تھیں..... سارا کو لان کی خریداری کرنی تھی..... وہ اور اشفاق ایک بڑے شاپنگ سینٹر چلے گئے۔ سارا بھی وٹرو شاپنگ میں مصروف تھی کہ جہاں من پسند کپڑا نظر آیا تو اندر گھس جائے گی کہ اچانک اُس کی نظریں ایک جگہ پر پڑھری گئیں..... اُس نے آنکھیں مٹل مٹل کر دیکھا لیکن منظر تبدیل نہیں ہوا..... وہ داداجی ہی تھے جو سہانہ کی امی کے پیچھے بہت سارے تھیلے اٹھائے کسی وفادار نوکر کی طرح پیچھے پیچھے جا رہے تھے..... تھیلے کافی بھاری لگ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر تھکان سی نظر آ رہی تھی۔ سارا کا دل اچھل کر قلق میں آ گیا اُسے لگا جیسے اُس کے دل میں کسی نے تیز نوکیلا بالا گھسیڑ دیا ہو..... اُس نے خود کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی وہ دوڑ کر گئی ور بے اختیار دادا سے لپٹ گئی۔

داداجی..... میرے اچھے داداجی..... وہ اُن سے لپٹی زار و قطار روئے جا رہی تھی..... اُسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ ارد گرد لوگ اُسے دیکھے جا رہے تھے داداجی اُسے اپنے بازوؤں میں مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور اُن کے بے آواز آنسو اُن کی داڑھی کو بگولے جا رہے تھے جبکہ قدرے فاصلے پر کمری سہانہ کی امی بیڑاری در کوفت سے انہیں دیکھنے جا رہی تھیں۔

کا۔

”میں نے انہیں تمہارا کارڈ دے دیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے۔“ وہ اداسی سے کہتی ہوئی جانے لگی۔ اور پھر اشفاق کے لاکھ کہنے کے باوجود وہ شاپنگ کے لیے خود کو آمادہ نہ کر سکی اور کچھ خریدے بغیر گھر واپس آ گئی۔

سارا بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہی تھی اور دادا بھی سارا سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے سو وہ اگلے دن ہی سارا کے گھر پہنچ گئے۔ اُس دن سنڈے تھا۔ اشفاق گھر ہی تھے سارا دادا جی کے گلے لگی تو جدا ہونا یاد نہ رہا۔ وہ دادا جی کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی دادا جی اُسے تسلی دیتے دیتے خود بھی ابدیدہ ہو گئے۔ اشفاق اُن سے بڑی عزت اور عقیدت سے ملا جبکہ دادا اُس سے بڑی محبت سے ملے اُس دن سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ سارا کس نہیں چل رہا تھا کہ دادا جی کو سب کچھ کھلا دے۔ جبکہ دادا بڑی محبت سے کہہ رہے تھے ”سارا بیٹی! اگر تم میری مہمان داری اسی طرح کرو گی تو میں پھر نہیں آیا کروں گا۔“

”نہیں دادا جی!۔“ وہ گہرا کر بولی۔ ”یہ تو پہلی بار تھی نا دادا جی!۔ آئندہ آپ کو خالی چائے پر رُخ دیا کروں گی۔ بس آپ آنا نہ چھوڑیں۔“ تینوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن سارا کے گھر آنا دادا جی کی عادت بن گئی۔ سارا کو بھی اُن کے آنے کا شدت سے انتظار پڑتا۔ اچھی اچھی چیزیں اُن کے لیے بنا کر رکھتی دادا جی کو گھر میں ٹی وی کی سہولت حاصل نہ تھی۔ لاؤنج میں ایک ٹی وی ہوتا تھا جسے بعد میں اُن کی بہو نے اپنے کمرے میں منتقل کر لیا جبکہ دادا جی کو خبریں دیکھنے کا ایک جنون تھا۔ سو وہ جیسے ہی سارا کے گھر آتے ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے۔ سارا کو بچپن کا زمانہ اچھی طرح یاد تھا جب اکثر سارا

”کہاں کھو گئیں تھی میری گڑیا!۔“ دادا جی ہیکے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ”میںیں بھی دادا جی! وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”سارا“ سہانہ کی ای بولیں۔۔۔۔۔ ”اب یہ جذباتی مناظر ختم کرو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں اور اباجی!۔۔۔۔۔ آپ بھی چلیے۔۔۔۔۔ مجھے دیر ہو رہی ہے“ وہ آگے بڑھ گئیں۔ سارا نے پھرتی سے اشفاق کے آفس کا کارڈ جس میں گھر کا بھی ایڈریس تھا دادا جی کو تھماتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ میرے شوہر اشفاق کا کارڈ ہے۔ اس میں گھر کا ایڈریس ہے۔۔۔۔۔ آپ ضرور آئیے۔۔۔۔۔ پھر میری ساری باتیں کریں گے۔“

دادا جی نے اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے کارڈ اپنے گھر کے کی جیب میں ڈال دیا۔ جب اشفاق جو اپنے شاپنگ کرنے ایک شاپ میں گھسے تھے۔ واپس آئے تو سارا خالی خالی نظروں سے اُس راستے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے دادا جی گزر کر گئے تھے اشفاق آیا تو سارا کو کسی جیسے کی طرح کھڑے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ”سارا!۔۔۔۔۔ اپنی پرالیم؟“

”نہیں“ سارا نے ٹھنڈی سانس بھری ”لیکن مجھے شاپنگ نہیں کرنی۔“ ”لیکن کیوں؟“ اشفاق حیران ہو کر بولے ”تم تو شاپنگ کرنے آتی تھیں۔۔۔۔۔“

”لیکن“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”دادا اتنا بھاری بھرکم سامان جانے کب سے لیے لیے بھر رہے تھے۔ کاش اشفاق تم ہوتے تو اُن کا سامان گاڑی تک لے جاتے۔ دادا بے چارے!۔“ وہ مارے رقت کے جملہ پورا نہ کر سکی۔

”دادا جی!۔۔۔۔۔ او گاڑ۔۔۔۔۔“ اشفاق سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ”تم دادا جی سے ملی ہو بھی اتنی افسردہ ہو رہی ہو۔ میں اُن سے نہیں مل پایا۔ سارا!۔۔۔۔۔ تم مجھے کال کر دیتیں۔۔۔۔۔ کتنا شوق تھا مجھے اُن سے ملنے

سارا کو یہی پتہ چلا تھا کہ سہانہ کے دونوں بھائی ابراہیم اور جہاں زیب برسرِ روزگار ہو گئے تھے اور اُن کی امی اب اُن کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں..... سہانہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی اور مصروفیت کی وجہ سے زیادہ بات نہیں کر پاتی ویسے بھی سہانہ میں شاید اپنی ماں جیسی عادتیں تھیں کہ وہ خود سے کبھی سارا سے رابطہ نہیں کر پاتی۔ سارا شروع شروع میں اُس سے ہر وقت رابطے میں رہتی بعد میں بھی اُس نے بہت کوشش کی لیکن اکثر کال نہ ملتی شاید اُس نے اپنا نمبر چھینچ کر دیا تھا اور سارا کو بتایا بھی نہیں اگرچہ سارا کی منہج میں وفاداری کوٹ کوٹ کر شامل تھی لیکن اُس کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ زبردستی سہانہ کو تنگ کرتی رہے سو وہ دل موس کر رہ گئی اور سہانہ سے رابطہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گیا.....!

سہانہ چند دن کی چٹھیاں گزارنے پاکستان آئی تھی۔ سسرال میں ایک دو دن رہ کر اب وہ ماں کے گھر آئی تھی..... شام کی چائے پر ماں بیٹی اکیلی ہوئیں تو اُن کی امی نے قدرے راز دارانہ انداز میں سہانہ کو کہا۔  
 ”سہانہ..... تمہیں ایک بات بتانی تھی.....!“  
 ”جی..... ممما..... بتائیے.....“ سہانہ نے نمکو کے دانے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”بات تمہارے دادا کی ہے“ امی کی آواز سرگوشی میں دھل گئی..... دادا کے متعلق سہانہ کے منہ کی طرف جاتا ہاتھ رک گیا

”ہاں..... دراصل تمہارے دادا کی..... کچھ کچھ پراسراری سرگرمیاں ہو گئی ہیں.....“  
 ”کیا مطلب ممما.....؟“ سہانہ نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... وہ ہر تیسرے چوتھے دن خوب تیار ہو کر کہیں جاتے ہیں..... اور سارا دن وہاں گزار کر

سہانہ کے ساتھ اسٹڈی میں مصروف ہوتی تو کھانے کا ٹائم آ جاتا تب وہ سب میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے لیکن دادا جی کا کھانا شور بہ ہوتا جس کے ساتھ خمیری روٹی ہوتی۔ شور بہی بالکل چلا ہوتا اور نمک تو شاید ہوتا ہو لیکن اور اس کے اندر کچھ نہ ہوتا..... تب سارا کو ذرا بھی اچھانہ لگتا اور وہ جب دیکھتی کہ دادا جی نیند کی نظروں سے اُس کھانے کو دیکھتے رہتے جو میز پر بچا ہوتا تو وہ دادا جی کو آفر کرتی.....“ دادا جی..... یہ چھوڑ بیئے..... ہمارے ساتھ کھائیے نا.....“  
 ”نہیں سارا“ آہنی فوراً بولیں.....“ دادا کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے..... میں انہیں مرغن کھانے نہیں دیتی۔“

دادا جی سر جھکا کر اُسی شور میں ڈبکیاں مارنے لگتے لیکن سارا کے گلے میں نوالہ بڑی طرح چھننے لگتا..... یہ ساری یادیں اب بھی اُس کے آس پاس رہتی تھیں..... اور اسے یقین تھا کہ آبی اب بھی دادا جی سے اُسی طرح بلکہ شاید اُس سے بھی برا سلوک کرتی ہوں گی۔ اور جب سے اُس نے مارکیٹ میں دادا جی کو سامان اٹھائے نوکروں کی طرح آہنی کے پیچھے پیچھے دیکھا تھا تب سے اُس کا دل بہت برا ہوا تھا اب وہ حیلوں بہانوں سے دادا کے لیے اچھی اچھی اور طاقت والی چیزیں پکاتی اور انہیں کھلاتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ دادا جی خود پر ڈھائے گئے مظالم کی کہانیاں انہیں کبھی نہیں سنائیں گے۔ لیکن وہ تو ان باتوں کی چشم دید گواہ تھی۔ ٹی وی دیکھتے اور چائے پیتے ہوئے سارا اور دادا جی ڈھیروں باتیں کرتے۔ حالات حاضرہ کی باتیں..... سیاست کی باتیں اور جانے کون کون سے موضوعات وہ ایک دوسرے سے دُکس کرتے۔ اگر دادا جی نہ بتاتے تو گھر کی باتیں نہ بتاتے..... بس عام سی باتیں سارا کے بہت پوچھنے پر بتا دیتے اب تک

”مما..... آپ نے بابا سے یہ بات ڈسکس کی؟“ سہانہ نے پوچھا..... ”تمہارے بابا نے کبھی کسی گھریلو معاملے میں دلچسپی لی ہے..... کبھی کوئی مسئلہ سلجھایا ہے جو میں انہیں بتاتی..... وہ ساری ذمہ داریاں میرے کندھوں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو گئے ہیں..... میں تو اس گھر کے مسئلوں کو سلجھاتے سلجھاتے پس کر رہ گئی ہوں..... اس لیے تو میں تمہارا ویت کر رہی تھی کہ تم آؤ گی تو دونوں مل کر اس مسئلے کو حل کریں گے۔“ ای کی بات پر سہانہ کی گہری سوچ میں گم ہو گئی..... دور سے بابا بھی لان میں آتے نظر آ گئے تو دونوں ماں بیٹی خاموش ہو گئیں.....

دادا سہانہ کے آنے پر بہت خوش تھے وہ بہانے بہانے سے اُس کے پاس بیٹھتے..... اُس سے باتیں کرتے..... اُس کے بچوں کے لیے چاکلیٹ اور ٹافیاں خرید کر لاتے..... سہانہ اُن سے کرید کرید کر پوچھتی ”دادا..... آپ گھر میں رہ رہ کر بور نہیں ہوتے..... آپ کا کوئی دوست بھی نہیں جہاں جا کر کچھ وقت گزار سکیں۔“

”شروع سے طبیعت دوست بنانے کی طرف مائل نہیں تھی سہانہ بیٹی..... اور اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے..... اب کیا دوست بنانا.....“ دادا آزر دگی سے جواب دیتے..... سہانہ مسلسل اِس ٹاپک پر بات کرتی کہ شاید دادا کی باتوں سے کچھ اخذ کر سکیں لیکن دادا تو اسے بات کا سر ا پکڑنے نہ دیتے..... اب تو سہانہ بھی ماں کی باتوں سے کچھ متفق ہو گئی تھی ورنہ دادا کم از کم اُس سے تو نہ چھپاتے کہ وہ گھر بھر میں سہانہ سے ہی زیادہ فری تھے اور اپنی ہر بات ہمیشہ اس سے شیر کرتے تھے بڑی سوچ بچار کے بعد امی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اور سہانہ دادا کا پیچھا کریں اور اُس عورت کے گھر تک پہنچ کر اُسے رنکے ہاتھوں پکڑ لیں..... سہانہ امی کی اِس

آتے ہیں..... اور جب واپس آتے ہیں تو بہت ہشاش بشاش نظر آتے ہیں.....“

”تو مما جاتے ہوں گے کسی دوست کے پاس..... اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے“ سہانہ نے بے پروائی سے کہتے ہوئے دوبارہ سے نمکو کے چار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ایسی بات نہیں..... تمہارے دادا کا کبھی کوئی دوست میں نے نہیں دیکھا..... محلے والوں سے بھی بس اُن کی سلام دعا ہے..... جب ساری عمر اُن کا کوئی دوست نہیں تو اب اس آخری عمر میں دوست کہاں سے چپک پڑا“ امی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”پھر..... پھر کیا بات ہو سکتی ہے.....“ سہانہ نے پوچھا۔

”دراصل..... میرا خیال ہے..... بات کسی عورت کی ہے..... تمہارے دادا کے چہرے پر پھیلی مسرتیں تو مجھے کچھ اور ہی کہانیاں سنارہی ہیں.....“ امی کی یہ بات سہانہ کو جی بھر کر بری لگی..... تنک کر بولی ”مما..... آپ دادا پر الزام لگا رہی ہیں..... جب دادی فوت ہوئی تھیں اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ وہ تنہا رہ گئے تھے تو جب اُن کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آ سکتی تھی..... تو اب بھلا اس عمر میں وہ کسی اور عورت کو اپنی زندگی میں لائیں گے..... امپا سبل.....“

”دیکھو بیٹا..... مرد کبھی یوڑھا نہیں ہوتا..... اور اُس کے جذبات اور احساسات کب کسی کے بارے میں بدل جائیں کچھ کہنا نہیں جا سکتا ہو سکتا ہے انہیں کوئی ایسی عورت اس عمر میں لگتی ہو جسے وہ اپنے لیے پرفیکٹ سمجھتے ہوں..... بلکہ مجھے تو لگتا ہے انہوں نے اس عورت سے نکاح بھی کر لیا ہوگا..... تبھی تو باقاعدگی سے ہر تیرے چوتھے دن وہاں جاتے ہیں اور سارا دن وہاں رہ کر آتے ہیں۔“





تجويز سے زيادہ متفق نہيں تھی۔

”مما..... دادا کی اپنی زندگی ہے..... ہمیں اس طرح دادا کی پرس زندگی میں انتر فیر نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی تو امی نے اُسے جھڑک دیا اور بولیں۔ ”یہاں کسی کی کوئی پرس زندگی نہیں ہوتی..... سب دوسروں کے لیے جیتے ہیں..... سوچو تو..... تمہارے سرالیوں تک بات پہنچ گئی تو تمہاری کیا عزت رہ جائے گی اُن کی نظروں میں.....!“ اور کل کلاں کو میں ابراہیم اور جہاں زیب کی شادیاں کروں گی تو وہ لوگ ہمارے خاندان کے بارے میں کیا سوچیں گے..... نہیں سہانہ..... اس کا سد باب کرنا بہت ضروری ہے..... یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔“

سہانہ نے ماں کی بات پر سر جھکا لیا..... اب دونوں ماں بیٹی کو انتظار تھا کہ دادا کب جاتے ہیں..... وہ دن جلد ہی آ گیا۔ دادا جس دن اپنی مطلوبہ جگہ پر جاتے تھے اُس دن وہ گھر میں ناشتہ نہیں کرتے تھے اُس دن بھی اس نے گھر میں ناشتہ نہیں کیا اور ملازم کے ہاتھ کھلوادیا کہ وہ کسی ضروری کام سے جا رہے ہیں..... دادا کے گھر سے جانے کے بعد سہانہ اور امی کی امی چادروں میں خود کو لپیٹ کر ایک فاصلے پر دادا کے پیچھے چل دیں۔ دادا نے ایک ٹھیلے سے کچھ پھل خریدا اور پھر رکشے میں بیٹھ کر چل دیئے۔ سہانہ کی امی حفظ المقدم کے طور پر اپنی گاڑی میں نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے ٹیکسی لی اور اُسے رکشے کے پیچھے جانے کو کہا۔ رکشہ جانے کہاں سے ہوتا ہوا ایک پوش علاقے میں داخل ہوا۔ سہانہ نے حیرت سے امی کو دیکھا لیکن ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے دونوں ماں بیٹی نے کچھ کہنے سے اجتناب کیا۔ رکشہ ایک فلیٹ کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔ دادا نے رکشے والے کو پیسے دیئے اور فلیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کھٹکی کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور دادا اندر داخل ہو گئے اور داخلی گیٹ بند ہو گیا۔ سہانہ نے کوشش کی کہ دروازہ کھولنے والے بندے کو دیکھ لے لیکن اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ ٹیکسی والے کو فارغ کر کے دونوں ماں بیٹی اُسی فلیٹ کے دروازے پر کچھ دیر کھڑی رہیں۔ دونوں ٹھنکٹش میں تھیں کہ جانے اندر کیا صورت حال پیش آئے گی۔ سہانہ تو بہت گھبراہٹی تھی۔ تب امی نے ہمت کی اور اطلاعی کھٹکی کے بٹن پر انگلی رکھ دی ”مما.....“ سہانہ رنڈھی آواز میں بولی ”اگر میں نے اندر کچھ ایسا دیا دیکھا تو مجھے.....“ وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اس کی آواز گلے میں انک کر رہ گئی۔

”کیا کر رہی ہو سہانہ..... میرے بھی ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہی ہو..... اب اندر کچھ بھی ہو..... ہمیں برداشت کرنا ہوگا.....“ امی نے اسے خاموش کرایا لیکن وہ ہنگامی آواز میں بولی۔ ”مما..... دادا تو میرے آئیڈیل ہیں..... بابا سے بڑھ کر چاہا ہے انہیں میں نے..... میں کیسے اُن کی شخصیت کا بُت ٹوٹا دیکھ پاؤں گی“ امی اُسے جواب نہیں دے پائی تھیں کہ اندر سے قدموں کی چاپ آتی سنا کی دی..... تبھی امی نے اُس کی طرف سے دھیان ہٹا کر گیٹ کی جانب اپنا دھیان کر دیا..... پل بھر میں گیٹ کھلا..... کسی سٹے باہر جھانک کر پوچھا ”کون؟“..... کسی نے جواب نہیں دیا تو آنے والی نے دروازہ پورا کھول لیا..... کچھ دیر تو وہ کچھ بھیننے کی کوشش کرتی رہی..... پھر جیسے خوشی سے چیخ مار کر بولی..... ”ارے سہانہ تم.....!“ سہانہ اور امی نے شدید حیرت سے سارا



رہی تھیں۔ پل بھر میں سارا نے ناشتہ تیار کر کے میز پر رکھ دیا آج اُس نے پائے بنائے تھے اور ساتھ اوون میں نان بھی خود ہی بنائے تھے۔ سہانہ حیران ہو رہی تھی۔

”سارا! یہ اتنی مشکل ڈشیں تم بناتی ہو.....!“  
 ”دادا کے لیے بناتی ہوں.....“ سارا سادگی سے بولی۔ ”ہم دونوں جب مل کر ناشتہ کرتے ہیں تو باتوں باتوں میں بہت سا کھانا کھا جاتے ہیں اور آج تو ناشتہ کرنے میں ہمیشہ سے زیادہ مزہ آئے گا۔“ پھر وہ بولی ”اچھا یہ تو بتاؤ تمہیں مجھ سے ملنے کا خیال کیسے آیا۔ اور میرا ایڈریس تمہیں کیسے معلوم ہوا.....؟“

”چھوڑو یہ سب..... وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے ڈھونڈ ہی لیتے ہیں..... تو بس ہم نے تمہارا گھر ڈھونڈ لیا..... اب یہ بتاؤ تمہارے شوہر صاحب یعنی میرے بھائی جان سے کب ملوا رہی ہو؟“ سہانہ نے بات بدلنے ہوئے کہا۔  
 ”ابھی سارا جواب نہیں دے پائی تھی کہ سہانہ کی امی بولیں.....“ سہانہ، اب کیا ہتھیلی پر سرسوں آج ہی حماد کی کیا..... چھری تلے دم تو لو.....“ پھر وہ سارا سے مخاطب ہو کر بولیں ”سارا بیٹی! دو دن بعد سنڈے ہے..... تم اور تمہارے میاں کی ہمارے گھر میں دعوت ہوگی..... تم دونوں سارا دن ہمارے ساتھ گزارو گے..... سہانہ اور دادا سے جی بھر کر گپ شپ لگانا.....“ سارا تو خوشی کے مارے بولنا بھول گئی..... سہانہ بھی حیرت اور خوشی سے ماں کو دیکھ رہی تھی لیکن سب سے زیادہ خوش تو دادا نظر آ رہے تھے جن کے بوڑھے چہرے پر گلاب کھلنے لگے تھے.....!



کو دیکھا..... کچھ دیر تو سمجھنے سمجھانے میں ہی گزر گیا پھر سہانہ نے خوشی سے سارا کو گلے لگا لیا..... ”سارا..... تم.....!“

”اور آئی..... آپ.....!“ سہانہ کے بعد وہ امی سے ملی اور بولی ”مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ سہانہ مجھے ملنے میرے گھر آسکتی ہے اور آئی آپ تو اس کے ساتھ آکر میری خوشی دو بلا کر دی ہے..... آئی، اندر آ جائے.....“ سارا تو خوشی کے مارے پاگل سی ہو رہی تھی..... امی اور سہانہ حیران پریشان سی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں..... ”ارے ہاں، دادا ابھی آئے ہیں سہانہ..... وہ اکثر مجھ سے ملنے آ جاتے ہیں..... میں اُن کے لیے آج آجکل ناشتہ تیار کر رہی تھی..... اب ہم سب مل کر یہ ایجنڈل ناشتہ کریں گے.....“ وہ بولتی ہوئی اندر جا رہی تھی..... سہانہ جانتی تھی..... جب وہ بہت خوش ہوتی ہے تو اسی طرح مسلسل بولتی رہتی ہے..... لاؤنج میں فی وی بلند آواز سے لگا تھا..... سارا نے آواز دے کر کہا..... ”دادا جی.....! آپ کے لیے زبردست سر پرانز ہے..... دیکھیں تو کون آیا ہے.....“ دادا، سہانہ اور امی کو دیکھ کر بری طرح چونک پڑے..... چہرے پر شرمندگی اور ندامت کے بادل سے لہرائے گئے..... سہانہ چھپ کر اُن کے گلے لگی اور لاڈ سے بولی..... ”میرے دادا دنیا کے سب سے اچھے دادا ہیں.....“ دادا نے اُسے بانہوں میں سمیٹ لیا اور بولے..... ”بہو.....! مجھے معاف کر دو..... میں تم سے چھپ کر سارا سے ملنے آتا تھا..... کیونکہ سہانہ کی شادی کے بعد میں بہت تنہائی محسوس کرتا تھا..... میں اس بچی کی کہانی میں خوش رہتا تھا..... بس اس لیے.....“ امی خود بھی شرمندہ ہو رہی تھیں اور سہانہ سے تو نظریں نہیں ملا پا

# انکشاف

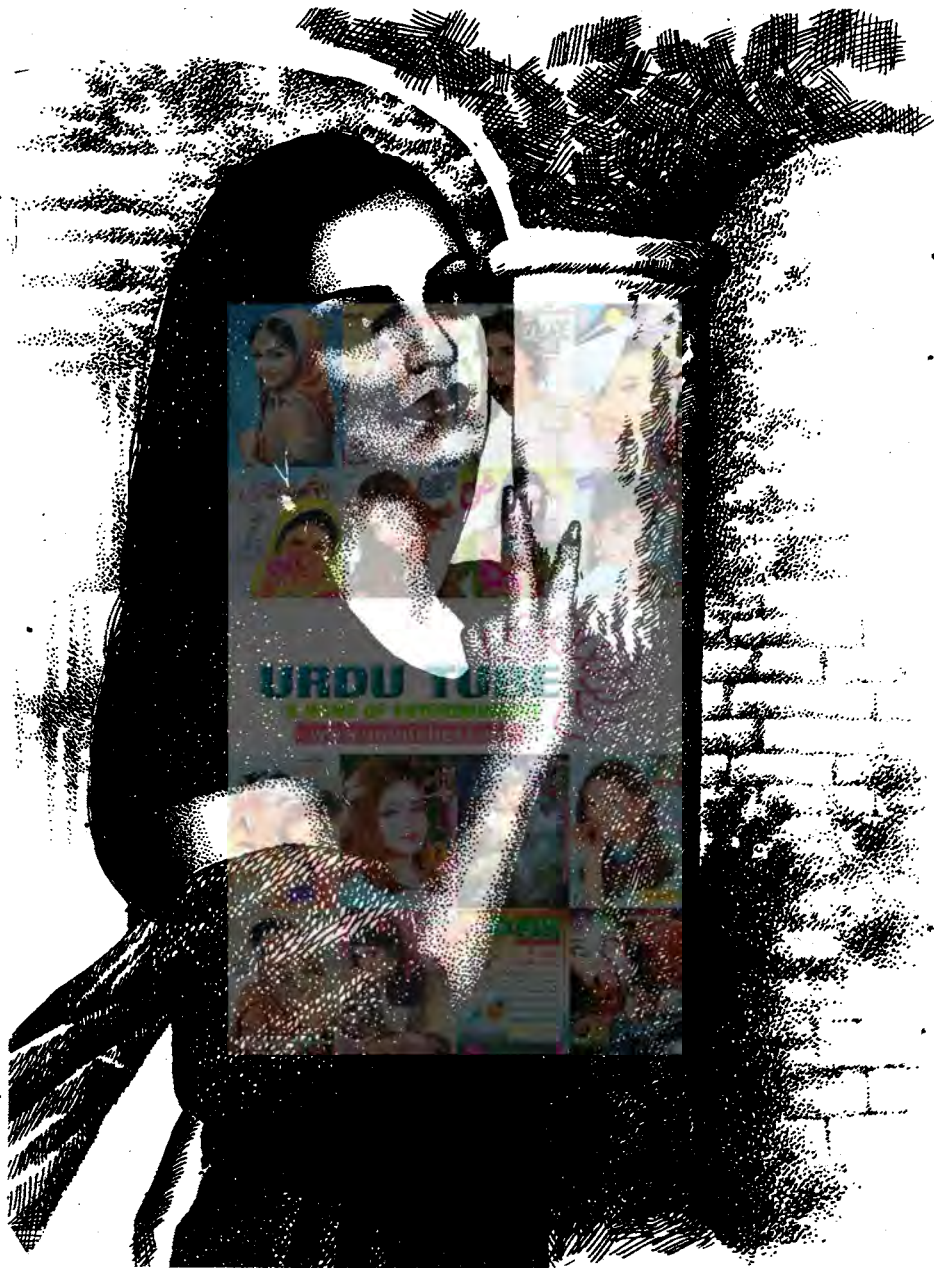
وہ دونوں عاقل و بالغ تھے مگر پھر بھی والدین ان سے

رازداری برت رہے تھے..... اختتام آپ کو بھی گنگنا نے پر مجبور  
کردے گا!

تھوڑے وقف کے بعد پھر پوچھا ...

آپ سے آخر یہ کس نے کہہ دیا کہ میں ایسا  
چاہتا ہوں؟  
میں یاسر صاحب کی بات سمجھ کر بھی سمجھ نہیں  
رہا تھا اور وہ تھے کہ کچھ اس طرح بولتے ہی چلے جا  
رہے تھے جیسے یہ سب میری مرضی اور میرے  
ارادوں کے عین مطابق ہو رہا ہے... بھٹک ہے  
میرے پاس وقت کم رہ گیا تھا میں ہر ممکن کوشش کر  
کے بھی اپنا ہدف پورا نہ کر سکا تھا اور اب تو شاید میں  
نے اپنی ہار کے بارے میں سوچنا بھی شروع کر دیا  
تھا بلکہ کہیں دل میں تسلیم ہی کر لیا تھا کہ میں ہار چکا  
ہوں کہ اچانک یوں اپنے کمرے میں بلا کر یاسر  
صاحب نے جو انکشافات کئے اور جس طرح وہ  
مجھے میری نئی پوسٹ کے بارے میں بتا رہے تھے  
میں تھوڑی سی دیر میں بے چین ہو کر پوچھ بیٹھا تھا...  
یاسر صاحب حیرانگی سے مجھے نکتے نکتے لگے تو میں نے

’اور یہ جو آپ مجھے ترتی دے کر جس جگہ پر بیٹھا  
رہیں ہیں اس پر تو پہلے ہی سے کسی کو رکھا جا چکا ہے۔  
.. کیا آپ نے مسٹر عباسی کے لائے گئے... بلکہ اُن  
کی سفارش پر لائے گئے بندے کو فارغ کر دیا ہے  
جو مجھے اس جگہ پر تعینات کر رہے ہیں؟‘  
میں جانتا تھا کہ یاسر صاحب میری اس قدر  
بے باک گفتگو سے نا صرف حیران رہ گئے ہیں بلکہ  
اُن کے تومنے میں الفاظ کہیں کھوکری رہ گئے تھے اور  
وہ ہلکے ہلکے چگالی کرنے کے انداز میں شاید خالی  
منہ چلا کر اپنے کھوئے ہوئے لفظوں کو ڈھونڈنے کی  
کوشش کر رہے تھے... مجھے اُن کی حالت پر ایک دم  
ہنسی آگئی... ہوتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے... جب ہم  
جیسا کوئی انٹرن... یعنی آفس روٹین کو سمجھنے اور  
باقاعدہ تربیت لینے کے لئے آنے والا فقط مجھے





میں نے پُرانا کوئی انٹرن... اتنی بڑی... دنیا جہاں کا  
 بزنس سیٹھ ہوئے ملٹی نیشنل آرگنائزیشن کے مالک  
 کو کچھ یوں مخاطب کرے تو شاید ایسے ہی نتائج  
 سامنے آئیں گے... انہوں نے ہمیشہ کی طرح  
 عینک کو درست کیا... اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور پھر گویا  
 ہوئے...

’یک مین یہ کیا کہہ رہے ہو...؟ تمہیں مس  
 فرید کی جگہ پر رکھا جا رہا ہے... کیا مس فرید تم کو کچھ  
 بتا کر نہیں گئیں؟‘  
 اور یہ لفظ تو واقعی بہت ہی غیر ذمہ دار اور بے  
 وفا دوست ہوتے ہیں... جہاں مشکل پڑی یہ  
 گدھے کے سر سے سینک کی مانند غائب ہو جاتے  
 ہیں... اور اب میں بھی یاسر صاحب کی طرح خالی  
 منہ چلا رہا تھا اور مجھے نہیں آ رہا تھا کہ بات کو کس طرح  
 کس پیرائے میں کروں کہ گرہ کھل جائے... سب  
 کچھ نظر کے سامنے صاف ستھرے طریقے سے پیش  
 کر دیا جائے... یاسر صاحب بھی مسکرائے...  
 ’اے ابھی مس فرید نے کل ہی استفتاء دے  
 دیا ہے اور شرط یہی رکھی تھی کہ آپ کو ان کی جگہ پر  
 رکھا جائے... میں تو سمجھا تھا کہ اُس نے تم کو پہلے ہی  
 آفس میں بلا کر خوشخبری دے دی ہوگی... مگر خیر اگر  
 وہ بھول گئی ہے تو اب میں تم کو بتا رہا ہوں... مبارک  
 ہو یک مین اب آپ ہماری کراچی براچنگ کے  
 پراجیکٹ منیجر کے عہدے پر آ چکے ہیں... ویسے  
 مجھے معلوم تھا کہ تم میں کچھ خاص ہے... ان چھ  
 مہینوں میں تمہاری کارکردگی سے تمام ہی ڈائریکٹرز  
 کی نظریں تم پر تھیں اور مس فرید خود بھی تمہاری کافی  
 تعریف کرتی رہیں ہیں... یوں ہے کہ اگر مس فرید  
 اپنی جگہ خالی نہ بھی کرتیں تو شاید ہماری آرگنائزیشن  
 تم کو کہیں نہ کہیں فکس کر ہی لیتی...‘

یاسر صاحب پھر سے اپنی رواں گفتگو پر آ گئے  
 تھے... مگر اب میں کچھ بھی سن نہیں پا رہا تھا...  
 میرے ذہن میں بار بار ایک ہی جملہ گونج رہا تھا...  
 ’مس فرید نے استعفیٰ دے دیا ہے اس شرط پر  
 کہ آپ کو ان کی جگہ پر رکھا جائے... مس فرید خود بھی  
 تمہاری کافی تعریف کرتی رہیں ہیں...‘  
 مس فرید... حنا فرید نے استعفیٰ دے دیا... حنا  
 ... جس نے اس مقام تک آنے کے لئے کس قدر  
 محنت اور کتنی تکالیف اٹھائی تھیں... آفس کی سیاست  
 کو سہا اور مردوں کے اس معاشرے میں اس  
 پوسٹ تک آتے آتے کتنے ہی ہم عصر مردوں کی  
 دشمنی کو نمٹایا ہے... میں سب کچھ جانتا تھا اس لئے  
 مجھے یہ یقین کرنا دو بھر ہو رہا تھا کہ حنا اپنی نوکری  
 چھوڑ گئی ہے... حنا نے ہی تو مجھے ایک بار بتایا تھا کہ  
 اس جگہ تک پہنچنے کے لئے اُس کی جدوجہد یہ سب تو  
 اُس کے لئے ایک میڈل ہے جو وہ بہت فخر سے  
 سجاتی ہے... کتنا مان تھا اُسے خود پر... اپنی محنت سے  
 حاصل کی گئی اس پوسٹ پر... میں مان ہی نہیں سکتا.  
 وہ جس قدر جانفشانی، محنت اور پیشہ ورانہ انداز میں  
 اس جگہ پر کام کر رہی تھی اُس کے ہی برابر کی جگہ پر  
 براہمان یاسر صاحب کا بھانجا حنیف عباسی ایک  
 فیصد بھی نہ کر رہا تھا... تب ہی تو پورے ملک سے  
 صرف حنا کو ہی منت نئے پراجیکٹ دیئے جاتے تھے  
 جب دو ایک سال گزر جاتے اور پراجیکٹ کا اپنا  
 ایک مقام ایک مکمل لائحہ عمل بن جاتا تو پھر ہی اُس  
 پراجیکٹ کو منتقل کر کے آفس میں کسی اور کے سپرد کیا  
 جاتا تھا... اتنے میں حنا کے لئے کوئی نیا کام آن  
 کھڑا ہوتا... اُس کی ناصر فوج جو بھانجا چھی تھی  
 بلکہ ہر ممکن طریقے سے وہ پراجیکٹ کو بہت ہی کم  
 اور مناسب خرچوں پر لے کر چلتی یوں نئے



پراجیکٹ آرگنائزیشن پر بوجھ نہیں ڈال پاتے تھے۔  
 دوسری طرف حنیف عباسی جس کام میں بھی ہاتھ  
 ڈالتا کچھ اس طرح خزانے کا منہ کھول دیتا جیسے اپنی  
 شادی ہی کر رہا ہو... ان چھ مہینوں میں... میں نے  
 حنا اور حنیف کے کام کو نا صرف پرکھا تھا بلکہ اچھی  
 طرح سے موازنہ کرنے کا موقعہ بھی اسی لئے مل گیا  
 تھا کہ میں دونوں کو ہی ملے ہوئے مختلف پراجیکٹ  
 میں شامل تھا... ایک پاؤں حنا کے سادہ سے دفتر میں  
 اور دوسرا حنیف کے جدید اور مہنگے فرنیچر سے بھرے  
 آفس میں... پورا عملہ اسی طرح ان دونوں کا مذاق  
 اڑاتا کرتا تھا... مس فرید کا دفتر... مسٹر عباسی کا آفس...  
 مجھے خود پر حیرت ہونے لگی... آج میں حنا کے  
 بارے میں کس طرح معمولی سے معمولی بات بھی  
 یاد کر سکتا ہوں... جیسے وہ اپنا... بھولا برا گیت ہو...  
 جو ذہن کے کسی کونے میں صدیوں چھپا بیٹھا رہتا  
 ہے اور اچانک اُس کی دھن کی آڑنی پڑتی دور سے  
 آتی ہلکی سی آواز بھی جیسے پورا گیت بھر ساز و آواز۔

یوں وہ انداز سب یاد دل جاتی ہے... اُس کے ساتھ  
 ہی جڑی بہت سی یادوں کے دروازے کھلتے ہیں...  
 میں بھی سوچتا تو کچھ چاہتا تھا مگر سوچ صرف حنا  
 تک ہی محدود ہو گئی تھی میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا  
 کہ میں اُسے اس طرح کبھی سوچوں گا... مجھے خود پر  
 بھی حیرت ہوئی... یہ میں مس فرید کو کس طرح فقط  
 حنا کے نام سے یاد کر رہا ہوں... جیسے وہ کوئی بہت  
 ہی خاص الخاص شخص... دل سے قریب اور سانسوں  
 سے خارج ہوتی بھاپ کی مانند مگر نظروں سے  
 اوجھل اور پھر مس فرید نے جیسے ڈرامائی انداز میں  
 ہمارے درمیان جدائی ڈال کر خود کو مس فرید سے  
 بدل کر حنا کر دیا تھا... وہ جو پتھر پر پس کر ہی رنگ  
 لاتی ہے... اور یہ رنگ تو گہرا ہی ہوتا چلا جا رہا ہے...

میں نے پہلو بدلا... مجھے اندازہ ہی کب تھا کہ غیر  
 محسوس طریقے سے وہ میری یاداشت میں مکمل طور  
 پر محفوظ ہو چکی ہے... ایک کک سی کہیں دل میں  
 جاگی... ایک آدھ سانس بہک گئی اور میں خود کو  
 ملامت کرنے لگا... ابھی چند دن پہلے ہی تو امی جان  
 نے جب مجھ سے حنا کے بارے میں استفسار کیا تھا  
 تو میں کیسا بلبلا گیا تھا...

’اوہو امی جان... آپ کو تو ہر لڑکی میں بس اپنی  
 بہو نظر آنے لگی ہے... بھیجی وہ میری باس ہے باس...  
 میں اُس کی نگرانی میں اُس کے چھوٹے موٹے کام  
 کرتا ہوں اُس سے کام لیکر رہا ہوں اور آپ کہہ  
 رہی ہیں کہ میں اُس سے شادی کر لوں... امی پلیز...  
 آپ اُس سے کہیں یہ سب نہ کہہ دیجئے گا... مجھے  
 ابھی اپنی انٹرن شپ پوری کرنی ہے... اُس کو آپ  
 کے ارادے اور میری حقیقت پہ چل گئی تو مجھے  
 اپنے دفتر میں ہی پھانسی دے دے گی آپ نہیں  
 جانتی نفی تحت مزاج ہے وہ...‘

میں ابھی کچھ اور کہتا کہ امی جان بیٹے لگیں...  
 ’ارے بچے... کیا ہو گیا ہے تجھے... کیوں تو  
 کوئی معمولی آدمی ہے کیا جو اس طرح ڈرا جا رہا ہے  
 ...؟ پھر میں نے تو حنا کی ماں سے بھی بات چیت کی  
 اور یہی جان پائی کہ وہ بھی اپنی بیٹی کی شادی کے  
 لئے فکر مند ہیں بلکہ وہ تو کہہ رہی تھیں کہ انہوں  
 نے اُسے نوکری کی اجازت دے کر اُس کو راہ سے  
 بھٹکا دیا ہے... مانا کہ حنا بیٹے سے بڑھ کر ہے اور  
 بہت چھوٹی سی عمر میں ہی اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے  
 بھائی بہنوں کے لئے نوکری کرنے لگی تھی... مگر اب  
 جب کہ حالات قابو میں آ چکے ہیں اور حنا کے دو  
 بھائی بھی اچھا خاصہ کمانے لگے ہیں تو وہ خود پر  
 دھیان دینے کے بجائے بس کام کام کام میں مگن



کسی چھوٹے کی طرح بھاگ دوڑ میں مصروف تھا اوپر سے حنا کی طرف سے دی گئی محفل... ویسے ہی جان کا روگ... وہ اپنے سادے مگر بڑا وقار وجود کے ساتھ سارے ہی انٹرنز کو ہدایات جاری کر رہی تھی۔... میں نے کئی بار محسوس کیا کہ جب بھی حنا میرے ساتھ آ کر کھڑی ہوتی یا میں اُس سے کچھ پوچھنے اُس کے پاس جاتا تو جیسے رابعہ اور امی جان کی نظریں ہم پر ہی ٹپک جاتیں... امی جان کی آنکھوں میں جیسے نئے نئے رنگ اُترنے لگتے اور رابعہ بیباکانہ انداز میں آنکھیں منکارتی لگتی... اور پھر میں نے دیکھا بلکہ سانس روکے اور دم سادھے دیکھا کہ رابعہ اور اباجی، حنا کے ساتھ محو گفتگو ہو گئے جبکہ امی جان اُس کی والدہ کے ساتھ جا بیٹھیں... اُسی وقت میرے موبائل پر رابعہ کا چمکتا منیج آ گیا۔... اب آگے اس میں تھا رابعی نام آئے گا... جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دوں فسانے کو؟

یہ بھی غنیمت ہوا کہ ان لوگوں نے حنا یا اُس کی امی سے میری حقیقت بیان نہ کی مگر پھر امی جان کی اس طرح کی باتوں سے میں بھر گیا۔... 'اوہو... پھر وہی بات... بھئی مجھے اُس سے شادی نہیں کرنی... مجھے ابھی صرف اور صرف پاپا کو جیت کر دکھانا ہے بس... چاہے کچھ بھی ہو... میں وہاں گیا کس کام سے ہوں اور آپ پتہ نہیں کیا لے کر بیٹھ گئیں... اور ویسے بھی میں تو ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا... اور وہ بھی اُس تک چڑی سے... ہرگز نہیں...

میں امی جان کی بات سننے کیلئے رُکا نہیں اور اُسی رات واپس اپنے ہوشل چلا آیا... ہاں اُس وقت جب امی جان نے مجھ سے یہ بات کی تھی تو میں صرف اور صرف پاپا کو جیت کر دکھانا ہی اپنا

رہتی ہے... وہ بچاری تو جیسے تیار بیٹھی ہیں کہ کوئی اچھا رشتہ ملے اور وہ جھٹ حنا کو اُس کے گھر کا کرد میں مگر مسئلہ تو اب یوں ہے کہ حنا نے خود کو اس قدر پیشہ ور... مستحکم اور معاشی طور پر مکمل کر لیا ہے کہ آنے والے زیادہ تر رشتے تو بس اُس کی دولت کی وجہ سے آتے ہیں اور جو ایسے نہیں ہوتے وہ اس قدر مرغوب ہو کر جاتے ہیں کہ جواب تک نہیں دیتے... وہ تو بچاری کتنی ہیں کہ مرد تو عورت کو ہمیشہ خود سے تھوڑا اٹھوڑا کمزور دیکھنا چاہتا ہے... مضبوط عورت سے تو جیسے مرد چڑ جاتے ہیں... احساس کمتری میں جو مبتلا ہو جاتے ہیں... مگر یہاں کیا مسئلہ ہے... تم تو خود بھی کھلے ذہن کے ہو اور تمہارے ابا بھی تب ہی تو رابعہ کو اسکول چلانے کی اجازت دے رکھی ہے...؟ مجھے تو شکل و صورت کی بھی بہت بھلی لگی اور خاندان بھی اچھا ہے ہاں ہماری طرح شان و شوکت نہیں مگر کم از کم شریف اور رکھ رکھاؤ والے لوگ تو ہیں... ہمیں اور کیا چاہیے؟

اب یہ بھی ایک مصیبت ہی تھی کہ جہاں میں انٹرن شپ کر رہا تھا اُس فرم سے اباجی کی فرم کے بہت دوستانہ بلکہ کاروبارانہ تعلقات تھے لہذا اکثر ہی ہماری فرم سے دی جانے والی تقریب میں اباجی شریک ہوتے اور اس بار اتفاق سے عید کے موقع پر منعقد تقریب میں میں صرف اباجی بلکہ اُن کے ساتھ امی جان اور رابعہ بھی آ گئے... یہ تو میں خوب جانتا تھا کہ رابعہ نے امی جان کو اکسایا ہو گا کہ ذرا چل کر دیکھتے ہیں کہ ہمارا لاڈلاس طرح اور کیسا کام کر رہا ہے ورنہ امی جان تو کبھی بھی اباجی کے ساتھ اس طرح کی کاروباری محفلوں میں نہیں جاتی تھیں... سونے پہ سہاگایہ کہ حنا کی والدہ اور بھائی بھی شریک تھے... میں ایک انٹرن کی ہی طرح بلکہ

نصب العین سمجھتا تھا... اور اُس وقت میں حنا کو جانتا ہی کتنا تھا... مجھے احساس ہی کب تھا کہ آنے والے دنوں میں آفس کے باقی کام کرنے والوں کی طرح میں بھی مس فرید کی تمام تر ختیوں اور کسی حد تک بے جا اصول پروری کے باوجود اُس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سن پاؤں گا... بلکہ اگر حنیف عباسی مجھے کبھی اُس کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرے گا بھی تو میں کسی بی جملہ کی طرح ایک ایک لفظ جا کر مس فرید کے گوش گزار کروں گا... وہ کہتے ہیں ناں کہ جب ہم زندگی گزارنے کے نت نئے منصوبے بنارہے ہوتے ہیں دراصل زندگی اُن ہی لمحوں میں بڑی سبک رفتاری سے ہمارے بہت ہی قریب سے گزر جاتی ہے... ہمارا وہ بیان کسی اور طرف ہوتا ہے اور وقت ہمیں آہستہ آہستہ دھکیلتا کسی کی جانب بڑھا دیتا ہے... کبھی ہم اُسے دیکھ پاتے ہیں کبھی نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں... اور پھر اُسی راہ میں دس بارہ قدم اٹھاتے ہی ہمارا دل ہمیں جھنجھوڑ دیتا ہے...

’یہ کیا پاگلوں کی طرح بھاگے جا رہے ہو... کس جانب منہ کر کے اندھوں کی طرح چلتے ہی چلے جا رہے ہو... منزل کو تو پیچھے ہی چھوڑ آئے ہو... اب کس لئے اور کس کی طرف محو سفر ہو؟‘

ارے ہاں... میں تو بس بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا... اور اب جب کہ میں بقول اپنی منزل کے پاس تھا تو پلٹ پلٹ کر راستے میں چھوٹے ہوئے کسی کے ساتھ کو تلاش کر رہا تھا... تو پایا کو جیت کر دکھانا دراصل میری منزل نہیں تھی... وہ تو بس ایک قدم تھا میری اصل کی جانب... حقیقت کی کھوج کی پہلی سوچ تھی... اصل میں تو میری منزل وہ تھی جو استغنی دے کر مجھے اپنی جگہ سونپ گئی...

میں نے جیسے ہی ایم بی اے کیا تھا اباجی نے مجھے اپنے کاروبار میں باقاعدہ شامل کرنے کا عندیہ دے دیا تھا... مگر انہوں نے پڑھائی ختم کر لینے کے بعد بھی مجھے کئی سال ملکوں ملکوں گھومنے پھرنے سے کبھی نہیں ٹوکا تھا وہ کہتے تھے کہ ایک بار کاروبار میں لگ جاؤ گے تو پھر سرگھمانے کی فرصت بھی نہ ملے گی لہذا ابھی گھوم لو جتنا گھومنا چاہتے ہو اور یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی، ہم دو بھائی بہن اباجی کی جان تھے... بڑی بہن رابعہ کو ہمیشہ سے اسکول کھولنے کا شوق تھا لہذا اُس نے تعلیم مکمل کرنے اور پھر اسکول چلانے کی اضافی تعلیمات حاصل کر کے ایک متوسط علاقے میں اسکول کھول لیا تھا... رابعہ کے اسکول میں آدھے سے زیادہ بچے بغیر فیس کے زیر تعلیم تھے جن کے یونیفارم اور ٹیوشن کا خرچہ بھی اسکول ہی برداشت کرتا تھا... اس پر بھی رابعہ کا اسکول عمل طور پر اپنے ہی بل بوتے پر چلتا چلا جاتا تھا... اباجی رابعہ کی تعریف کرتے نہ ٹھکتے اور میں جتنے دن باہر رہا ہر فون کال پر مجھے یہی کہتے کہ جتنا گھومنا ہے گھوم لوں مگر جب کام پر لگوں تو پھر رابعہ کی طرح تندہی اور وقف ہو کر کام کروں... اسی لئے جب میں وطن لوٹا تو اباجی نے مجھے سختی سے ہدایات جاری کر دیں کہ پہلے میں آفس میں کام کرنے کے آداب سیکھوں پھر ہی مجھے آفس میں داخلے کی اجازت دیں گے... ہماری ہلکی پھلکی بحث ہو گئی...

’اباجی... آپ کیا سمجھتے ہیں میں اگر آپ کے آفس میں کام نہیں کروں گا تو مجھے کہیں بھی کوئی اچھی نوکری نہیں مل سکے گی؟ آخر میری تعلیم کچھ کم تو نہیں...؟‘

میں نے تنک آ کر اباجی سے بحث کرنے کی ٹھانی...



’سوچ لو... چھ مہینے ہیں تمہارے پاس؟‘  
 رابعہ نے ہمیشہ کی طرح آنکھیں میٹکا میں اور  
 میں نے زور و شور سے اباجی اور اُس کا چیلنج قبول کر  
 لیا...

’ارے ارے... یہ کیا اور کیسی باتیں کر رہے ہو  
 تم سب... کوئی کہیں نہیں جائے گا... بس میرا بچہ  
 اتنے دنوں بعد تو آیا ہے میں اسے اب کہیں نہیں  
 جانے دوں گی!‘

ای جان نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی مگر  
 اب تو دھن سوار ہو چکی تھی... اباجی سگار پیتے پیتے  
 مجھے معنی خیز نظروں سے تول رہے تھے جبکہ رابعہ  
 پڑھنے کے لئے رسالے الٹ پلٹ رہی تھی مگر اُس  
 کہ چہرے پر ہلکی ہلکی طنز یا مسکراہٹ ابھی بھی  
 موجود تھی... اور پھر میں نے ای جان کو آخر کار منایا  
 لیا اس شرط پر کہ میں ہفتہ اتوار اور چھٹی کا دن گھر پر  
 گزاروں گا... میں نے چند ہی دنوں میں یونیورسٹی  
 کے ایک یوتھ ہوسٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا اور  
 مختلف جگہوں پر ملازمت کے لئے درخواست بھیجنا

شروع کر دیں... مگر وہی ہوا جو اباجی پہلے ہی بتا چکے  
 تھے ہر ملازمت کے لئے تجربہ درکار تھا جو کہ میرے  
 پاس نہیں تھا لہذا اتھک ہار کر میں نے ایک ملٹی نیشنل آ  
 رگنائزیشن میں انٹرنشپ حاصل کر لینے کو ہی غنیمت  
 جانا اور میری شرط کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا...

میں ایک نہیں بلکہ دو پراجیکٹ منیجر کا یعنی حنا  
 جس کو سب مس فرید پکارتے اور یا سر صاحب کے  
 بھانجے حنیف عباسی کا واحد سیکرٹری تھا... چند ہی  
 ہفتوں میں مجھے حنا کا سخت اور بارعب رویہ کھلنے لگا  
 .. وہ کبھی بھی کہیں بھی چوکتی نہ تھی... ہر کام میں کچھ  
 ایسی نفاست اور دیدہ زیبی چاہتی کہ میں جھٹھلا جاتا  
 ... جبکہ دوسری جانب حنیف عباسی اس قدر ڈھیلا تھا

’برخوردار کسی خوش فہمی میں نہ رہنا... پاکستان  
 میں جتنی بھی ملٹی نیشنل آرگنائزیشنز ہیں اُن میں  
 نوکری حاصل کرنے کے لئے اب ایک سے ایک  
 پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگ مد مقابل ہیں... تم جیسے  
 نئے نیویلے ایم بی اے کو نوکری نہیں دی جانی بلکہ  
 چھ مہینوں کے لئے انٹرن رکھا جاتا ہے... اور ان چھ  
 مہینوں میں کچھ نہ کر سکتے تو باہر کا راستہ دکھا دیا جاتا  
 ہے سمجھئے؟‘

اباجی نے رابعہ اور امی جان کے سامنے کچھ  
 یوں مجھے طنز یا لٹاڑا کہ میں اپنے ہی زعم میں کہہ بیٹھا  
 ...

’ٹھیک ہے اباجی... آپ دیکھیئے گا میں آپ کی  
 آرگنائزیشن جیسی ملٹی نیشنل آرگنائزیشن میں  
 نام صرف انٹرن بن کر خاموشی سے کام کروں گا بلکہ  
 انٹرنشپ ختم ہو جانے پر اُسی آرگنائزیشن میں ایک  
 اچھی سی پوسٹ بھی حاصل کر کے دکھا دوں گا...‘  
 اباجی اور رابعہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور مجھے اور  
 تاؤ آ گیا...

’بیٹا جی... تم ایک دن بھی پورا کرو ناں تو مان  
 جاؤں کہ جو یہاں انٹرن کے ساتھ سلوک کیا جاتا  
 ہے تم جیسا نازک تو دوسرے دن ہی بھاگ کر  
 واپس آ جائے... یا پھر اباجی کا نام استعمال کر کے اپنا  
 الو سیدھا کر لو تو الگ بات ہے...‘ رابعہ مجھے  
 چڑاتے ہوئے چپکی...

’میں ایسا کچھ نہیں کروں گا میں انٹرنشپ کے  
 لئے درخواست ہی ہوسٹل سے بھیجوں گا کسی کو بھی  
 معلوم نہیں چلے گا کہ میں کس کا بیٹا ہوں... اگر میں  
 نے کوئی دھوکہ دینی کی تو سمجھو میری ہاڑ...‘  
 میں نے بڑے گھمبیر لہجے میں اپنے فیصلے کو حتمی  
 شکل دے دی...



پوچھا جاتا... وہ ایک بار بلا کر بھول جاتا کہ اُس نے مجھے کس لئے بلایا ہے لہذا میں بھی اُس کے بلاوے پر خود ہی سوچ سمجھ کر جاتا کہ اس وقت کیا کام ہو سکتا ہے... اُس کو پراجیکٹ کے سلسلے میں کوئی ڈنر یا پانی ٹی رکھنا ہوتا تو آڑے تیزھے سے کسی بھی ریسٹورنٹ کو آڑوے دیتا اور جیسا تیسرا کر کے بس کام نہٹا دیا کرتا... مجھے جہاں مس فرید ناگوں بنے چہواری تھی عباسی میرا دلارا آفیسر بن گیا تھا... مگر تھوڑے ہی دنوں میں اصل اور نقل کی پہچان ہونے لگی... مس فرید یوں تو سخت مزاج تھی مگر آفس میں کام کرنے والوں سے انسانیت کے درجے پر ہی رہ کر کام لیتی تھی... کسی سے زبان کی تیزی یا غصے سے چیخ چلا کر بات نہ کرتی تھی... اور مشکل میں آئے ہوئے کو لیکچر کی بڑھ چڑھ کر مدد بھی کر دیا کرتی تھی... جبکہ عباسی حد درجہ کا بدتمیز تھا اور اکثر اُس کا رویہ ہنک آمیز ہی رہتا تھا... خاص طور سے اُسے اُن لوگوں سے چڑھ جاتی جو مس فرید کے حق میں کبھی بکھار بول پڑتے... یہی وجہ تھی کہ مس فرید سے لوگ خوش تو تھے مگر میرے منہ سے اُس کی بُرائی سننے پر خاموش ہو جاتے تھے... ایک طرف وہ مجھے عباسی کے ٹولے کا سمجھتے اور دوسری طرف وہ جانتے تھے کہ اگر میں عباسی جیسا نہ ہوا تو کچھ دنوں بعد میرا رویہ بھی بدل جائے گا... پہلی بار میں نے عباسی کی شرارت کو محسوس کیا تو خود پر انعاما بوجھ محسوس کیا کہ مجھے مس فرید کو مسٹر عباسی کی چال کے بارے میں بتا دینا چاہیے... گو وہ بہت سخت مزاج پاس تھی مگر بہر حال وہ سختی اور فرم کی وفادار ملازم تھی وہ مسٹر عباسی کی طرح پاسر صاحب کے نام کو استعمال کر کے اپنا الوسید خاں نہیں کرتی تھی... مس فرید دفتر کے آتے ہی میں اُس کو خبردار کرنے جا پہنچا... میں نے

کے اُس کو یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ اُس نے اگر دیں بھی تھیں تو کیا ہدایات دی تھیں... میں نے ایک دو بار آفس میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں سے مدد چاہی سب نے ہی حنا کے معاملے میں کان پکڑ لئے... سب کا خیال تھا کہ مس فرید کو خوش کرنا ناممکن ہے لہذا جس قدر بھی ہو سکے اُس کے کام کو اچھے سے کرتے چلے جاؤ... اور کچھ ہی دنوں میں مجھے مس فرید سے چڑی ہو گئی تھی... میرا خیال تھا کہ وہ خواہ مخواہ خود کو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے... بلاوجہ کا رعب... فصول سادہ دبا... اور پیکار کی سختی... اگر وہ ایسا نہ بھی کرے تو کام تو ہونی چاہتا ہے... مگر نہیں زرا ایک لفظ کی ججے میں غلطی ہو جائے تو پورا فائل پڑے بغیر ہی واپس مجھوا دیتی... کوئی مہمان آئے اور اُس کو چائے پانی پوچھنے میں زرا دیر ہو جائے تو مہمان کر جاتے کے ساتھ ہی انضباطی (Disciplinary) نوٹس جاری کر دیتی... یہاں تک کہ کبھی اچانک میرے دفتر آنے پر مجھے اپنی سیٹ پر تیز حائیز حاشیادیکھ کر مایمز پر فائلوں اور کاغذات کی بے ترتیبی دیکھ کر بکڑ جاتی... میں اُسے جس قدر خوش کرنے اور اُس کے حسبِ منشا کام کرنے کی کوشش کرتا وہ اُسی قدر مجھ سے اور کی توقع کرتی جاتی... مس فرید کے کام بھی بہت ذمہ داری سے سرانجام دیتے پڑتے تھے وہ اپنے ہر کلائنٹ کے لئے خوب سے خوب تر کام کرتی اور مجھ سے بھی چاہتی کہ اُس کے نقش قدم پر چلوں... شروع کے چند ہفتوں میں مجھے حنیف بہت بھا گیا... اُس کے اندر بے انتہا کی لاپرواہی تھی... فائلز بھی وہ بغیر دیکھے سائن کر دیتا... کوئی خط لکھوا تو دوبارہ دیکھنے کی زحمت ہی نہ کرتا مجھے کہہ دیتا بس تم بھیج دینا... اُس کے پاس جو بھی آتا چائے تو کیا پانی بھی نہ



فرض ہی ہے... مجھے ایک اور جھٹکا لگا... مس فرید کی غلطی...؟ میں بار بار دل کو مناتا رہا کہ اصل صورتحال یا سر صاحب کو بتا دوں کہ یہ غلطی مس فرید سے ہرگز نہیں ہوئی بلکہ یہ تو مسٹر عباسی نے جان بوجھ کر مس فرید کو فرم میں بدنام کرنے کے لئے قدم اٹھایا ہے... مگر ہمیشہ کی طرح یا سر صاحب دو چار منٹ بلا روکے اپنی بولتے رہے... میری تعریف کی مس فرید کی طرف داری کی اور مجھے اسی طرح کھلے ذہن کے ساتھ کام کرتے رہنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے... اُن کے جاتے ہی مس فرید آفس میں داخل ہوئیں اور مجھے ہمیشہ کی طرح دروازے سے ہی کچھ ضروری فائلز اُن کے دفتر میں پہنچانے کا کہہ کر اپنے دفتر کی طرف بڑھ گئیں... میں دل میں بہت شرمسار ہوا... ہوا تو وہی جو مسٹر عباسی چاہتے تھے... مس فرید جن کا کوئی قصور نہیں تھا پھر بھی اُن پر غیر ذمہ داری کی بات آئی گئی... میں فائلز لے کر اُن کے دفتر میں داخل ہوا... آج پہلی بار انہوں نے مجھ سے کام کی بات کرنے کہ بجائے چائے کا پوچھا اور نرم لہجے میں بیٹھ جانے کو کہا...

میں اُسی طرح منہ لٹکائے بیٹھا ہوا تھا وہ انٹرکام پر چائے کا کہہ کر مجھ پر متوجہ ہوئیں...

’یا سر صاحب آئے تھے؟‘  
مس فرید نے کچھ فائلز کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا... میری حد ہو گئی...

’جی ہاں مگر وہ تو آپ کو ہی... مطلب یہ کہ...‘  
خیر اُن کو سب کچھ بتا کر ہی رہوں گا... میں انک ایک کراڈھی ادھوری بات کر کے خاموش ہو گیا...  
مس فرید نے کھولی ہوئی فائل جلدی سے بند کی...  
تاسف سے سر ہلایا... اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا...

اُس دن بڑی بے چینی سے مس فرید کے دفتر میں قدم رکھا اور فوراً ہی بلا کی تمہید کے بتانے لگا کہ مسٹر عباسی نے حال ہی میں کسی کلائنٹ سے ملنے والے آڈر میں رد و بدل کر کے پراڈکشن ہاؤس بھجوا دیا ہے اور اب جب آڈر بن کر آئے گا اور کلائنٹ کو اپنا آرڈر پورا نہیں ملے گا تو اس کا ذمہ دار وہ مس فرید کو ہی ٹھہرائے گا کیونکہ وہ کلائنٹ مس فرید کے پراجیکٹ سے ہی منسلک ہے... اصل میں تمام آفس ایک ہی فیکس مشین استعمال کرتا تھا لہذا اکثر فیکس ادھر ادھر ہو جاتے مگر کیونکہ مسٹر عباسی اور مس فرید کا میں واحد سیکرٹری تھا تو کچھ سن کر دونوں کے فیکس الگ الگ کر کے اُن کو پہنچا دیا کرتا... یہاں شاید عباسی کے ٹولے میں سے کسی نے آڈر کا فیکس لے جا کر مجھے یا مس فرید کی جگہ براہ راست مسٹر عباسی کو پکڑا دیا تھا... اُس نے سکون سے آڈر میں تیزھی میزھی تبدیلیاں کیں اور مال تیار کروانے کے لئے پراڈکشن ہاؤس بھیج دیا... میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے میری بات سن کر کوئی خاص ردِ عمل نہ دکھایا اور ایسے ہی ظاہر کیا جیسے یہ کوئی بڑی بات نہ ہو میں اپنا سامنہ لے کر واپس آ گیا... خیر دو چار دن روٹین میں گزرنے کے بعد ایک دن صبح ہی صبح میرے آفس میں یا سر صاحب اچانک چلے آئے اور کھڑے کھڑے ہی سلام دعا لینے کے بعد میرے کندھے پر چھکی دی اور تعریف کرنے لگے کہ میں نے بروقت مس فرید کی غلطی کو پکڑ کر فرم کی ساکھ کو بچا لیا... پھر انہوں نے بڑے خلوص سے مس فرید کی طرف داری میں بھی بات کر دی کہ وہ اس قدر مصروف رہتی ہے اور اس طرح رات دن اس فرم کے لئے محنت کرتی ہے کہ اُس کی اتنی غلطیوں کو معاف کرنا تو شاید فرم کا اور ہم سب کا



...اب کام کی بات کریں؟

مس فرید اپنے پیشہ دارانہ انداز میں مجھے ہدایات دیتی رہیں مگر اُس کے بعد میں اچھی طرح سے اصل اور نقل کو پہچان چکا تھا اور اندر ہی اندر میرے دل میں حنا کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا... اب مجھے اُس کی نغیتوں سے خوف نہیں آتا تھا۔ اُس کی نفاست اور دیدہ زیبی کے خطہ کو میں بڑی جوانمردی سے نمٹانے لگا تھا... شاید میرے ہی رویے کی تبدیلی یا پھر میرے کام میں مس فرید ہی کی طرح کی نفاست مسٹر عباسی کو بھی چونکا گئی تھی... اور مجھے ایک اور خطرہ محسوس ہونے لگا تھا... ابھی پچھلے دنوں فرم میں ایک اچھی پوسٹ خالی ہوئی تھی جس کے لئے فرم میں موجود تمام ہی انٹرنز نے درخواست بھیجی ہوئی تھیں اور... میرے چھ مہینے بھی تقریباً اختتام پذیر تھے... مگر مجھے یقین تھا کہ مس فرید کے ساتھ ساتھ مسٹر عباسی بھی اُس پوسٹ کے لئے میرا نام ہی آگے بھیجے گئے... اب شاید ایسا ممکن نہیں رہا تھا اور وہی ہوا... تمام انٹرنز جو کے پہلے سے کراچی برانچ میں کام کر رہے تھے اُن سے ہٹ کر لاہور کی برانچ سے ایک انٹرن کو بلا لیا گیا تھا... میں ایک بار پھر محل گیا... یہ بھی پتہ چلا کہ نیا آنے والا مسٹر عباسی کی سفارش پر لایا گیا ہے... ویسے بھی میرے چھ مہینے ختم ہونے والے تھے میں نے بھی آریا پارکی مانند قدم اٹھایا اور جھٹ مسٹر عباسی کے پاس جا پہنچا... میں جانتا تھا کہ ہوگا تو کچھ بھی نہیں بلکہ اُلٹی میری ہی بدنامی ہوگی لہذا میرے اوپر مسٹر عباسی سے بدتمیزی کا شور مچ گیا مگر میں اپنی بات پر بضد رہا کہ اگر انٹرنزیشن میں سفارش پر اچھی پوسٹ پر بھرتی ہو جاتی ہیں اور انٹرن کے لئے ہم جیسے رکھ لئے جاتے ہیں... گو کہ تمام انٹرنز میری بات سے

’یہ کام ہے... اس میں اتنے جذباتی نہیں ہوتے... یاسر صاحب وہی جانتے ہیں جو میں نے اُن کو بتایا ہے... اور تم کیا سمجھتے ہو مسٹر عباسی کے بارے میں جان کر وہ خوش ہوتے؟ اصل میں تو وہ خود بھی اُس سے ٹاللا ہیں مگر رشتہ داری کی وجہ سے برداشت کرتے ہیں... ایسے میں اُن سے مسٹر عباسی کی بُرائی کر کے کیا حاصل ہو جاتا... اُلٹا بات آگے نکل جاتی تو حنیف تمہارے ہی پیچھے پڑ جاتا... یہ بھی غنیمت ہوا کہ تم نے یہ بات صرف مجھ سے ہی کی تھی...‘

مس فرید شہرے ہوئے پُر سکون لہجے میں جیسے کسی بچے کو سمجھا رہی تھیں... میں پھر چلا...  
’مگر جب آپ کا کوئی تصور ہی نہیں تو آپ اپنی ساکھ پر اتنا بڑا الزام کیوں لے رہی ہیں... میں سب کچھ جان بوجھ کر یہ کیسے برداشت کروں؟‘

میری اٹل بات برس فرید نے غور سے میری طرف دیکھا... اور مسکرا گئیں...

’میری یا تمہاری یہاں تک کہ یاسر صاحب کی بھی کوئی بات نہیں... اصل ساکھ تو اس فرم کی ہے جس سے میں، تم، حنیف اور یاسر صاحب اور بانی سب ہی جڑے ہوئے ہیں... اگر وہ آؤ رایسے ہی چلا جاتا تو میری یا یاسر صاحب کی نہیں بلکہ اس فرم کی ساکھ کو نقصان پہنچتا... اور تم نے مجھے بروقت بتا کر اس فرم کی ساکھ کو بچایا ہے اسی لئے میں نے یہ بات یاسر صاحب تک پہنچانی ضروری سمجھی کہ بہر حال تم کو شاباشی دلوانا ضروری تھا... باقی رہی میری ساکھ تو مجھے خوشی ہے کہ میرے ارد گرد تمہارے جیسے وفادار ساتھی موجود ہیں... جب اپنے اچھے دوست ملے ہوتے ہوں تو انسان کو ڈوبنے کی فکر نہیں رہتی لہذا بات کو سمجھو اور آگے بڑھو





اتفاق کر رہے تھے مگر کوئی بھی سامنے نہیں آ رہا تھا...  
مجھے پرواہ بھی نہیں تھی... بات کافی بڑھ چکی تھی مجھے  
یقین تھا کہ آج یا کل میں مجھے نکال باہر کیا جائے گا۔  
دیے بھی پوسٹ نہ ملنے سے میری ہار بھینی ہو گئی تھی  
تو اب میں بھی اس ڈرامے کو جلد از جلد ختم کر دینے  
پر تلا بیٹھا تھا...

’آفس سیاست سیکھنے میں برسوں لگ جاتے  
ہیں... اتنی جلد بازی اچھی نہیں... انتظار تو کرتے؟‘  
مس فرید نے میرا استفتاء پڑھ کر نرمی سے کہا...  
میں گہری سانس لے کر رہ گیا...

’اصل میں... میرے پاس وقت نہیں ہے... وہ  
اصل میں میری بہن... ابائی... کیا کہوں؟‘  
میں ایک بار پھر آدھی ادھوری بات کر کے  
خاموش ہو گیا۔  
’اوہ... میں سمجھ گئی...‘

مس فرید نے اب کی بار میری طرف غور سے  
دیکھتے ہوئے دلا سے والے انداز میں کہا۔  
’میں سمجھ سکتی ہوں... انٹرن کو ہمارے ہاں لون  
نہیں دیا جاتا... پکی نوکری پر ہی یہ سہولت موجود ہے  
... کیا بہن کی شادی کے لئے پریشان ہو یا ابائی کہ  
علاج کے لئے؟‘

اب کی بار جو مس فرید نے مجھ سے پوچھا اُس  
نے ایک بار پھر میری اُمید بڑھا دی اور میں خود پر  
اور بھی مظلومیت طاری کر کے منہ لڑکا کر بیٹھا رہا۔  
’میں جانتی ہوں کہ تمہاری تعلیم پر تمہارے گھر  
والوں نے جس طرح خرچ کیا ہے اب اُس کا نتیجہ  
صرف انٹرن کی صورت میں اُن کو ایک آنکھ نہ بھانا  
ہوگا... مگر تمہاری تعلیم ایسی ہے کہ چاہو تو میری سیٹ  
پر بھی آ سکتے ہو... اور اب تو تم کام بھی سیکھ گئے ہو...  
اور عباسی... اُس کے لئے اس سے بڑا دھچکا اور کیا

ہو سکتا ہے کہ اُس کی برابری پر تم آ جاؤ... اس لئے...  
یہ استفتاء... سمجھو کہ تم نے نہیں دیا... ٹھیک ہے؟‘  
مس فرید کی مجھ سے صرف آخری بات ہی سمجھ آ  
سکی تھی... ٹھیک ہے اگر وہ چاہتی ہے کہ میں اپنے  
چھ مہینے پورے کر کے جاؤں تو یونہی ٹھیک ہے...  
میں خاموشی سے واپس چلا آیا... اور پھر آج... جو  
یاسر صاحب نے مجھے بلا کر مس فرید کی جگہ سوئپ  
دی تھی تو مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ جتنا مجھے کیا سمجھائی رہی  
تھی... مگر اُس نے یہ ٹھیک نہیں کیا... یاسر صاحب  
کے آفس سے باہر نکلتے ہی مجھے سب سے پہلے جتنا  
سے ملنے کا شوق ہوا... وہ آج آفس نہیں آئی تھی...  
اب آئے گی بھی نہیں... میں ایڈمنسٹریشن آفس سے  
اُس کے گھر کا ایڈریس لے کے اُس سے ملنے کے  
لئے نکل کھڑا ہوا... یہ غلط ہے... یہ کھلی دھوکا دہی ہے  
... میں نے خود کو مظلوم طلبہ کا رد کھا کر جتنا کواستعمال کیا  
ہے... اس سے پہلے کہ اُس کے چلے جانے اور اُس  
کی جگہ میری تعیناتی کی مشہوری ہو مجھے اُسے سب  
کچھ سچ بتا کر واپس لے آنا چاہیئے... میں پورے  
راستے یہ سوچتا اُس کے گھر جا پہنچا... متوسط طبقے  
کے علاقے میں پُرانے طرز کے بڑے اور گول  
دلان والے گھر لائن سے بنے ہوئے تھے... سب  
گھروں کے آگے ایک طرف کچی زمین پر قد رتی  
طور پر یا سوچ سمجھ کر موچے کے پودوں کی باڑھی جو  
اس وقت موچے سے لدرھے ہوئے تھے... شام کا  
وقت اور موچے کی خوشبو... میں جتنی دیر دروازے  
کی نیل بجا کر کسی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا اُس  
وقت تک موچے کی خوشبو مجھ پر عجیب طرح سے اثر  
انداز ہو چکی تھی... دروازے پر ایک لڑکا آیا جس کو  
میں پہچان گیا تھا یہ جتنا کا وہ بھائی تھا جو اکثر ہی آفسی  
کی تقریب میں جتنا کے ساتھ آیا کرتا تھا... وہ بھی

مجھے پہچان گیا... وہ فوراً ہی مجھے اندر لے آیا اور سادے سے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے پانی کا پوچھ کر اندر چلا گیا... تھوڑی ہی دیر میں سنا چلی آئی... وہ جیسے جانتی تھی کہ میں اُس سے ملنے آؤں گا... اُس کا انداز ایک بار پھر مجھے سمجھانے جیسا ہی تھا... 'میں... میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں... میں... آپ یہ نہ کریں پلیز... میں نے ایک انک کر کہا شروع کیا۔

'خود کو قصور وار سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے... میں نے کسی دباؤ میں آکر جاب نہیں چھوڑی... میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے... تم جانتے ہی ہو میں کوئی کام جلد بازی میں نہیں کرتی... خنانے اپنے بھائی کے لاکر میز پر سجائے گئے ناشتے میں سے ایک سموسر پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر مجھے دلا سہ دیا۔

'آپ سمجھ نہیں رہیں... آپ پہلے سکون سے مجھے بات مکمل کرنے دیں پلیز... میں ایک بار پھر کوشش کرنے لگا... پتہ نہیں اُس کے آگے ہمیشہ میری زبان ہلکاتا کیوں شروع کر دیتی تھی... جیسے زبان اور دماغ کا رابطہ ہی منقطع ہو جاتا کہ جو دماغ میں ہوتا وہ زبان تک الفاظ کی صورت آتا ہی نہیں بس ہلکا کر منہ چلاتا رہ جاتا...

بہر حال میں نے آہستہ روی سے بات شروع کی... میں اُسے شروع سے ایک ایک بات بتا رہا تھا... ایک دو بار وہ جذبات میں کھڑی ہو گئی مجھے سخت نظروں سے گھورتی بھی رہی مگر اُس نے واقعی مجھے پورا موقع دے دیا کہ میں ہر بات اُس کے گوش گزار کروں... میں اپنی بات مکمل کر کے ہمیشہ کی طرح مظلومیت طرازی کر کے منہ لٹکا کر بیٹھ گیا... وہ مجھے چند لمحے گھورتی رہی پھر جیسے اُس نے ہار مان لی

... 'بھئی اب کیا ہو سکتا ہے... جاب تو مجھے چھوڑنی ہی تھی... اب کچھ بھی ہو میں واپس تو نہیں جاؤں گی... بس مجھے افسوس رہے گا کہ میں نے کسی حقدار کے لئے اپنی جگہ نہیں چھوڑی... اور تمہارے کہنے کے مطابق اب تم بھی اُس پوسٹ پر نہیں جاؤ گے کیونکہ تمہیں تو بس شرط جیتنا تھی... وہ تم جیت گئے اور تمہیں نہ باکر ایک بار پھر عوامی اپنی سفارش پر اُس پوسٹ پر قبضہ کر لے گا...'

خنانے تھکے تھکے انداز میں کہا تو مجھے ایک اور ترکیب سوچ گئی... 'اُس کے لئے آپ فکر نہ کریں... میں نے ایک حل نکال لیا ہے... میں چند مہینے آپ کی پوسٹ پر کام کر کے اُس سے ہی کسی حقدار کو وہ سیٹ دلوں گا کہ اب چھوڑوں گا...'

میں نے یہ بات کہتے کہتے دل میں اپنی شرط کے مکمل ہونے پر خوشی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچا کہ اسی طرح کچھ دن عوامی کو بھی سبق سکھا دوں گا... 'خنا صرف سر ہلا کر مجھ سے اتفاق کرتی رہی... 'ویسے اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گی کہ آپ نے آخر جاب کیوں چھوڑی؟'

میں نے دل کو ایک بار پھر سے ہلکا چھلکا محسوس کر کے آخر کار پوچھ ہی لیا... وہ مسکرائی... 'یہ بھی ایک مضمہیری بات ہے... پتہ نہیں یہ والدین بچوں کا رشتہ کرتے ہوئے اتنے پرسرار سے کیوں ہو جاتے ہیں... جس کا رشتہ ہو رہا ہے اُسی سے سب کچھ چھپانے کی بھلائی کیا ہے؟' خنانے جھنجھلا کر ٹپکے سے کہا تو مجھے امی جان کی آج کل انتہا کو بچپنی ہوئی پر سراریت یاد آگئی... سچ



ہی تو ہے... میں نے اثبات میں زور و شور سے سر ہلانا شروع کر دیا...

’صحیح کہہ رہی ہوں... ایسا ہی کرتے ہیں یہ والدین... اچانک سے کسی جاسوسی ناول کے جاسوس کی طرح خاموش اور چپ سے ہو جاتے ہیں... یہاں تک معمول کی بات چیت بھی اشارے کنایے سے کرنے لگیں گے... ہاں نہیں تو...‘

’مگر خیر میں نے تو کہہ دیا ہے کہ آپ کی خاطر جاب چھوڑ دی ہے مگر مجھے لڑکے کی تصویر ضرور دکھائیں گی... آخر اتنا تو میرا حق ہے... لہذا آج شاید کسی وقت اُن لوگوں کی طرف سے تصویر بھجوائی جائے گی... اب دیکھو یہ کون کھلتا ہے؟‘

کہتے کہتے جتا اچانک چونک پڑی اور میری طرف غور سے دیکھنے لگی... میں جھٹ سے کھڑا ہو گیا...

میں نے بھی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اپنا حصہ ڈالا اور کن انکھیوں سے اُس کی طرف بھی دیکھ لیا کہیں وہ میرے اُسے جتا کہنے پر ناراض تو نہیں ہوئی مگر وہ اس وقت اپنی ہی سوچوں میں تھی۔

’ہاں... اب یہی دیکھو... کہ میری والدہ نے میری بات کسی خاندان میں پکی کر دی ہے اور مجھے ہی نہیں بتا رہیں کہ وہ لوگ کون ہیں کیا کرتے ہیں... کہتی ہیں میں اُن لوگوں سے اپنی نوکری کے دوران کئی بار مل چکی ہوں... اُن کا لڑکا ابھی چند مہینے ہوئے پڑھ کر لوٹا ہے اور ابھی اپنے والد کا آفس جوائن نہیں کیا ہے... کسی جگہ انٹرن شپ کر رہا ہے جب کر چکے گا تو والد اپنے ساتھ شامل کر لیں گے... اب اتنے بڑے لوگوں میں بھلا ہمارا گزر کس طرح ممکن ہے... مگر بقول امی وہ لوگ ایشیاس مارے نہیں... اوپر سے نہ نام بتا رہی ہیں نہ ہی کوالف کا کچھ اتاچتہ... حد ہے کہ نہیں؟‘

’تمہارا پورا نام... پورا نام یہی ہے ناں جو تم نے آفس میں لکھوایا ہے؟‘

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے کاغذات میں نام کچھ اور ہوتا ہے مگر آپ آفس میں کسی اور ہی نام کے ساتھ مشہور ہوتے ہیں یا جان بوجھ کر اپنے نام کو ہلکا بھلکا کرنے یا پھر واضح کرنے کے باعث کسی اور نام سے جانے جاتے ہیں... لہذا میں نے بھی آفس میں اباجی کے نام میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تھی... میں گول مول جواب دے کر ضروری کام کے یاد آنے کا کہہ کر نکل کھڑا ہوا... میری ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی تھی... ابھی میں نے گھر سے باہر قدم نکالے ہی تھے کہ ہمارا بڑا ناڈر انیور اباجی کی گاڑی پر آتا دکھائی دیا... میں نے خود کو اُس کی نظروں سے بچانے کے لئے اپنا راستہ بدلا اور آؤ تاؤ دیکھے بنا ساتھ والی گلی میں مڑ گیا... مگر میرے لبوں کی سکراہٹ گہری ہو گئی تھی... واقعی آج صبح سے ہی نت نئے انکشافات ہو رہے تھے... یہ ایک یادگار دن بن کر ابھرا تھا... اب پتہ نہیں یہ انکشاف حنا پر کس طرح اثر انداز ہوگا... میں یہی سب سوچتا موچے کی بازوؤں سے لطف اندوز ہوتا باقاعدہ گنگنا چلا چلا گیا۔

حنا واقعی پریشان دکھ رہی تھی اور مجھے بھی پریشان کر گئی تھی... کیونکہ میرا شک یقین میں بدل رہا تھا کہ امی جان جو آج کل رابعہ کے ساتھ مل جل کر روزانہ ہی شاپنگ پر جا رہی ہیں وہ اصل معاملہ کیا ہے... میرے حلق میں سو سے کا نوالہ انک کر رہ گیا تھا... وہ کہتی چلی جا رہی تھی...

☆☆

# نئے اُجالوں کی برکھا





کھلے پارک میں سگی بچ پر بیٹھا وہ اپنی لامتناہی  
سوچوں میں غرق تھا نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی  
تھیں اور دماغ منتشر۔

☆.....☆

بریرہ..... نفیسہ کی آواز میں نقاہت اور درد  
چھپا تھا۔

جی امی! سعادت مندی سے وہ ہاتھ پونچھتی باورچی  
خانے سے نکل کر آئی اور ان کے قریب آ بیٹھی۔

دل بہت بے قرار ہو رہا ہے ان کی آواز ان کے  
وجود کی طرح کانپ رہی تھی بریرہ ان کے قریب  
بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر زری سے گویا ہوئی

امی کیوں اتنا سوچتی ہیں پہلے ہی آپ کا بی بی  
بڑھا ہوا ہے بریرہ ماں کے اداس چہرے پر بغور  
نظریں جم کر اندر کا سارا درد چھپا کر بولی

آپ کو اللہ پر بھروسہ ہے ناں۔ بریرہ انہیں غم  
کے سمندر سے نکالنے کی سعی کرنے لگی نفیسہ کی  
آنکھوں میں نمی بڑھنے لگی تھی۔

مجھے تمہاری فکر مارے ڈال رہی ہے بریرہ وہ  
کر بناک لہجے میں بولیں تو بریرہ نے ایک ٹھنڈی  
سانس لی اور انہیں قائل کرنے لگی

امی میری فکر نہ کیا کریں اللہ اچھا ہی کرے گا  
بس ہمیں انتظار کرنا ہے اس کی رحمت کا اور اچھے  
وقت کا۔ وہ انہیں تسلیاں دیتی رہی۔

”اوہ..... میں دلیہ لے آؤں پک چکا ہوگا  
آپ انیسے ہاتھ منہ دھویئے۔ تازہ دم ہو جائیے“  
وہ انہیں زبردستی واش روم کی طرف بھیج  
کر باورچی خانے میں آگئی ذہن دکھ کی بجائی میں  
مسلل چل رہا تھا۔

وقاص اس کا بڑا بھائی باپ کے مرنے کے بعد  
خود غرضی کی انتہا پر آ گیا۔ شکر ہے گھرا ہوا تھا احمد  
حسین نے بڑے چاؤ سے بخوایا تھا۔۔۔ بہت بڑا  
کھلا وسیع ڈبل اسٹوری گھر کا پر وقاص کی فیملی

کھنڈ، کام چور، کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔  
مہرین بھابی کے زیر آلود الفاظ کی بازگشت  
آنکھوں میں بے ساختگی لے آئے۔

وجدان نے اک گہری سانس لی اور یونہی  
بھاگتے دوڑتے لوگوں کو یکھنے لگا۔ پارک میں اس  
وقت رش کم تھا۔ وہ بچہ زور بخور تھا۔ دل  
پر چھائے بوجھ نے اسے حساس بنادیا تھا۔

سعدان اور وجدان دو ہی بھائی تھے۔ سعدان  
کی شادی کو پانچ برس ہو گئے تھے ان کے دو بچے  
تھے۔ وجدان سعدان سے آٹھ برس چھوٹا تھا۔

دونوں کے بیچ اور بہن بھائی بھی آئے مگر انہیں  
زندگی نہ مل سکی۔ باپ کے جانے کے بعد سعدان  
نے اسے والد کا پیار دیا جو مہرین کے آتے ہی رفتہ

رفتہ کم ہوتے ہوتے غائب ہونے لگا اماں کو اس کا  
بخوبی اندازہ تھا۔ ان کی نصیحت بھی کہ وجدان خوب  
پڑھے اور کسی کا دست نگر نہ ہو۔ سال قبل ہی اماں کا

انتقال ہو گیا وجدان کا ایم بی اے مکمل ہو چکا تھا اب  
وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا ایسے میں مہرین  
بھابی کے طعنے نشتر بن کر لگتے۔ وہ کچھ نہ بولتا، ناشتا

کر کے جیسے تیسے گھر سے نکل پڑتا۔ ایسے میں  
خاموش سعدان پر اسے بچہ غصہ تو آتا مگر وہ بے  
بس تھا کئی جگہوں پر نوکری کی بات کی سی وی بھیجی مگر  
ہنوز ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا ایک دوست نے

چند ٹیوشن بتائیں وہ پڑھانے لگا۔  
خوش شکل وجدان حالات کی جھکی میں پس رہا  
تھا۔ ایسے میں کوئی خوشگوار خیال کیسے دل کو چھو  
سکتا تھا؟ کوئی رشتیں آنچل، کوئی خوشبودار جملہ، کوئی  
سبک رو، رو پہلا احساس یونہی سوچتے سوچتے شام

دال گرم کی اور کھانے لگا۔ ایسا اب اکثر و بیشتر ہونے لگا تھا وہ جب رہتا سعدان کی خواہ بھی اچھی تھی گھر میں خوشحالی مگر مہرین کا دل وجدان کے معاملے میں چھوٹا کا چھوٹا ہی رہا رات گئے وہ الٹی سیدی سوچوں میں گرفتار رہا۔

☆.....☆

آج اسے ٹیوشنز کے پانچ ہزار ملے تھے نوکری ابھی تک روٹھی محبوبہ کی طرح غریب دکھا رہی تھی مگر وجدان نے کوشش جاری رکھی ہوئی تھی۔ عصر کا وقت تھا ہلکی ہلکی مشکباز ہوا دماغ کو تڑاوت بخش رہی تھی بچوں کا کھیل کود جاری تھا کچھ لوگ داک میں مشغول تھے۔ ایسے میں نسوانی سسکیوں نے وجدان کی حس بیدار کر ڈالی۔ ذرا فاصلے پر سنگی بچ کے دوسری جانب سے آئی آواز نے وجدان کو وہاں جانے پر مجبور کر دیا پہلے خوش رنگ لباس میں کوئی لڑکی چہرہ چھپائے سک رہی تھی۔

سنیے..... وہ چند قدم کے فاصلے پر رک کر بولا تو وہ جیسے روتے روتے اچھلی اور کھڑی ہو گئی۔ شفاف رنگت۔ نازک سراپا۔ بڑی بڑی خمار آلود پلکیں۔ اشکوں بھری۔ وجدان کو یوں لگا جیسے وہ کھوسا گیا کالے اسکارف میں چھپا چہرہ۔

کون ہیں آپ..... وہ گلوگیر آواز میں بولی اور بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اس کا لامبا قد اس کی شخصیت پر چرچ رہا تھا۔

میں وجدان طاہر ہوں۔ آپ کے رونے کی آواز سنی تو چلا آیا۔ رونے سے سلسلے نہیں ہوتے بی بی! بہادر بنیں۔ وجدان نے گویا اسے سمجھایا پھر اگلے چندہ منٹ میں وہ اسے سب کچھ بتا چکی اور وجدان نے بھی سارا حال کہہ ڈالا..... تو گویا دونوں کی برسوں پرانی شناسائی ہو..... ہاں دکھوں سے شناسائی ازیں تھی..... دونوں دکھ اور حالات کی چکی

رہے گی اور نیچے وہ خود مگر مکان بننے کے سال بعد ہی وہ وفات پا گئے۔ وقاص نے ماں کا زیور بکوا کر باہر کی راہ لی اور پچھلے تین سال سے وہ وہیں شادی کر کے کینیڈا میں تھا البتہ وقفہ وقفہ سے بڑی رقم ماں کو بھیجتا فون کر کے نفیسہ کے زخموں کو ادھیڑ دیتا مگر آنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

بریرہ اسی سال ماسٹرز کے فارغ ہوئی تھی نفیسہ کو اس کی فکر گھن کی طرح جاٹ رہی تھی وقاص کو بریرہ کی فکر نہ تھی جو کرتا تھا نفیسہ کو کرتا تھا اور کاپورشن کرانے پر دے رکھا تھا گزرا وقت ہو رہی تھی۔ وہ خود بلڈ پریشر اور شوگر کی سر فیضہ بن چکی تھیں بریرہ ہی سارا گھر دیکھتی اللہ نے اسے اچھی صورت و قامت سے نوازا تھا پڑھی لکھی تھی مگر ابھی تک رشتہ نہ ہونے کے سبب نفیسہ کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ پڑوسیوں اور چند رشتے داروں کو کہہ بھی رکھا تھا مگر بات بن کر نہ دے رہی تھی کوئی مکان کے لالچ میں آتا تو کوئی انہیں پسند نہ آتا پہلے وقاص کی بے بسی پر دل کر چئی کر چئی ہوا اب بریرہ کی پریشانی نے نفیسہ کو ادھ موا سا کر دیا تھا۔ وہ جائے نماز پر سر رکھے رو رو کر دعائیں کرتیں خود بریرہ پریشان رہتی ماں کے سوا تھا ہی کون دنیا میں۔

☆.....☆

گھر آ کر وہ کمرے میں آیا مہرین کی تیز نگاہیں اس کا پچھلے کرتی رہیں۔ فریش ہو کر باورچی خانے میں آ گیا دپٹی کے پندے میں ذرا سی دال پختی رکھی تھی ہاٹ پاٹ خالی تھا روٹی تیار دارا فرنیج کھولا تو ڈبل روٹی بھی غائب۔ وہ لٹے قدموں باہر نکلا۔ ہوٹل سے روٹی لے آؤ۔ دال رکھی ہے کھانی ہے تو کھا لینا۔ باہر آیا تو برآمدے سے مہرین کی تیغ آواز ابھری۔

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر گھر سے نکل گیا۔ روٹی لایا

پھر وہی ہوا۔ اگلی شام وجدان کے سامنے کھل کر رو پڑی اور ساری بات بتادی۔ وجدان سوچ میں پڑ گیا اور اسے محض تسلی دینے کے علاوہ اور کبھی کیا سکتا تھا..... آس دلا نا بچہ مشکل تھا۔

☆.....☆

دو ماہ اسی تک دو دو میں گزر گئے۔

آپا مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے میرا بس چلے تو اسے گھر میں بھی نہ گھسنے دوں۔ مہرین آج بڑی بہن کو فون پر دل کا حال کیا بلکہ بھڑاس نکال رہی تھی اور بہن بجائے اسے سمجھانے کے اور زیادہ طیش دلا رہی تھی سعدان سے کھل کر بات کرونا کمانے والا تو وہی ہے شہرین چلتی پرتل کا کام کر رہی تھی۔

آئی دے دے بے لفظوں میں کئی بار کہہ چکی ہوں مگر وہ مجھے ہی ڈانٹ دیتے ہیں کہ وہ کوشش تو کر رہا ہے مل جائے گی نوکری بھی مگر مجھ سے اب یہ کھٹو برداشت نہیں ہوتا ایسی بے سرو پا فضول لایختی باتیں کرنے کے بعد اپنا فشار خون بلند کر کے وہ کام دھندوں میں لگ گئی۔

☆.....☆

دن گزرتے جا رہے تھے نفیسہ کی طبیعت کبھی خراب ہو جاتی کبھی ٹھیک جیسے جیسے اگلا ماہ قریب آ رہا تھا جبار کے کرایہ دینے کا بریرہ سوچ رہی تھی کہ وہ ماں کو ہی کرایہ لینے بھیجے گی۔

مگر اس روز وہ گروسری کا سامان لے کر آ رہی تھی تو جبار سے مڈ بھیڑ ہو گئی اس نے بھاری شاہپر اس سے لے کر مدد کرنی چاہی مگر بریرہ نے سختی سے اسے جھڑک دیا۔

ارے اکڑنی کس بات پر ہو مدد ہی تو کر رہا ہوں اس نے دانت کھوستے ہوئے آنکھیں گھمائیں۔  
شکر ہے اپنے کام سے کام رکھیں بریرہ نے لہجہ میں انتہائی سختی بھری اور لاک کھول کر اندر آ گئی۔

میں پس رہے تھے۔ دو دن بعد وہ اسے گھر لے آئی۔ پارک کے دوسری جانب چند منٹ کے فاصلے پر اس کا گھر تھا۔

نفیسہ بھی اس رکھ رکھاؤ والے وجدان سے مل کر بچہ خوش ہوئیں۔ وہ تھا ہی ایسا خوش اخلاق اور عزت کرنے والا خود وجدان کو ان سے مل کر ماں کی مہک آئی بریرہ کے اندر مثبت تبدیلی آنے لگی۔ اسے وجدان کا انتظار رہنے لگا۔ مگر وہ کبھی کبھار آتا۔ اس روز بھی آیا تو کرائے دار نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا اور گزر گیا وجدان کچھ نہ سمجھ سکا۔

☆.....☆

جبار نے کرایہ دینے کے لیے دروازہ بجایا تو بریرہ نے کھولا۔ کرایہ دینے کے بھانے اس نے جان بوجھ کر اس کی انگلیوں کو چھوا بریرہ کو کرنٹ لگا۔ وہ گھوی پینتالیس سالہ شادی شدہ جبار کو یہاں رہتے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا آج پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ بریرہ اس کی گندی نظروں سے بچتی اور نظر

انداز کرتی رہتی..... اس کے اندر بے بسی کی ایک لہر اٹھی جیسے کسی صحرا میں کھڑی ہو۔ لقمہ صبرا۔ بیمار ماں اور وہ تنہا..... بے آسرا سی۔ گویا پناہ جھٹ کے کسی کمرے میں کھڑی ہو۔ پیسے مٹھی میں دبائے وہ لرزے قدموں سے اندر آ گئی ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بزدل یا کم ہمت لڑکی تھی۔ مگر اس طرح کی صورت حال کا سامنا آج پہلی بار کرنا پڑا تھا وہ بازار جاتی شاہپر کرنی اپنی خود اعتمادی اور با کردار ہونے پر رشک کرتی۔

پھر آج کیسے جبار کی اتنی جرات پہلے تو وہ صدمہ کی کیفیت میں رہی پھر غصہ غالب آنے لگا نفیسہ سے بھی بات نہ کر سکتی تھی وہ پہلے ہی دکھوں اور بیماریوں سے نبرد آزما تھیں۔

چلتے ہیں آنٹی کو لے کر۔“  
وجدان کے نرم لہجے پر وہ نخلستان میں آگئی کتنا  
ہمدرد بنے، پھر اس کی مدد سے انہیں اسپتال لے  
آئے دو گھنٹے بعد حالت سنبھلی۔ بی بی شوٹ کر  
گیا تھا۔

سامان کچن میں رکھ کر ہاتھ روم میں آگئی۔ یہی وہ  
جائے پناہ تھی جہاں وہ درو رو کر اپنے دل کا غبار نکالتی  
تھی مگر معاملہ جوں کا توں گھبر تھا۔

☆.....☆

دو تین دن سے وہ پارک نہ جا سکی تھی تو وجدان  
چلا آیا۔

بریرہ وجدان کی شکر گزار تھی۔ ممنون نظروں  
سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا۔ لمحہ بہ لمحہ دونوں ایک  
دوسرے کو قریب تر محسوس کرنے لگے۔  
دو ایسا خرید کر وہ انہیں گھر لے کر آ گئے۔

اسے اب بریرہ دل کے قریب محسوس ہونے  
لگی تھی مگر اس کا حال چکوری کی مانند تھا اور بریرہ چاندنی  
وہ صرف اسے دیکھ سکتا تھا مگر اسے حاصل کرنا  
نامرادی کے زمرے میں آتا تھا۔

نفسیہ بھی حیران تھیں کہ ابھی دنیا اچھے لوگوں  
سے خالی نہیں ہوئی ایسے لوگ بھی ہیں وجدان جیسے  
ایک ان کا بیٹا ہے جو پیسے بھیج کر ہر فرض سے بری  
الذمہ ہو گیا تھا اور ایک وجدان ہے۔

بریرہ کا اداس چہرہ اسے دکھی کر گیا۔  
نفسیہ بیگم نے جانے کیا سوچ کر اس کے ذمے  
کام لگا دیا۔

کیا تعلق اور رشتہ تھا اس انسانیت کا ہمدردی کا  
یاں..... وہ گہرائی میں جا کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور  
تھیں۔

بیٹا کوئی اچھا رشتہ ہو تو بریرہ کے لیے بتاتا.....  
اور بریرہ جیسے آسمان سے زمین پر آگری۔  
جائے چھوڑ کر وہ سسکیاں لیتی باہر آگئی نفسیہ

آخر زندگی کے اس موڑ پر کوئی تو فیصلہ کرنا تھا۔  
☆.....☆

اور وجدان ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ وجدان  
اس کی کیفیت کو جانتا تھا۔

آخر آپ پوچھتے کیوں نہیں کہاں آوارہ گردی  
کرنا رہتا ہے سارا سارا دن سرائے سمجھ کر سونے  
آ جاتا ہے۔ مہرین آج سعدان کے سامنے پھٹ  
پڑی تھی۔ سعدان بھی حیران تھے مشکوک سے  
ہوئے یا پھر اپنی لاپرواہی پر تشکر۔ وجدان کی طلبی  
ہوئی۔

”جی آنٹی.....“ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور  
گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔  
نفسیہ کی طبیعت کئی دن سے بگڑ رہی تھی۔

ٹیوشنز ہی تو پڑھاتا ہوں کچھ صبح کچھ شام۔  
خوبرو وجدان سر پیچھے کیے بولا تو سعدان کو اس پر  
پیار آ گیا۔

کافی دنوں سے نہ وجدان آیا تھا اور نہ وہ  
پارک جا سکی تھی عجیب سوچوں کا شکار تھی نفسیہ کی لمحہ  
بہ لمحہ بگڑی حالت پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے  
ان پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی بریرہ کو کچھ نہ سوجھا  
تو وجدان کو فون کر دیا آج وہ چھٹی کی وجہ سے اپنے  
دوست کے گھر پر تھا بریرہ کے فون پر دوست کی  
بائیک اڑا تا پندرہ منٹ میں آ گیا۔

ٹھیک ہے جاؤ سعدان اس سے بلا وجہ مہرین  
کی وجہ سے کیوں الجھتے حالات کا ستایا لگ رہا تھا۔  
انہوں نے وجدان کے جانے کے بعد مہرین پر  
ایک کڑی نگاہ ڈالی اور سونے کے لیے کمرٹ بدل

بریرہ کی روٹی روٹی آنکھوں میں حد درجہ خالی  
پن تھا۔  
”ہمت سے کام لو بریرہ ابھی ڈاکٹر کے پاس



سنجھل کر بولیں۔

لی تب مہرین غصے سے بل کھاتی لائٹ آف کر کے باہر چلی گئی۔

توجہ سے میری بات سنو۔ میں نے بہت پہلے اسکول کھولنے کا ارادہ کیا تھا مگر ہم دو عورتیں اگلی اس کام کو نبھی کر پائیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم سے یہ بات کی ہے یہ گھر کافی بڑا ہے ہم کرایہ داروں کو ہٹا کر اور پرہ لیں گے اور نیچے والے اس حصے کو اسکول بنائیں گے تم اور بریرہ مل کر اسکول چلانا اس طرح تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ تم جیسے خود دار خنٹی اور ہمدرد انسان کی تلاش تھی اللہ اپنے بندے کو تنہائیں چھوڑتا میں آج ہوں کل نہیں سب کچھ بریرہ کا ہے اس کے جینز کے لیے جو رقم جمع ہے وہ اسکول کھولنے کے کام آجائے گی اس طرح تمہارے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے اور تم دونوں کا گھر بھی بن جائے گا۔

سعدان کو اپنے بھائی پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ نیک، شریف، کسی غلط سرگرمی میں ملوث نہیں تھا سعدان پر اس کی ذمہ داری تھی جسے وہ نبھانا خوب جانتے تھے جیسی تو ہر ماہ اسے کچھ ہزار روپے مہرین سے چھپا کر دے دیا کرتے تھے۔ وہ میر دزگار تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔

☆.....☆

اس سے پہلے کہ لوگ انگلیاں اٹھائیں بدنامی اور رسوائی دامن گیر ہو بیٹا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ دو دن بعد وجدان آیا تو نفسیہ کی طبیعت قدرے بہتر تھی مگر ان کی آواز میں موجود حزن اور ٹھہراؤ نے اور خاص طور پر ان الفاظ نے وجدان کو بری طرح چونکا دیا۔

کس قدر مدلل انداز میں اور سوچ بوجھ سے انہوں نے ہر مسئلے کا حل نکال کر وجدان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وجدان کی خوشی کی انتہاء تھی۔ بیٹا تم بڑھے لکھے ہو انسان کے اندر عزم و ہمت اور منزل تعین کرنے کی صلاحیت ہو تو راستے خود بخود اہل ہو جایا کرتے ہیں میں نے تو سب کہہ دیا ہے تم بھی سوچو بیٹا گھر والوں سے مشورہ کر لو تب بات آگے بڑھے گی میں ایک ماں ہونے کے ناطے یہ کہتے ہوئے شرمساری محسوس کر رہی ہوں مگر اس کے بنا کوئی چارہ نہیں ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ آنٹی آپ بریرہ سے تو پوچھ لیں اسے کوئی اعتراض تو نہیں۔

تب وہ ان کی بات کی تہہ تک جا کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی آنٹی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں“ وجدان جیسے ہکا کر بولا۔

بیٹا میں بیمار ہوں جانے کب بلاوا آجائے۔ ان کا لہجہ تھکا تھکا اور مایوسانہ تھا۔ وہ سر جھکا کر اپنا مدعا بیان کرنے لگیں۔

تم بریرہ سے شادی کر لو۔ انہوں نے گویا وجدان پر دھماکا کیا۔

وہ انتہائی حیرت سے ان کی جانب دیکھ کر دیکھی لہجے میں بولا۔

وجدان ان کے غلطوں پر نیم رضا مندی سے مسکرا کر بولا تو نفسیہ کو ڈھارس ملی انہیں بھروسہ تھا کہ وجدان انکار نہ کرے گا۔

میں میر دزگار ہوں آنٹی کیسے اس ذمے داری کو نبھائوں گا؟ وجدان حقیقت سے پر انداز اختیار کر کے آہ بھر کر بولا اس کی آواز میں دیکھوں کی نمی تھی۔

وہ میری بیٹی ہے میں اس کے لیے بہتر ہی سوچوں گی۔

ان کے مشفق انداز پر وجدان پر سکون ہو کر جانے لگا  
شکریہ آ نئی میں جلد آؤں گا۔ وہ مودب ہو کر  
بولا اور باہر آ کر اس نے دزدیدہ نگاہوں سے بریرہ  
کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر بے سود وہ جان بوجھ کر  
سامنے نہیں آ رہی تھی۔  
پھر ایک آسودہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ گھر آ گیا۔

☆.....☆

ہونہہ..... سعدان اور مہرین اس کی باتیں غور  
سے سن رہے تھے تو سعدان نے ہنکارا بھرا۔  
”ٹھیک ہے ہم مل لیتے ہیں۔ بات کر لیتے  
ہیں اور ہاں اس گھر میں بھی تمہارا برابر کا حصہ ہے  
چاہو تو ہمیں رہو یا میں کچھ عرصے بعد رقم ادا کر دوں  
گا۔“ سعدان نے انصاف سے کام لیا تو وجدان ان  
کے سینے سے جالگا۔

اس پر مہرین تملکا کر پہلو بدل کر رہ گئی وہ کچھ  
بھی نہ کر سکتی تھی۔ سعدان کی نفیسہ سے طویل بات  
ہوئی مہرین بھی ہمراہ تھی۔

یوں آنے والے جمعہ کو مختصر سی رسم ادا کرنے کا  
ارادہ کر لیا تھا آنے والے جمعہ کو چند افراد کے ہمراہ  
وہ نکاح کرنے نفیسہ کے گھر پہنچ گئے۔ سعدان نے  
مٹھائی کا ڈبہ اور پانچ ہزار روپے بریرہ کو دیے مہرین  
کچھ کپڑے اور انگوٹھی ہمراہ لائی۔

مزید ملنے کے بعد وہ گھر آ گئے۔ مختصر سی گلے ہنسنے پھرتی۔  
جبار کو دو ماہ کا نوٹس دے دیا گیا کہ گھر خالی  
کر دے سارے معاملات اللہ کی مہربانی سے ٹھیک  
ہو رہے تھے۔

وجدان کبھی حیران ہوتا تو کبھی ہنس پڑتا مقدور  
نے اسے فرش سے عرش پر بٹھادیا تھا تقدیر کے اس  
روشن پہلو پر وہ اللہ کا شکر گزار تھا نفیسہ کی بہترین  
عقل و فہم نے بہت سارے مسائل حل کر ڈالے

تھے۔ مہرین کا مزاج بھی ٹھکانے آ گیا تھا۔ سعدان  
اور وجدان کے ساتھ مل کر بری تیار کرنے لگی  
سعدان ہی ساری رقم خرچ کر رہا تھا۔

مختصر پرانلی بری تیار ہو گئی یہاں تک کہ شادی  
کا دن آ گیا۔ بریرہ کو اس کی سہیلی نے گھر پر آ کر ہی  
تیار کر ڈالا جو بیٹیشن تھی جس سے اس کا حسن دو  
آشت ہو گیا تھا سعدان نے وجدان کے کمرے کو جلد  
عروسی کی شکل دے دی تھی کہ بریرہ نے رخصت ہو  
کر یہیں آنا تھا اور ہفتہ بھر یہیں رہنا تھا ایسا نفیسہ  
بیگم کے مشورے سے کیا گیا تھا ان کے پاس اتنے  
دن ان کی ایک رشتے دار خاتون رہے گی وقت  
مقررہ پر بارات پہنچی غیر ضروری رسومات سے گریز  
کیا گیا کھانے کے بعد وہ ماں کی دعاؤں کے  
سائے تلے اٹھکار ہوئی وجدان کے سنگ آ گئی۔  
مہرین نے اسے کمرے میں پہنچادیا وجدان جیسے  
سرشاری کے بوجھ تلے تھا

بریرہ کا ہاتھ تھام کر اس نے ایک نازک سا  
بریسٹ اس کی کلائی میں پہنایا اور گنگنایا کہ تم  
میری زندگی ہو..... کہ تم میری زندگی ہو۔

بریرہ کے لبوں پر شرمیلی مسکان گہری ہو گئی اس  
نے وجدان کے کندھے پر سر نکا دیا دل سے وہی  
صدائیں مدھوش ہو کر ابھر رہی تھیں:

منزل یوں بھی ملتی ہے

کہ سر راہ ایک اجنبی

بن گیا زندگی

نہ تھی جس سے کوئی جان پہچان

ہوئی جب آشنائی

بن گیا وہ دل کا مکین

بے آسرا کو جیسے سہارا مل گیا ہو

آسرا مل گیا ہو

زیست کے تنے صحرائیں

وہ بین بادل کے برس گیا ہوا!

## تلافی

دو غی زندگیاں گزار گزار کر ہم سب اس قدر بے حس  
 ہو گئے ہیں کہ اپنے گناہوں کی سزا کو بھی کاتب تقدیر کی  
 آزمائش سمجھ لیتے ہیں.....



ہیں۔“

”آپ جیسے نیک اور مخلص لوگوں کی وجہ سے ہی یہ دنیا چل رہی ہے“ مرزا نصاریٰ ستائشی جملے کہے بغیر نہ رکھیں۔

حالانکہ پچھلے دو سال سے بھاری بھر نذرانے دے دے کر وہ تھک چکی تھیں مرزا منصور کا شائستگی سے بھرپور لہجہ ان کو کافی حد تک پرسکون کر گیا تھا۔

مرزا منصور نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بات کو جوڑتے ہوئے کہا ”کچھ زیادہ نہیں تھوڑا بہت ہدیہ ہی بخش کر رکھا ہے۔ پانچ ہزار ایڈوانس اور پچیس ہزار رشتہ ہو جانے پر لیٹی ہوں لیکن چونکہ آپ مجھے معقول خاتون لگیں آپ کی بیٹی کا رشتہ میرے ہاتھ ہو جائے گا تو آپ بائیس ہزار دے دیجیے گا۔“

”کولڈ ڈرنک تولیں“ مرزا منصور نے ٹھنڈے مشروب کا گلاس ان کی جانب بڑھاتے ہوئے نہایت بے نیازی سے وزینگ کارڈ پر تفصیلات درج کرتے ہوئے ان کے حوالے کیا۔

مرزا نصاریٰ ہکا بکارہ گئیں ”یہ کچھ زیادہ ریش نہیں؟“

لیکن جب مرزا منصور نے نظر انداز کیا تو مجبوراً انہیں ایڈوانس ادا کرنا پڑا چونکہ بتائی گئی لمبی فہرست میں ان کی بیٹی کے محفوظ مستقبل کی روشن کرن نظر آرہی تھی شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا جس کا اندازہ مرزا منصور اس طرح کے ہزاروں کلائمش کے فکر مند چہروں کو دیکھ کر آسانی سے لگا لیتی تھیں۔

ایڈوانس تھاتے ہوئے مرزا منصور کے شکریہ کے بول محض نگلفاتی سے زیادہ نہ تھے۔

”میں نے آپ کی بیٹی کا پروفاٹل نوٹ ڈاؤن کر لیا ہے۔“ مرزا منصور نے دھیمی مسکراہٹ سجائے اپنی کلائمش کا ڈیٹا رجسٹر کرتے ہوئے کہا۔

مرزا نصاریٰ اپنی بیٹی کا رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں اور اسی سلسلے میں آج مرزا منصور کے آفس آئی تھیں۔

”برائے مہربانی ذرا جلدی رشتہ بتائیں میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔“ مرزا نصاریٰ مخاطب تھیں۔

”میں عام بیچ میکروڈ کی طرح نہیں بولوں مجھے کچھ مناسب لگتے ہیں انہی کی خدمت کے لیے یہ آفس حاضر ہے“ مرزا منصور نے خود ساختہ خدمت کے جذبات پر توجہ دلائی۔

”میرے پاس آپ کی ڈیمانڈ کے مطابق بہت اچھے رشتے موجود ہیں ایک تو بالکل آپ کے لیے موزوں تھا بس آپ ذرا لیٹ ہو گئیں دو ماہ پہلے ہی رشتہ کروایا ہے“ یہ کہتے ہوئے مرزا منصور نے فوراً اندراج رشتوں کا رجسٹر اٹھایا اور یکے بعد دیگرے رشتوں کی تفصیلات چہرے پر مستقل مسکراہٹ لیے بتانے لگیں جسے جان کر مرزا نصاریٰ کو اس دشوار مرحلے پر کچھ امید دکھائی دے رہی تھی۔

”مرزا منصور آپ کے ریش کیا ہیں..... میرا مطلب کیا لگتی ہیں آپ رشتہ کروانے سے پہلے اور ہو جانے کے بعد.....؟“ اگلا مرحلہ ریش طے کرنے کا تھا مرزا نصاریٰ نے آہستگی سے پوچھنا چاہا۔

”ریش کیا ہیں بس کارخیر ہی کہہ لیں آپ دیکھ رہی ہیں ناں میرے پاس خدا کا دیاسب کچھ ہے۔ آپ خود بتائیے کسی کا گھر بسانے کی کاوش سے بڑی نیکی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟ بچوں کی شادیاں طے ہو جائیں اس کے سامنے ریش کیا معنی رکھتے



”پھر آپ کب تک لوگ لے کر آ رہی ہیں؟“ مسز انصاری نے جانے سے پہلے تسلی چاہی۔

”ارے کمال کرتی ہیں مسز انصاری آپ!“ ایک دفعہ پھر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب کیا ”اس سے پہلے کچھ قواعد و ضوابط ہیں جن کو ضرور فالو کرنی ہوں اپنی کی بیٹی کی اسٹیپ (تصویر) دے دیتیں تو اچھا ہوتا، آپ کا ہمارا سب کا وقت بچ جاتا۔ آپ نے بتایا کہ بیٹی حجاب کرتی ہے آج کل ایسی باپردہ لڑکیوں کے لیے لوگوں کو خاص کنوئیں کرنا پڑتا ہے دیئے تو آپ کی بیٹی پڑھی لکھی ہے یقیناً دنیاوی سوچ کی نہیں ہوگی لیکن مجھے خود آ کر ملنا پڑے گا تاکہ لوگوں کو قائل کر سکوں“

مسز انصاری نے غیر متوقع بات سن کر فکر اور غصے کے طے جلے تاثرات کو چھپاتے ہوئے ان کو جلد گھر آنے کی دعوت دی مسز منصور نے ان کی بوکھلاہٹ کو جانچتے ہوئے نہایت دردمندانہ انداز میں کہا

”اسی لیے تو میں اسٹپس کا کہہ رہی تھی اب دیکھیں نا دیسے تو میں خود بھی کارڈ رائج کر سکتی ہوں لیکن میرے شوہر کے زیر استعمال ہوتی ہے پھر رکشے سے آنا بھی آج کل آسان نہیں اتنے اتنے کرائے ہوتے ہیں کہ بس.....“

مسز منصور نہایت تجربہ کار قصائی کی طرح لمحہ ضائع کیے بغیر کھال اتارنے میں مصروف تھیں۔

”مرتے کیا نہ کرتے“ کے مصداق مسز انصاری نے پانچ سو کا نوٹ مسز منصور کی طرف بڑھایا جسے دیکھتے ہی مسز منصور کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا۔

”یہ کیا مسز انصاری؟“

”آپ شاید بھول رہی ہیں کرائے کے علاوہ لوگوں کو لمبی لمبی کال کے ذریعے قائل کرنے میں بیل بھی تو لگے گا“ اس بار بغیر کسی گنگی لپٹی کے وہ بول پڑی تھیں۔

”اسی لیے تو میں آپ کو اسٹپس کا کہہ رہی تھی“ مسز منصور نے ایک بار پھر تصویر بند دینے کے نقصانات کا ادراک کرانا چاہا۔

مسز انصاری جن کے پریشانی سے فق ہوتے چہرے پر اطمینان کے آثار رونما ہونے لگے تھے پھر سے عیاں ہونے لگے نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً پرس کھولا اور اس میں سے آخری ہزار کا نوٹ ڈالتے دل کے ساتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

☆.....☆

”ادھو راؤ صاحب معذرت مجھے ذرا دیر ہوگئی“ حاجی منصور نے نہایت مودبانہ انداز میں پچھلے دو گھنٹے سے انتظار میں بیٹھے اپنے کلائنٹ راؤ داؤد کو دیکھتے ہی مخاطب کیا۔

”نماز کے لیے گیا تھا ساتھ ہی مسجد کی آرائش کے لیے انتظام کرنے میں کچھ وقت لگ گیا۔“ ”سوچا خود ہی آ کر آپ سے ملاقات کر لوں ملاقات بھی ہو جائے گی اور عمرہ کی سجاوٹ کی مبارکباد بھی دے دیں گے۔“

راؤ داؤد نے گرجوٹی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

”بہت بہت شکریہ..... بس جی جج کے بعد اپنے رب کے گھر کے دیدار کا بہت دل لپچا رہا تھا“ مسز منصور صاحب نے دو سال پہلے جج کیا تھا اور اس کے بعد سے وہ حاجی صاحب کہلانے لگے تھے

چڑا اسی کو چائے بسکٹ کا کہہ کر حاجی صاحب پھر گویا ہوئے

”مجھے عمران صاحب نے آگاہ کیا تھا غالباً آپ اپنے فلیٹ کی رجسٹریشن کرانا چاہ رہے ہیں“ یہ میرا ہانسی فلیٹ ہے اسی لیے جلد از جلد قانونی کارروائی کروانا چاہتا ہوں۔ راؤ داؤد نے فائل حاجی منصور کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل فکر نہ کریں کام ہو جائے گا قانونی کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے“

”باغبان اپارٹمنٹس.....“ حاجی منصور نے زور دے کر کہا۔

”غالباً اس کے عقب میں الیکٹرم ٹرسٹ ہے“ حاجی منصور نے ذہن پر زور دیتے ہوئے مزید کہا۔

”بالکل جی بالکل..... دوسرے فلور پر بائیں طرف کا فلیٹ ہے“

”چلیں جی پھر تو آپ ہمارے پڑوسی ہوئے ناں“ حاجی منصور نے کرسی کے تھمے پر اپنا بازو جماتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ راؤ صاحب گویا ہوئے

”ارے راؤ صاحب الیکٹرم ٹرسٹ اس خادم کا ہی ہے بزرگوں کی خدمت کے لیے حقیری کوشش میں لگے ہیں تو اس لحاظ سے ہم آپ کے پڑوسی ٹھہرے۔“

حاجی صاحب توقف کے بعد پھر بولے۔

”اور اس حق کے ناتے تو آپ کا کام ارجنٹ ہی کرنا پڑے گا“

اتنی دیر میں چوکیدار نے اندر آ کر راحیلہ بی بی کی آمد کی خبر دی۔

”ہاں میں نے ہی بلایا تھا شیر خان یہ رقم صدقہ و خیرات کی ہے ان خاتون کو دے دینا“

حاجی صاحب نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا لفافہ شیر خان کو تھمایا

”پیسے کی سرکولیشن بھی تو لازمی ہے ناں جی“

راؤ داؤد کی طرف متوجہ ہوئے حاجی منصور نے ایک بار پھر فائل پر نظر جمائی۔

”دستاویزات تو مکمل ہیں بس کچھ رقم درکار ہوگی۔“ یہی کوئی کم و بیش دو لاکھ کا خرچہ آئے گا“

”دو لاکھ!“ راؤ داؤد نے حیرانگی سے پوچھا۔

”بادشاہو اتنا تو لگ ہی جاتا ہے قانونی کارروائیوں میں!“ حاجی صاحب موبائل سے نظریں ہٹا کر فوراً بولے

”بجائے مایا لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے اس کی بہت مناسب فیس ہوتی ہے“ راؤ داؤد کے ماتھے پر پڑتی پریشانی کی لکیریں واضح تھیں۔

”چیف صاحب! ہمارا بھی تو کچھ خیال کریں..... میرا مطلب ہے ہمارے دانہ پانی کا..... آپ سمجھا رہے دیکھتے ہیں“ حاجی منصور نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا ”یہ دیکھ رہے ہیں ہر لفافہ دو لاکھ سے اوپر کا ہے آپ ہمارے پڑوسی ہیں یہ تکلف بھی کوئی اور نہیں کرتے گا۔ قانونی کارروائی میں پریشانی الگ!“

راؤ داؤد کو اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ ششدر بول پڑے۔

”حاجی صاحب آپ جیسے پرہیزگار خدا سے محبت کا نشان آپ کے ماتھے پر چمک رہا ہے آپ کہاں ان رشوت کے چکر میں پڑ گئے“

”نماز میرا دین پیسہ میری عبادت“ یہ کہتے ہوئے حاجی صاحب کا بے حس سے بھرپور قبضہ

کمرے میں گونجنے لگا۔

☆.....☆

دو گھنٹے سے زائد آپریشن کو ہو چکا تھا۔ مسز منصور اور حاجی منصور بھی پٹلوں کے ساتھ مستقل مصلے پر دعاؤں میں مصروف تھے تیز دھڑکن، مختلف خدشات اور دوسرے بے چینی و اضطراب کے ساتھ کبھی گھڑی کی سوئیوں پر نظریں پر نظریں نکاتے، تو کبھی تھیمز کے دروازے پر نگاہیں مرکوز کر لیتے۔

آخر کار چار گھنٹے کے طویل تکلیف دہ انتظار کے بعد آپریشن تھیمز سے ڈاکٹر برآمد ہوئے۔  
”حاجی صاحب تقریباً دوڑتے ہوئے ان کی جانب لپکے۔

”کیسا ہے میرا احد؟“

”ڈاکٹر صاحب ٹھیک تو ہے تا میرا بیٹا؟“ مسز منصور نے بھی بیٹائی سے پوچھا۔

”مبارک ہو آپ کے بیٹے کی جان بچ گئی..... بہت خطرناک چوٹیں آئی تھیں“

ڈاکٹر کی بات سن کر خوشی سے دکتے چہرے کے ساتھ ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے مسز منصور نے بے صبری سے پوچھا۔

”ہم کب ملاقات کر سکتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے گہری نگاہ دونوں پر ڈالی اور لمحے کے توقف کے بعد بولے

”کافی گہری چوٹیں آئی تھیں خدا کا خاص کرم ہوا کہ جان بچ گئی لیکن.....“

ڈاکٹر نے حاجی صاحب کے شانے کو تھپتھپایا  
”آپ کو بہت ہمت و حوصلہ دکھانا پڑے گا“

”کبھی میں سن رہا ہوں.....“ حاجی صاحب کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔

”بہت کوشش کی ہم نے..... لیکن“

☆.....☆

’حاجی صاحب جلدی ہسپتال پہنچیں احد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے‘ مسز منصور نے روتے ہوئے فون پر اطلاع دی۔

نئے سنتے ہی حاجی منصور کے پیروں تلے زمین کھسک گئی اور فوراً وہاں پہنچ گئے۔

احد حاجی منصور اور مسز منصور کا اکلوتی اولاد تھا حاجی منصور اسٹیٹ ایجنٹ اور ان کی بیوی رشتے کرایا کرتی تھیں خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا پیسے کی ریل پیل تھی احد ان کی زندگی کا اصل مقصد اور جدوجہد تھا آج اس کے ایکسیڈنٹ نے دونوں کے سروں پر سے گویا آسمان کھینچ لیا تھا۔

”حاجی صاحب دیکھیں نا ہمارے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟“ ڈاکٹر ز کچھ نہیں بتاتے “ مسز منصور حاجی صاحب کو ایمر جی میں اتار دیکھ کر ان کی جانب لپکیں۔

”کہاں..... کہاں ہے میرا احد؟ کیا ہوا اسے؟“

حاجی صاحب نے تقریباً دوڑتے ہوئے تھیمز کے باہر سے اندر جھانکنا چاہا۔ لیکن کچھ نہ پا کر مڑے اور سامنے صوفے پر بے حال بیوی کو دیکھ کر خود کو سنبھالتے ہوئے اس طرف بڑھ گئے۔

”کار بے قابو ہو کر ہائی وے پر ٹریلر سے ٹکرا کر کھائی میں جا گری تھی“ مسز منصور نے کہنیوں کو گھٹنوں پر ننگے سر پکڑے دھیرے سے بولیں۔

حاجی صاحب نے خاموشی سے سنتے ہوئے تھیمز کے دروازے پر گہری نگاہ نکالی اتنی دیر میں باہر

آتی نرس دکھائی دی تو دونوں اس کی جانب دوڑے۔  
”آپریشن چل رہا ہے آپ دعا کریں“

معنوی سی تسلی دیتے ہوئے نرس تیزی سے وارڈ سے باہر نکل گئی۔

# غزل

حمیدہ سحر

اگرچہ رستے میں خطرہ افتو ہوتا ہے  
مگر یہ دل غم و اندھ میں بھی شاد ہوتا ہے

بھروسہ کیا کرے کوئی اب ایسے ہر میں آخر  
جہاں پر باغیوں کے روپ میں صیاد ہوتا ہے

جو ممکن کو ممکن کر دکھائے ہر نلنے میں  
نگاہ عہد نو میں بس وہی فریاد ہوتا ہے

جو بارغ کو بوس بوس کر اٹھاتا ہے نلنے میں  
ہر اک غم سے نلنے کے وہی آزلو ہوتا ہے

جو لہو کے لیے جیتا ہوا نیا میں نہ جانے کیوں  
وہی لیتا ہے، متا ہے وہی بیلو ہوتا ہے

حمیدہ سحر میں اس کی حالت کیا کہوں  
کبھی تو شاد ہوتا ہے کبھی ناشاد ہوتا ہے

☆☆☆

توقف کے بعد ڈاکٹر پھر بولے۔

”احمد کی زندگی بچانے کی خاطر دونوں ٹانگیں  
کاٹی پڑیں۔ کچھ دیر میں آئی سی یو میں شفٹ کر دیا  
جائے گا پھر آپ جاکیں گے۔“  
یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر آگے بڑھ گئے۔

حاجی منصور یہ سنتے ہی سکتے میں آگے وہ ایک  
قدم پیچھے ہوئے اور لڑکھڑاتے بے جان وجود کو  
دوبار سے ٹکرا کر دھائیں مارتی بیوی پر نظریں  
جمالیں۔

”حاجی صاحب! یہ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ  
ہمارے بیٹے کے ساتھ“ مسز منصور کی سسکیاں ان  
کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

”ہائے ہم تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا خدمت  
خلق، صدقہ خیرات، عبادتیں کچھ بھی ہمارے بیٹے  
کے حق میں قبول نہ ہوا۔“ مسز منصور بین ڈال  
رہی تھیں۔

”ہم نے تو کبھی کسی کا حق نہیں مارا۔ حق تلفی  
نہیں کی پھر بھی ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو گیا؟“  
”حق تلفی۔“ حاجی صاحب ہنسنے لگے

”حاجی صاحب کمال کرتے ہیں آپ بھی  
کلائنٹ کے کام کے لیے جارہی ہوں تو کراہی بھی  
اس سے ہی وصول کروں گی بھلا مجھے کیا ضرورت  
ہے پورج سے گاڑی نکالوں اور پٹرول جلاؤں“  
حاجی منصور کے کانوں میں مسز منصور کے پرانے  
الفاظ کو بجنے لگے۔

”گڈیاں، لفافے، حق تلفی۔“ کڑیاں  
ملاتے ہوئے اچانک ان کو جھٹکا لگا وہ وہیں فرش  
پر ڈھے گئے اور خالی ٹکا ہوں سے مٹھیاں بچھ کر اپنا  
سر ہاتھوں پر گرایا۔

☆☆☆



## بادِ سموم

قسط 5

چولستان کے صحرا سے شروع ہونے والی ٹھنڈی اور میٹھی  
محبت اور لمحہ بلتی داستانِ حیات جو پڑھنے والوں کو اپنے  
سحر میں جکڑ لے گی!

بیل شاہ کے ملک سلطان احمد کی حویلی کا ایک موسم ایک مزاج تھاڑکوں کی تقسیم، گودام میں خال کی  
سلائی، فصلوں کی کٹائی سے لے کر منڈی میں داموں کی ادھنچ بچ تک ایک تھکا دینے والا سلسلہ تھا۔ موسیٰ  
خان کو اس کے پاس کام کرتے کرتے کئی موسم بیت چکے تھے لیکن بے چینی کی فضا ہنوز برقرار تھی۔ کچھ عرصے  
سے کام میں دل نہ لگتا تھا کمرے کے اندر وہ گھنٹوں چارپائی پر لیٹا چھت کو بے وجہ گھورتا رہتا جیسے وہاں  
نقوش بہتے اور مینے چلے جا رہے ہوں۔ ایسے نقوش جو کز رے کل کی اساس رکھے اُس کا سرمایہ تھے۔ یادوں  
کے امین تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی رانخوتی اٹھالیتا۔ یہ رانخوتی اُسے بہاول جان نے دی تھی وہ جانتے تھے کہ موہل  
کی جدائی نے ان کے بیٹے کے دل پر جو کاری وار کیا ہے رانخوتی کے سر اُسے اپنے اندر سمولیس گئے وہ شام  
گئے اُس کے سروں سے کھلیتا تھا اور کبھی کبھی اس کے سروں میں الجھ کر اپنا آپ بھی بھول جاتا۔ عمران،  
صادق، مہران، جمال کئی ایک سنگی بیلی تھے جن سے وہ ایک عرصے سے رابطہ میں تھا۔ لیکن اب وہ اجنبی سے  
لگتے تھے جیسے اُسے جانتے نہ ہوں سمجھتے نہ ہوں بیل شاہ کا ایک ایک حصہ اُسے خود سے نا آشنا محسوس ہوتا تھا  
عمران اُس کے روز بروز بدلتے ڈھنگ دیکھ کر ایک شام مردان خانے کے اُس حصے کی جانب آنکلا جہاں  
موسیٰ کا قیام تھا۔ عمران نے اُس کے ہاتھ سے رانخوتی لے کر ایک طرف رکھ دی۔ ”دنیا حسین ہے  
دوست! خود کو اذیت کے سمندر میں نہ رہنے دو۔“ ..... ”دل دیران ہے اور خواب اذیت ناک جائے پناہ پھر  
جوانی اور خُسن کہاں نظر آئے!“ موسیٰ خان کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایک خوبصورت  
جوان روز بروز زوٹ رہا تھا خود سے جدا ہو رہا تھا۔



”اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود گم ہو چکا ہوں دوست، اب تو یہی لگتا ہے جیسے وہ شاید کبھی مل نہ پائے گی!“ موئی خان کا لہجہ دھیرے دھیرے نرم ہو رہا تھا۔ ”میں سمجھتا ہوں سب کچھ، دو کھجی جو تم کہہ نہیں پاتے۔ دیکھو تلاش کا سفر جاری رکھنا اس امید کے ساتھ کہ منزل کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ لیکن اُسے ڈھونڈنا شرط ہے“ عمران نے دھیرے سے موئی خان کے کان دھوں پر ہاتھ رکھا اُس روز وہ اُسے سبز بازار لے گیا۔ موئی خان کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ بھی تھا یہاں تھا۔ عمران صبح کہتا تھا شاید اب بھی جتنی تھیں۔ فضاؤں میں اب بھی سرگوشیاں بلند ہوتی تھیں سُر اور بے جا گتے تھے اور دل ان کے ساتھ دھڑکتے چلے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اُسے اس کا شعور نہیں رہا تھا احساس نہیں ہوتا تھا وہ اب بھی عمران کے ساتھ اور کبھی تنہا اکثر یہاں آ لگتا۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ اُسے حسین چہرہ اور دلکش رنگوں میں ڈوبے سروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ اُس کا دل تو فقط مدھرتا توں اور ان کے ساتھ لیوں سے نکلنے والی غزل کے بولوں میں ہی انکار جاتا تھا جن میں فراق کے دکھ کو خوب صورتی سے بیان کیے جانے کے ساتھ ساتھ وصل کے کیجرات کے گہمی پہروں قصبے چلے تھے۔ اُسے لگتا تھا جیسے سرخ لیوں سے نکلنے والی غزل میں ڈھلے باد صبا سے سفر تو دراصل اُس کی دھڑکن کی صدا نہیں ہیں جو غزل بن کر پوری فضا میں گونج رہی ہیں۔ وہ مستی سے آنکھیں بند کر کے اپنا سر دیکھی گاؤں تکیے پر ٹکا دیتا اور دیکھنے والے اس گہری آنکھیں رکھنے والے اداس اجنبی کی حالت پر بے اختیار ہنس کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اجنبی شاید کسی ایسی حسینہ کے دام الفت میں گرفتار ہے جس کا دل کسی اور کے دل کے ساتھ پیوستہ ہے۔ لوگ کیا کیا سوچتے تھے اور کیا کیا نہیں موئی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ تو یہاں آ کر بے خود ہو جاتا تھا اپنے آپ سے بھی بے نیاز جیسے کسی غزال کے پیچھے بھاگتے بھاگتے دور نکل آیا ہو اور اب واپسی کے لیے راستہ بھول بیٹھا ہو۔

فیض محمد علی پور کے رئیس اور وزیرے حسن علی کا معتد خاص تھا اور گھنگھر و بازار کی بیلا علی حسن کی منظور نظر۔ جس کی ایک ایک ادارہ اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار رہتا۔ اور کبھی کبھی مستی میں آ کر خود کو بھی بھول جاتا۔ علی حسن کی اس دلربائی کی وجہ محض بیلا کا حسن ہی نہیں، اُس کا دانا ذہن سوچنے سمجھنے کی عمدہ صلاحیت اور نرمی سے کندھا جذبات سے معمور دھڑکن دل بھی تھا یہی چیز اُسے اپنی باقی ہم جھولیوں سے ممتاز بناتی تھی جو جاندار ہونے کے باوجود محض رنگوں اور خوشبوؤں میں بسی کٹھ پتلیاں تھیں اور بس اہفتہ میں ایک بار یہاں آ کر بیلا کی ایک جھلک دیکھنا رئیس علی حسن کے معمولات میں شامل تھا گاؤں کی یہ انتہائی کمی کہ اگر خود نہ آ سکتا تو فیض محمد کے ہاتھوں بیلا کے لیے خصوصی تحفے اور تانیکے بھول بیگم کے لیے رسمی رومال میں بندے نئے نوٹ اس عہد کی تجدید کے لیے بھجوا دیتا کہ بیلا اُس کے سوا کسی کے سامنے رقص کا مظاہرہ نہ کرے گی یہی وجہ تھی کہ بیلا ہفتہ کے سات یوم اپنے کمرے میں آئینہ کے روبرو گزارتی اور صرف اسی دن اُس کے قدم کمرے کی دلیہز کو چھوتے تھے جس دن علی حسن یا اُس کا قاصد فیض محمد وہاں آتا تھا۔

موئی خان تو زیادہ تر ایک کونے میں بڑا خود میں کھویا رہتا تھا کون آتا تھا، کون نہیں اُسے اس بات سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور نہ ہی اُسے یہ خبر تھی کہ اس جگہ کون کون سی حشر مامائیاں موجود ہیں۔ یہ تو فیض محمد کا ہاتھ تھا جس نے درحقیقت دوستی کی ابتدا کی تھی۔ موئی خان چند عاینے اپنے سامنے کھڑے اجنبی کو دیکھتا رہ گیا اُس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر بیلا کھڑی تھی۔ طبلہ کی تھاپ تھم چکی تھی۔ گھنگھر و چکر کھاتے کمرے کے



پیچھے گم ہو چکے تھے، جب اُس نے آنکھ اٹھا کر بیلا کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھا۔ سنا ہے روز یوں ہی شام ڈھلے آتا ہے اور پھر شب گہری ہونے سے قبل جھکے جھکے قدموں کے ساتھ یوں چل دیتا ہے جیسے اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو۔ بیلا فیض محمد سے مخبر گفتگو بھی جو کچھ دیر قبل بی علی حسن کا پیغام خاص لے کر یہاں پہنچا تھا اُس سے اس نوجوان کی آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ساتھ عجیب قسم کی وحشت محسوس ہوئی۔ اُس نے اپنا دہانا ہاتھ اُس کے کاندھے پر رکھ کر نرمی سے چھوا۔ ”تم پریشان دکھائی دیتے ہو جوان، جبکہ یہاں آنے والے تو اکثر روئے چہرے بھی جیسے ہوئے پیکرین کر رخصت ہوتے ہیں آخر ایک کونے میں گم مگم بیٹھے تم کیا سوچتے رہتے ہو؟“ موسیٰ خان کی اداس آنکھوں میں شام اترنے لگی۔ ”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ سبز بھاٹا اتارنا لگی۔ کٹور غائب ہو گیا۔ دوسری شام بھی بازار کی روشنیاں پوری طرح درجیوں پر داغ بھی نہیں ہوئی تھیں جب فیض محمد کی جیب دھول میں لپٹے ہوئے چچراتے ہاتھوں کے ساتھ ہاتھ اتر کے در پر آ کر رک گئی۔ آج وہ نہ تو بیلا کے لیے تحفے لے کر آیا تھا اور نہ ہی علی حسن کا کوئی پیغام۔ آج تو وہ فقط اس نوجوان سے ملنے آیا تھا جسے گزشتہ شب اُس نے دیوانوں کی سی حالت میں یہاں بیٹھے پایا تھا۔ غصے کے بول کیا تھے گویا اُس کے دل میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے تھے، بے اداس بھی اور گھٹکروں کی کھٹک میں بھی دھیسے انداز میں ادھر ادھر پھیل رہی تھی۔

”اے میرے مسمل۔ اے اونٹ کی موڑ مہار لوٹ آ۔ لوٹ آ۔۔۔۔۔“ بول جانے کب تک جاری رہے۔ طلبے کی تان پر انگلیاں تھکنے کے باوجود آشتی رہیں۔ ایک کے بعد دوسری غزل شروع ہو گئی تھی اور وہ سرد چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا ان الفاظ کے گھیراؤ میں الجھ رہا تھا۔ اپنے بے چین اور سرکش جذبات سے ہمیشہ کی طرح تنہا بیروں آ رہا ہوتا ہوئے تھک رہا تھا۔ یہ ہی وہ لمحہ تھا جب فیض محمد نے اُس کی دستھی رگ پر ہاتھ رکھا اور اُس کے جلتے دل پر مرمم جیسے الفاظ کا پچھا۔۔۔۔۔ جانے یہ چند لمحات بیشتر اداس تان پر بکھرنے والے نغمہ کا اثر تھا یا فیض محمد کے جذبات کی گرمی کہ وہ اپنے احساسات کی حدت میں خود کو پھلتے ہوئے محسوس کرنے لگا اور پھر یوں ہوا کہ اکثر دونوں وہاں آ کر ملنے لگے اب نغمہ سنتے ہوئے اُس کا دل اندر ہی اندر تڑپتا نہیں تھا بلکہ اپنے سامنے کے ساتھ وہ ڈھیروں لمحے یادوں کے سیپ میں گلاب لمحے تلاش کرتا رہتا اور یوں وقت گزر جاتا اور جاتے جاتے اُس کا دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

”کیا تم نے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی؟“

ایک دن فیض محمد نے مخمل برخواست ہونے سے قبل پوچھا تو موسیٰ کے چہرے پر حزن کی برسات ہونے لگی۔ یہ وہ سوال تھا جس کے جواب کے لیے اُسے عرصہ درکار تھا کہ لا حاصل کے پیچھے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہی تو اس حال تک پہنچا تھا۔ پھر۔۔۔۔۔ وہ اس لمبی خاموشی کا مفہوم سمجھ گیا۔۔۔۔۔ موسیٰ اداسی سے ہنس دیا۔ ”اب تک تو گرورہا ہی چھان رہا ہوں دوست“ اس نے فیض محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں میں نے اُس کے پیچھے دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے گزار دی ہیں کہ اب تمام ہمتیں جواب دینے لگی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دل کی دھڑکنیں دھیرے دھیرے اب اپنی طاقت کھو رہی ہیں وہ نہ بھل شاہ کے گھنے درختوں تلے جائے پناہ نظر آتی ہے اور نہ صحرا کی جانب اٹھتے راستوں میں“ وہ اداسی سے مسکرایا۔ ”ملک سلطان کے آدمی میری بدلتی حالت سے خوب واقف ہیں۔ لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے مجھ میں



ان کا ایندھن بننے کے لیے پہلی سی قوت نہیں رہی۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ وہ سب مجھ سے بیزار دکھائی دیتے ہیں۔“ اُس کے دھیرے دھیرے ہلنے لب اب بالا خیر خاموش ہو گئے تھے۔ فیض محمد چند لمحے اُسے ٹکتا رہا۔ ”اگر تمہیں گراں نہ گزرے تو میرے ساتھ علی پور چلو۔ وہاں تمہیں رہائش کے ساتھ ساتھ کام بھی مل جائے گا اور شاید وہاں تمہاری تلاش بھی زندہ ہو جائے گی ایک نئے رُخ اور نئے دلوں کے ساتھ۔“

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سیکنے ماں کا بیٹا زمان اُس کے پاس بیٹل شاہ آ گیا۔ موسیٰ خان نے اپنا اوٹ اُس کے حوالے کیا تو وہ حیرت سے اس کا منہ کتکتا رہا گیا۔ ”کیا بات ہے زمان تم پریشان دکھائی دیتے ہو؟“

”یہ سب کیا ہے موسیٰ خان؟“ وہ ہٹکایا۔ موسیٰ کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا زمان“

”لیکن تم میرے ساتھ وطن کیوں نہیں چلتے؟“ موسیٰ اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ ”ماں پریشان ہے موسیٰ۔ اور یہ ہے اُس نے کسی کا لہجہ بھی تیار کر لیا ہے اور اب وہ آپ کی منتظر ہے۔“ وہ رک رک کر بول رہا تھا موسیٰ خان کی سانسیں تھم سی گئیں۔ اُس نے اوٹ کی کوہان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زمان کو ایک لمحے کے لیے دیکھا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا ”ماں سے کہنا میرا کچھ یہ نہیں“ ”آؤ زندہ ہم بھی“ ”کیوں؟ کیا وطن واپس لوٹنا تمہیں منظور نہیں؟“ موسیٰ خان خاموش رہا۔ جواب اُس کے پاس تھا کہاں..... ”جب شام ڈھلتی ہے اور خاک اڑانی ہے تو کسی ہرگز زنی گھڑی کے ساتھ باہریوں جھانکتی ہے جیسے تم جج جج دہنی دہنی میں اوٹ کی مہاریں تھامے چلے آ رہے ہو اور جب دو پہر ڈھلتے ہی شام کے سنائے گہرے ہوتے ہیں اور ماں دیا جلاتی ہے تو اس کی آنکھوں کا دیا بجھتا چلا جاتا ہے۔ کتنے عجیب ہوتے ہیں یہ دل کے معاملے“ زمان خان پکا چہرے پر باندھ کر دھیرے سے اوٹ کی کوہان پر کھڑے کئے لگا۔ ”چل صحرا کے شہزادے، موسیٰ کے سادا پھرے وطن کی جانب رخت ستر باندھ لے“ اوٹ ایک ہی لمحے میں بل کھا کر کھڑا ہو گیا اُس کی گردن یوں جھکی ہوئی تھی جیسے موسیٰ خان سے جدائی پر احتجاج کر رہا ہو۔ زمان نے اُس کی مہاریں تھام کر جانے کو قدم بڑھائے تو موسیٰ خان کو یوں لگا جیسے اُس کا اوٹ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا ہو۔ اس لمحے دکھ کا ایک نیا احساس تیر کی مانند اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اُس کا اور موسیٰ کا بیس برس کا ساتھ تھا۔ ابھی بچہ ہی تو تھا جب بہاول خان نے اُسے اُس کی ماں سے جدا کر کے موسیٰ کے حوالے کر دیا تھا اور جس کی کوہان پر وہ مول کو بٹھائے دور تک نکل جاتا تھا تب مول کی ہمراہی میں اُس کے گلے میں بچنے والا ٹل اُسے کسی خوبصورت ساز کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ جو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے گزر جاتا تھا اور اب یہ جس بن کر جدائی کے احساس سے اُس کے من کو بھر گیا تھا۔ زمان چاچا کا تھا لیکن جس کی صدا اب بھی گونج رہی تھی اُس کی سماعتوں میں، اُس کی سوچوں میں شاید ہر جگہ۔

پھر اگلے ہی دن اُس نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور فیض محمد کے ساتھ علی پور کے لیے رخت ستر باندھ لیا۔ فیض محمد کا گھوڑا تیر بھی تھا اور چست دوتا نا بھی۔ دن ہی دن میں وہ بہاد پور کے علاقے سے نکل کر سندھ کی حدود میں داخل ہو گئے اور جب چاند بادل کی اوٹ سے نکلا تو وہ علی پور میں داخل ہو چکے تھے موسیٰ کو یکدم اپنے اندر ایک واضح تبدیلی کا احساس ہوا۔ دل ایک نئے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

.....☆.....



گرم اور طویل دنوں کا آغاز ہوا تو مول کو وقت کے گزرنے کا تیزی سے احساس ہوا۔ جانے کتنے بہت سے دن گزر گئے تھے کہ شمار ہی نہ کر سکتی تھی صرف اتنا جانتی تھی کہ دلاور خان کے ڈیرے میں آئے یہ چوتھا گرم موسم تھا اب تو فیروز اور شہزادی کو بھی گئے رہتیں بیت چکی تھیں اُسے اپنا سر پا بھی بدلا بدلا دکھائی دینے لگا تھا۔ اب نہ پہلے کی طرح گھٹنوں کو چھوتے بال تھے نہ کندن کی طرح دکتے عارض نہ آنکھوں کی ستاروں کو خیرہ کرتی چمک باقی رہی تھی اور نہ یا تو فی لیوں کی جادوئی مسکراہٹ۔ دبلا پتلا نازک بدن اب بھر چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود کو دکھائی دینے میں دیکھ کر اداسی سے ہنس دیتی اور کہیں دور اندر سے آواز آتی۔ ”میرے موسیٰ تمہیں کیا خبر تمہاری غزال کیا ہے کیا ہو گئی ہے کہ تمہاری مول اور اس شکستہ وجود میں تو کوئی قدر مشترک نہیں رہی۔ سچ ہے کہ اندر کے زخم انسان کو حسن کو دھیرے دھیرے چاٹ جاتے ہیں اب تو شاید تم مجھے دیکھ کر پہچان بھی نہ پاؤ۔“ یہ سوچ کر مول کے جسم میں بے چینی کی لہریں کروٹ لینے لگیں۔

”اور جانے وہ خود کیسا ہوگا۔ ویسا ہی لمبا چوڑا، گندی رنگت والا موسیٰ جس کے اٹھتے ہوئے قدم دیکھ کر صحرا کی سرزمین مسکراتے لگتی تھی اور جیسے اُس کے تعاقب میں سورج و چلتا چلا جاتا تھا۔ ایسا واقعی تھا یا نہیں کم از کم مول کو تو یہی محسوس ہوتا تھا۔“ ہمارے جذبے وہ سارے احساسات اب بھی زندہ تھے کو وہ نگاہوں سے دور جانے کہاں تھا، کیا تھا، کیا کرتا تھا؟“ مول کے تصورات اب بھی اُس کا یوں ہی تعاقب کرتے تھے جیسے وہ اس کے پاس ہو۔ نظروں کے عین سامنے۔

جاگتے میں دیکھے جانے والے خواب بھی عجیب ہوتے ہیں پانی کے بلبلیوں کی طرح چند گھڑیوں کے مہمان! اور آدیں گینوں سے زیادہ نازک جو جب ٹوٹتے ہیں تو بڑی آسانی سے روح تک زخمی کر ڈالتے ہیں۔ مول کے خواب تو روز ہی ٹوٹتے تھے اور روز ہی بنتے تھے اب وہ جیسے جان بوجھ کر اپنے زخموں کو کھرچتی تھی کہ اب اُن اپورنگ خوابوں میں اذیت کے ساتھ ساتھ اُس کے لیے رہائی بھی تھی اداس صاحبان کا خیال بنانے اور غالباً خود کو چند لمحوں کے لیے یہاں سے دور لے جانے کے لیے اب وہ دلاور خان کی غیر موجودگی میں اکثر موسیٰ اور کسی کا ذکر لے لیتی تھی اپنے محبوب کا محبت سے ذکر کرتے کرتے اُس کی اداس آنکھوں میں بادل سے تیرنے لگتے۔ اب تو کچھ دنوں سے بڑی بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گئی تھی کبھی وہ اُن کی سنی اور کبھی انہیں سناتی۔ یہ تو مول کو اب علم ہوا تھا کہ بڑی دلاور خان کی پچازاوتھی جس کی شادی 26 برس قبل دونوں کی مرضی کے خلاف ہو گئی تھی اور یہ خاندان کا وہ فیصلہ تھا جسے دونوں نے قبول کر لیا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ وہ تب سے اب تک اپنے ذہنک اور مزاج کے مطابق زندگی گزار رہا تھا۔ دوسو مہینے لاچکا تھا اور بڑی..... اُس کی زندگی بھلا کس سے ڈھکی چھپی تھی سمندر کی سطح کی طرح بظاہر خاموش اور ساکت نظر آنے والی بڑی کے سینے میں چھپا طوفان ہر دم متلاطم زندہ رہتا تھا۔ شہزادی کی موت کے بعد آنے والا ہر دن اُس کے لیے بہت ناقابل یقین ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو وہ رات کو بھی نہ سونہ پاتی اور کروٹیں بدل بدل کر ساری شب بٹا دیتی۔ نہ جانے پہلے کی نسبت بے چینی اس قدر بڑھ کیوں گئی تھی۔ فیض اور قیصر بھی اب گھر میں کم ہی نکلتے تھے سارا سارا دن ریت اور مٹی کے ٹیلوں میں کھیلتے رہتے رات ہونے پر بھی انہیں زبردستی گھر کی جانب لانا پڑتا۔ اُس روز تو چھوٹا فیضی جنگل کی طرف نکل گیا تھا غالباً کیوٹر کا ٹیل میں شکار کرنے وہ تو شکر ہے کہ شہباز نے اُسے بروقت دیکھ لیا تھا ورنہ گھنا اور خوفناک جنگل نختے سے بچنے کو اپنی بھول بھلیوں کا نشانہ بنا

ڈالتا۔ صاحبان کو اس بات کا علم ہوا تو وہ دیر تک چھوٹے بھائی کو سینے سے چمٹائے پیار کرتی رہی گو کہ شہباز اب بھی اپنے فرائض پوری تندہی اور ایمانداری سے انجام دے رہا تھا تاہم کبھی کبھی صاحبان کو لگتا جیسے وہ کام کوئی کر رہا ہے اور سوچ کچھ اور طرف ہے۔ پہلے کی نسبت اب خاموش بھی ہو گیا تھا۔ فقط کام کی بات کرتا اور پھر اگلے راستے پر ہولیتا۔ کبھی کبھی صاحبان کا سامنا ہوتا تو کچھ کچھ کہتے کہتے اپنے لب بھینچ لیتا۔ نہ جانے کیا بات تھی جو اس کے دل میں راز بن کر پل رہی تھی۔ کبھی کبھی تو صاحبان کو اس کا رویہ پریشان کر ڈالتا۔

جولائی کی ایک چتھی دو پہر اس فضا میں پے در پے بندوق کی دل دھڑکا دینے والی آواز گونجی تو سہم کر صاحبان نے مول کے آنچل میں منہ چھپا لیا۔ ”شاید خان آ گیا ہے۔“ مول نے چادر سے سر کو ڈھانپ لیا۔ ”مگولیاں چلتی رہیں لیکن بڑا دروازہ بند رہا۔“ جانے باہر کون تھا اور وہاں کیا کر رہا تھا مول نے صاحبان کو قہام لیا۔ ”اگر خان نہیں آیا تو پھر یہ کون ہے جو یوں فائر کر کے ہمیں سراپمہ کر رہا ہے، صاحبان ٹو جھرو کے سے دیکھ تو سہی۔“ صاحبان تپتے فرش پر ننگے پاؤں دھرتی دروازے تک گئی اور جھرو کے سے باہر جھانکا لیکن دور درو تک کسی کی آمد کے نشان تک نہ تھے ہاں ایک طرف شہباز کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بڑے سا تزکی رائل تھا اور وہ اپنی انگلی نرائنگ پر رکھ کر جیسے ہٹاتا بھول گیا تھا۔ اُسے یوں دیکھ کر صاحبان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ”کون ہے باہر؟“ مول اب تک وہیں کھڑی اُس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ ”شہباز ہے چھوٹی ماں“ صاحبان کے چہرے پر پریشانی ہو رہی تھی۔ ”جانے اسے کیا ہو گیا ہے پہلے تو اُس نے کبھی یوں بندوق نہیں چلائی“ وہ جیسے خود سے گویا تھی مول نے گہرا سانس لے کر اطمینان کا اظہار کیا اور واپس اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔ صاحبان ہنوز جھرو کے سے لگی کھڑی تھی کچھ دیر کے بعد اُس نے ہمت کر کے شہباز کو صدادے ڈالی وہ تو جیسے اسی کی آواز کا منتظر تھا۔ رائل کا منہ صے سے لٹکا کر اس نے صاحبان کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ ”یہ..... کیا ہو رہا تھا، شہباز تیرا داغ تو ٹھکانے پر ہے“ شہباز پچھلے بہت سے دنوں کی طرح فقط خاموش نگاہوں سے ٹکتا رہ گیا۔

”تم کیا سے کیا ہو گئے ہو شہباز نہ جانے کیا سوچتے ہو، کہاں گم رہتے ہو..... بولتے کیوں نہیں..... لگتا ہے جیسے تمہاری آنکھیں کیا کہنے کے لیے بے تاب ہیں“

شہباز نے جواب میں صاحبان کا ہاتھ قہام لیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ صاحبان کی رگوں میں گویا ٹھنڈک سی اتر گئی۔ اُسے لگا جیسے یک لخت وہ ایک کھلے میدان سے کسی پناہ گاہ میں آ گئی ہے اُس نے شہباز کی آنکھوں میں جھانکا جہاں گہرے سکوت کے ساتھ کہیں کہیں محبت کی موجیں ٹھانیں راری تھیں اور دھیرے سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا۔ شام کو دھند پھیلنے سے قبل آسمان پر سرخی چھا رہی تھی صاحبان کے چہرے پر پھیلنے والی شفق کی طرح اُس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے لیکن چند ہی لمحوں میں شہباز اُس کا بازو قہام کر اُسے بزر اور لال چوڑیاں پہنا چکا تھا اور جب چھن چھن کر کے انہوں نے اُس کے دل کا سکوت توڑا تو ایک خود ساختہ تبسم اُس کے لبوں پر پھیلنے لگا۔ اُسے دیوانہ بنانے لگا۔ اُس نے جلدی سے اپنے وجود کو چھپاتے ہوئے گہری سانس لی جیسے دلاور نہیں قریب ہی کھڑا ہے۔ یک لخت خوف کی دبیز چادر نے لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ کی جگہ لے لی۔ اس نے بے چینی سے شہباز کی طرف دیکھا جو لا پرواہی اور بے خونی سے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شام کی سرخی جیسے ڈورے لہرا رہے تھے یہ ایک نیا چہرہ جو صاحبان نے اُس لمحہ دیکھا ایک

پُر یقین اور خود اعتماد چہرہ تھا۔ اُس کے ڈولنے دل کو جیسے کنارہ مل گیا۔ رات ہوئی تو تمام خواب جاگ اٹھے۔ اوائل مہینے کا چاند تھا۔ ادھورا، بادلوں کے سایوں سے لپٹا ہوا، کہر میں ٹھٹھا ہوا لیکن چاندنی پھر بھی پھوٹ رہی تھی شاید یہ صاحبان کی نظر بھی کہ اُسے ہر چیز روشنی کے ہالے میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی خوشی گر دل میں گانگڑیں ہو تو اُس کی کریمیں کسی نہ کسی روپ میں پھوٹ ہی پڑتی ہیں۔ کبھی آنکھوں سے اور کبھی ہونٹوں کے چھپے ہوئے گوشوں سے۔ یہ ہی حال صاحبان کا تھا گو اُس نے اٹھتے ہی احتیاط سے سبز روشنی میں نہائی نکلتا پتی چوڑیوں کو ریشمی رد مال میں باندھ کر ماں کے پرانے صندوق میں چھپا دیا تھا تاہم دل کی رگوں میں بے چینی سے بہتے لہو کی روانی کیسے چھپاتی۔ دن بھر وہ اس کوشش میں رہی کہ شہباز سے سامنا نہ ہو پائے لیکن عجب بات تھی کہ وہ باہر نکلتی تو شہباز کو موجود پاتی اندر جاتی تو مول اُسے آواز دے کر مرغیوں کے ڈر بے کی طرف بھیج دیتی جہاں دانہ اٹھائے وہ مسکرائے چلا جاتا۔ تب مول کو احساس ہوا ایک تبدیلی کا جو نامعلوم احساس سے پنپ رہی تھی۔ ایک جذبے کا جو خاموشی سے سراٹھارہا تھا تاہم صاحبان کی طرح وہ بھی لب کشائی سے گریزاں تھی۔

اس مرتبہ دلاور خلاف توقع جلد لوٹ آیا۔ اب کے تمام سامان زیرِ تعمیر حویلی کے تہہ خانوں میں رکھ دیا گیا تھا۔ حویلی کا بقیہ حصہ بس کچھ ہی عرصے میں مکمل ہونے والا تھا۔ وہ شہباز کے ساتھ صبح سے شام تک سارا وقت وہیں بٹاتا۔ جنگل کی حدود میں تعمیر ہونے والی حویلی نے اب ذرا شکل نکالی تھی۔ قلعہ نماد یواروں پر سُرخ اینٹوں سے نقش و نگاری کی گئی تھی اور ان کے بیچ دو سیاہ گیٹ تھے اور ایک طرف کھڑوؤں کو باندھنے والا اصطبل تھا گو کہ یہ حویلی کی حدود میں تھا بظاہر اس کے اندرونی حصے سے مکمل طور پر علیحدہ تھا لیکن زیرِ زمین ایک راستہ ادھر کو نکلتا تھوڑے مردان خانے کے ساتھ چھوٹا سا زان خانہ بھی تعمیر کیا جا رہا تھا بظاہر الگ الگ لیکن ایک بل کھاتا راستہ اندر ہی اندر ان کو آپس میں ملاتا تھا۔ زنان خانے کی دیواریں مردان خانے کی بہ نسبت اونچی رہی گئی تھیں یہاں باقاعدہ کھڑکیاں نہیں تھیں بلکہ ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے روشن دان بنائے گئے تھے۔ جن پر نئین شیشے لگائے جا رہے تھے کچھ تہہ خانے بھی زیرِ تعمیر تھے یہاں آ کر شہباز کا ذہن بار بار بھٹکنے لگتا کبھی کسی طرف جائکتا اور کبھی کسی طرف تہہ خانوں میں موجود گول گول راستے مختلف زاویوں سے بنائے تھے جو جنگل کے اطراف میں یوں جائکتے تھے کہ ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نظر نہ آتا تھا گو یا یہ حویلی نہیں بھول بھلوں سے لیس ایک پہیلی تھی۔ شہباز ایک روز دلاور خان کے ساتھ باہر نکلا تو اُس نے کھلے آسمان کی جانب نظر دوڑاتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا، اندر کی ٹھٹھن سے اس کے اعصاب جیسے شل ہو گئے تھے۔ دلاور نے اُس کی حالت کو دیکھتے ہوئے فلک شکاف تہقہہ لگایا اُس نے اپنا بھاری ہاتھ شہباز کے کاندھوں پر رکھ دیا تھا۔ ”حویلی کیا ہے، کیسی ہے یہ راز صرف تم تک محدود رہنا چاہیے مجھے یقین ہے کہ تم پرانے گھر کی طرح اس کی حفاظت بھی کر دو گے۔ اب گھر بڑا ہے تو ذمہ داری بھی دو گئی ہوگی ہم جلد ہی یہاں آ جائیں گے تم خود کو کوئی ذمہ داریوں کے لیے تیار کر لو۔“

اگلے کچھ دن اور بھی مصروفیت لے کر آ گئے تھے کراچی اور حیدر آباد سے کچھ سامان حویلی کی تزئین اور آرائش کے لیے آ گیا تھا۔ 8 سالہ فیضی اور 10 سالہ قیصر کے لیے تو یہ سب کچھ بہت عجیب اور دلچسپ تھا وہ دن بھر مختلف چہروں کو یہاں آتے جاتے دیکھتے اور پھر گھر پر امن و عن بیان کرتے چلے جاتے شہباز اب



مصرفیت بڑھنے کے باعث زیادہ وقت باہری گزارتا تھا ویسے بھی دلاوران دنوں جنگل میں ہی تھا اس لیے صاحبان کو ملنا تو دور کی بات ہے دیکھنے کا بھی امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ صرف صبح کے وقت ضرورت کا سامان دہلیز پر رکھتا اور خاموشی سے لوٹ جاتا۔ صاحبان اندر سے اُسے چپکے چپکے تکتی رہتی بے تاب دل کی دھڑکنوں کو دبانے کی سعی کرتی رہتی جن نئے رنگوں میں شہباز نے اُسے رنگ دیا تھا وہ دھنک بن کر زندگی کی کڑی دھوپ میں کھل رہے تھے۔ نئے راستوں اور نئی منزلوں کا پتہ دے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر خوفزدہ ہو جاتی کہ جانے یہ راستے کیسے ہوں اور منزل دکھائی دے یا نہیں، مول اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی تو باضی پھر سے دھڑکن بن کر اُس کے پہلو میں بولتا چلا جاتا! وہ بھی تو موسیٰ خان کی محبت میں یوں ہی پود پور ڈوب سی جاتی تھی تب سسی اُسے دیکھ کر کتنا ہنستی تھی۔ چھوٹے چھوٹے شوخ نعروں سے اُس کے چہروں پر لالی بکھیر دیتی۔

جانے اب سسی کیسی ہوگی..... ایک ہوک سی دل لے اٹھی ہو سکتا ہے اُس کی شادی ہوگئی ہو شاید وہ ماں بھی بن گئی ہو، یہ سوچ کر جہاں اُس کا دل بے چینی سے دھڑکنے لگتا وہیں رگ و پے میں اماؤس کی رات جیسی تاریکی پھیل جاتی ایسی تاریکی جہاں چراغ نہیں ملتے جہاں صبح نہیں اترتی کرنیں نہیں پھونکتیں۔ اس لمحے اس کا دل صاحبان کے لیے دعا کو ہو جاتا۔ وہ جانتی تھی کہ محبت کی پرچہ راہ میں بھٹک جانے والوں کا کیا حال ہوتا ہے صاحبان 20 برس کی ہونے والی تھی اور بھلا کس کو خبر تھی کہ دلاور خان کے ارادے اُس کے بارے میں کیا تھے، ہاں اگر شہزادی ہوتی تو یقیناً بیٹی کے مستقبل کی خاطر بک کشتائی کی جرأت کرتی۔ بڑی کے دل میں جذبہ ہمدردی جس جوش سے سر اٹھاتا تھا دلاور کو دیکھ کر اُسی سرعت سے جھاگ بن کر بیٹھ جاتا۔ اُس کے ان کبے الفاظ اور شہنائیوں میں سوچے گئے دلائل جانے کہاں تحلیل ہو جاتے اور وہ کم صم صاحبان کو تنکے لگتی۔ کیا دلاور کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کیا وہ اندھا ہو گیا ہے، کبھی حیرت سے، کبھی تاسف سے اور کبھی نفرت سے وہ سوچتی رہ جاتی مول سے اُس نے اپنے وہم اور آنے والے ممکنہ حالات کا اظہار ضرور کیا تھا لیکن دلاور کے نزدیک اُس کی حیثیت ہی بھلا کیا ہی تھی محض ایک دل لگی کا کھلونا یا ایک بے جان پتلا اُس کی بے مائیگی کا اندازہ تو اسی سے لگایا جا سکتا تھا کہ دلاور اُسے کس آسانی سے اٹھالایا تھا اور کس طرح اپنے گھر کے ایک کونے میں لا پھینکا تھا کبھی وہ چپ چاپ صاحبان کی آنکھوں میں اترنے والے ستاروں کو تکتی اور کبھی شہباز کی وارنگی کو۔ وہ جانتی تھی کہ محبت کا دریا بہت منہ زور سہی لیکن جب اس پر بند باندھے جاتے ہیں تو اسے اپنا راستہ بدلنا ہی پڑتا ہے کبھی کبھی اُسے آنے والے ان دیکھے وقت کا خوف اپنی گرفت میں لے لیتا۔ اور وہ یہ سوچ کر لرز جاتی کہ اگر دلاور نے صاحبان کا ہاتھ اپنی ہی طرح کے ڈاکو یا شیرے کے ہاتھ میں دے یا تو کیا ہوگا۔ اب وہ آئینے میں اپنا خزاں مرد چہرہ دیکھتی تو ہنس آئینہ صاحبان کا چہرہ بھی ابھرنے لگتا۔ بے رنگ دنیا میں خوش رنگ پھولوں سے خواب اکٹھے کرنے والا چہرہ اور مول گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ ایسے میں اس کی روح کے اندر بہت سے درد جاگ اٹھتے تھے ان بے کیف اور بوجھل دنوں نے اُس دن کروٹ لی جب دلاور خان نے انہیں حویلی میں منتقل ہونے کی خبر سنائی۔ شہباز گھر کا کچھ سامان اور ہند صندوق پہلے ہی وہاں پہنچا چکا تھا۔ ان میں شہزادی کا وہ صندوق بھی شامل تھا جو صاحبان نے نظر بچا کر اُس کو تھما دیا تھا ورنہ دلاور خان اعلان کر چکا تھا کہ گھر کی کوئی پرانی چیز وہاں نہیں جائے گی۔ جمعہ کی شب وہ آخری شب تھی جو



انہوں نے اس گھر کی چھت تلے گزاری۔ بڑی اور صاحبان کی آنکھوں میں سے یادوں کے دیئے جل اٹھے تھے۔ آج پھر صاحبان کی آنکھیں ماں کی یاد سے نم ہو گئی تھیں یہ وہی کمرہ تھا جہاں سسکیاں بھرتے بھرتے بالا خیر اُس نے آخری سانس لیا تھا۔ باہر چاندنی رات میں بیگیا اور اداس آنگن تھا جہاں گئے نچے درختوں اور کچھ ننھے پودوں پر نظر آنے والے پتے ساکت اور ویران دکھائی دے رہے تھے یہ وہی آنگن تھا جہاں شہزادی کبھی صاحبان اور فیروز کو جھولے میں ڈالے لوری سناتے ہوئے سوچوں میں کھو جاتی تھی۔ یہاں کی مٹی میں اب بھی اُس کا لمس تھا۔ اُس کے قدموں کے نشان تھے۔ یہاں کی فضا میں اب بھی اُس کی سرگوشیاں تھیں، آہیں تھیں لیکن بے آواز رہنے والے آنسوؤں کی روم جھم تھی۔

صاحبان ایک جانب کروٹ لینے آنے والے دنوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ایک باب ختم ہو رہا تھا اور دوسرے کا صفحہ کھلنے والا تھا۔ دلاور خان دیر سے گھر لوٹا تھا اُس نے سنا وہ مول کے کمرے کے دروازے کو ٹھوکر سے کھول رہا تھا۔ ”بڑی جلدی سو گئی ہو، نیند کی متوالی رانی! اٹھو.....“ نئی بوتل نکال کر دو۔ بہت تھک گیا ہوں۔ پیوں گا تو آرام آئے گا۔“ مول کو لگا جیسے یہ آواز نہیں تھی بلکہ گرم تپا ہو کر اُوکی سیال مادہ تھا جو اُس کے کانوں میں الٹ دیا گیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ کاہل سے بے نیاز آنکھوں میں لال ڈوبے تھیر رہے تھے۔ اُس کا لباس شکن آلود تھا۔ دلاور کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔

الماری میں بوتل نہیں تھی۔ نساو پر نہ نیچے، وہ بے بسی سے پلٹ کر اُسے دیکھنے لگی۔ ”نہیں ملی خان!“  
 ”نہیں ملی؟ یہیں تو رکھی تھی۔ پرسوں میں نے۔“ آنکھیں کھول کے دیکھ۔ اپنے دیدوں کو ہلا خلا۔“ بوتل ہوتی تو نظر آتی، وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ خالی خالی درازیں تھیں یا پھر چند لٹکے ہوئے پرانے بیگر۔ وہ پھر بھی اندر ہاتھ مارتی رہی۔ دلاور کو یقین دلانے کے لیے ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد دلاور کا آہنی ہاتھ اُس تک پہنچ چکا تھا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ پیچھے پلنگ تھا ورنہ دھکا استا شدہ تھا کہ فرش کو لہو میں رنگ سلکا تھا۔

”یہ شہباز کا بچہ بوتلیں بھی اٹھا کر لے گیا ہے“ دلاور نے خالی الماریوں کے پٹ پر ٹھوکر رسید کی اور مول کے پاؤں کی انگلی سے خون ہٹنے لگا۔ سکی لمبوں میں دبائے وہ نیچے ہی نیچے چھپنے کی کوشش کرتی رہی دلاور بستر پر لیٹ رہا تھا وہ اب بھی اوچی آواز میں اول فول بک رہا تھا۔

صبح کا سپیدا ابھی پوری طرح نمودار بھی نہیں ہوا تھا جب جھپیں شور مچاتے دروازے تک آ پہنچیں۔ شہباز کچھوڑے میں کھڑا تھا۔ آج اُس نے جھینپیں اور گھوڑے کھلے چھوڑ دیئے تھے تاکہ وہ کچھ دیر کے لیے آزاد گھوم سکیں۔ اس جری بھری چراگاہ کا فائدہ اٹھالیں۔ دودھ سے بھرا ڈول اُس کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ گھر آیا تو بڑی جاچکی تھی اور شاید اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ شہباز نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا وہ شاید صاحبان کو ڈھونڈ رہا تھا۔

”سب سو رہے ہیں!“ بڑی نے اُس کے متلاشی چہرے کی طرف دیکھا۔ آج آخری صبح ہے نا یہاں؟“  
 بڑی کی آواز میں اداسی تھی..... وہ وہیں کھڑا رہا۔ قدم جیسے جم سے گئے تھے۔ اُس کا دل صاحبان کا منتظر تھا۔ حویلی جانے سے پہلے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کچھ سننا چاہتا تھا۔ جانے حویلی کے زنان خانے میں جانے کی اجازت بھی مل پاتی یا نہیں۔ دلاور خان نے ایک دو بار ذکر کیا تھا کہ وہ زنان خانے کے لیے خادمہ

منگوائے گا۔ اس صورت میں صاحبان کا اُس سے ملنا اور بات کرنا ناممکن ہو جاتا اور پھرتے بڑے گھر میں اُسے کہاں تلاش کرتا پھرتا۔ کس سے اُس کے متعلق پوچھتا۔

اس تلاش کا کیا جواز پیش کرتا۔ بڑی نے چائے کا گرم بھاپ اڑاتا پیالہ اس کے ہاتھ میں تمھایا تو اُس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ”میرے جوڑوں کا درد بہت بڑھ گیا ہے۔ اب کی دفعہ شہر جاؤ تو تکیہ سے دوالے آنا۔ پر اُس کا ذکر خان سے نہ کرنا، جانے کیا سوچے اور پھر کیا کرے وہ!“ فیضی، قیصر اور صاحبان جاگ چکے تھے۔ دلاور خان اپنی جیب کے پاس کھڑا تھا۔ مول رات بھر کی تھکن کے باعث سنا ہوا چہرہ لیے جب نمودار ہوئی تو دلاور خان کی جیب اشارت ہو چکی تھی بڑی بچوں کے ساتھ بیٹھ چکی تھی اور صاحبان اب تک دالان میں کھڑی اُس کی راہ نہ رہی تھی۔ مول نے اندر کسی نہاں گوشے سے کالے کپڑے میں ہندی چھوٹی سی گھڑی اٹھائی اور اپنے چہرے اور جسم کو چادر میں لپیٹ کر باہر نکل آئی تھی۔ سورج کو یوں زمین کے اطراف میں گزرتی دیکھا کہ اُس نے کتنے عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ یوں تک رہا تھا جیسے درختوں کے درمیان سے گزرتی سنسان ہوئی اور ہی رنگ کی ہے۔ کسی اور دنیا کی باسی ہے۔ اُس کے قدم لرز رہے تھے جب اُس نے جیب میں بیٹھ کر خود کو گھنٹوں میں چھپالیا۔ دلاور اگلی جیب میں بیٹھا تھا پیچھے شہباز اپنی رائفل اٹھائے ہوئے تھا۔ اور دلاور کے حکم کے مطابق فائرنگ کر کے حویلی میں اُس کی آمد کا اعلان کر رہا تھا راستے دھول اڑا رہے تھے۔ مول کے دل کا ارتعاش بڑھ رہا تھا باہر کی فضا اجنبی محسوس ہو رہی تھی جیسے کبھی اُس سے آشنا نہ رہی ہو۔ جیسے کبھی اس ہوا سے اُس کی دوستی نہ رہی ہو۔ وہ کبھی تیزی سے بھاگتے درختوں کو دیکھتی اور کبھی بل کھاتے راستوں پر نظریں جمادیتی۔ دیواروں کے درمیان میں قدم دروازہ دھاتا تھا۔ اس کے آس پاس جنگل کے درختوں کا سایہ تھا۔ یوں آسمان مشکل سے نظر آتا تھا۔ اس کے صدر دروازے پر چند مظلوم چہرے کھڑے تھے جنہوں نے دلاور کی طرح اپنے چہروں کو ڈھانپنے میں چھپا رکھا تھا۔ جیسیں پتھر کی سڑک پر زکیں تو وہ آنا فائدہ دوسری طرف رخصت ہو گئے۔ دلاور خان کے چہرے پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ تیز ہو رہی تھی اس مسکراہٹ میں فتح خوشی، ہر شادی سب ہی کچھ شامل تھا سیاہ رنگ کے سوٹ اور سفید ڈھانٹے میں اُس کا سرخ چہرہ چمک رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی رائفل شہباز کی طرف پھینک کر اُسے دوسری طرف سے آنے کا اشارہ کیا اور خود اُس طرف چلا آیا جہاں مول کھڑی تھی۔ اُس کے عقب میں بڑی اور بچے تھے۔ چہرے پر چند لحظات بیشتر ظاہر ہونے والی مسکراہٹ یکایک غائب ہو گئی۔

”سب اندر چلو“ بڑی نے اپنے کمزور ہاتھ سے مول کو تھام لیا۔ دلاور کا چہرہ عجیب تاثرات سے چمک رہا تھا۔ اُس کے اندر داخل ہوتے ہی قدیم طرز کا قد آدم صدر دروازہ کھلا تو جیسے ان کی آنکھوں میں حیرت کے سائے پھنور بن کر رقصاں ہو گئے۔ یہاں سے وہاں تک رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ روشنیاں چاروں سو پھیلی ہوئی تھیں۔ آگے کمروں کا سلسلہ تھا اور ان کے بعد دالان، پھر بیڑھیاں اور اس کے کچھ فاصلے پر گرین فوارہ اور اُس کے اُس پار زنان خانے، زنان خانہ بھی کیا تھا گویا حویلی کے اندر ایک چھوٹی سی حویلی تھی۔ ”کیا ہم یہاں رہیں گے؟“ صاحبان بڑبڑاتی ہوئی چیزوں کو پھور رہی تھی۔

”ہاں!“ بڑی نے گہرا سانس لیا۔ ”سونے کے پتھرے میں! ٹوٹے دیکھا نہیں“ دلاور کے چہرے پر فتح کا احساس! ”میکل سا گھر جو اُس نے بنایا ہے، اپنے آرام، اپنی عیاشیوں کے لیے بنوایا ہے۔ ہمارا کیا ہے،



وہاں بھی ایک کونے میں پڑے رہتے تھے یہاں بھی کوئی گوشہ ڈھونڈ لیں گے۔ زندگی کے دن ہی تو پورے کرتے ہیں! بڑی بے چھوٹی سی صندوقچی اپنی چادر کے نیچے سے نکالی اور اُسے چھپانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یہ صندوقچی جو وہ دلاور سے چھپا کر لائی تھی پچھلے 25 برسوں سے اسی طرح بندھی اس میں جیسے اُس کی یادیں مجسم ہو کر قید ہو چکی تھیں۔ ماں کی یاد اُس کے جھسکوں کی صورت میں بھائی کا پیار لال ڈوری والے دو پتہ کی شکل میں اور چند اور چیزیں جو اس کے لڑکپن اور اوائل جوانی کی یادگار بھی تھیں ان میں کچھ کپڑے، دیاسلانی اور اُن سے بنی وہ گڑیا بھی تھی جسے اُس کی مانی نے بڑے پیار سے بنایا تھا اور جیسے بچپن میں وہ لوری دیتے ہوئے خود بھی سو جاتی تھی کتنے پُر پیچ اور غیر یقینی ہوتے ہیں یہ زندگی کے راستے بھی۔ کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کس موڑ پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ تھکا ہارا آبلہ پارابی جب ذرا ٹھہر کے پیچھے کی جانب دیکھتا ہے تو دھول اور بازگشت کے ان مذاہنوں کے سوا کیا ملتا ہے جنہیں ہم یادیں کہتے ہیں۔ علی پور کی فضا گونا گوسا اور اجنبی سی لیکن موسیٰ کو سب کچھ اچھا لگا۔ یہ تبدیلی اُس کی موجودہ حالت کے لیے بہت ضروری تھی ورنہ تو کھارے پر بیٹنے سے پہلے ہی ڈوبنے والا تھا حسن علی سومر 55 سالہ دراز قد خوبصورت و ذرا تھا جس کی دلچسپی کے سامان میں گھوڑوں کے علاوہ موسیقی اور کتب بھی تھیں۔ اُس کے وسیع و عریض گھر کے خوبصورت کمروں میں ایک لائبریری بھی تھی۔ اُس کی باتیں، اُس کی لہجہ عام جاگیرداروں سے ہٹ کر تھا۔ موسیٰ خان کا کام اصطبل کی دیکھ بھال اور زمینوں کے سلسلے پر نظر رکھنے کا تھا۔ وہ ذن بھر خوش رنگ فصلوں کے درمیان، درختوں کی گھنی چھاؤں تلے اور کبھی چھوٹی ندی کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیتا اُس پاس کے گھوٹ بھی حسن علی کی ملکیت تھے۔ کبھی کبھار اُسے وہاں بھی جانا ہوتا تھا۔ ایسے میں گھوڑے کا سر پٹ دوڑے چلے جانا اُسے کسی اپنے راستے کی جانب بلاتا تھا جہاں کی خوشبو بھی جو 4 برس پہلے اُس سے جدا ہوئی تھی۔

گوٹھ ابراہیم، جو گیاں، شاہ ولی اللہ اور سراج پتلا زیادہ فاصلے پر تھے۔ یہاں بھی اُس کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی دھول اڑاتے راستوں پر بولیتا اُس کی نظریں ہر آنے والے کے تعاقب میں اٹھ جاتیں۔ ان گوشوں کے مختلف گھروں تک رسائی حاصل کرنا اب مشکل نہ تھا۔ فیض محمد کے ساتھ تو بات اور بھی آسان ہو جاتی تھی۔ بڑے بوڑھوں سے لے کر بچوں تک وہ ایک ہی سوال کرتا مول کا سوال..... ان دو آنکھوں کا سوال جو شہاب ثاقب کی طرح اُس کی دنیا سے نکل کر تنہائیوں میں کھو گئی تھیں۔ اُسے اکثر تنہائیوں میں یاد آتا تھا بہاول خان نے کہا تھا کہ اجنبی کا لہجہ سندی تھا اُس کے لب و لہجہ کے علاوہ لباس سے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ اندرون سندھ سے آیا ہے۔ موسیٰ خان کو یاد تھا کہ اس سے قبل وہ دوسرے ان علاقوں میں خاک چھان چکا ہے لیکن تب ان گوشوں کے اندر موجود گھروں تک رسائی ممکن نہ تھی۔ اب فیض محمد کی مدد سے اُس کی ڈھارس بندھ رہی تھی کبھی کبھی دل یہ سوچ کر لرز جاتا کہ جانے وہ کیسی ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ ایک دفعہ گوٹھ ابراہیم میں ایک برقع پوش عورت کو دیکھ کر وہ سرتاپا کانپ اٹھا تھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی پگڈنڈی پر جا رہی تھی۔ اُس کی گود میں ایک شیرخوار بچہ تھا اور دوسرا اس کے پہلو سے لگا ہوا تھا مول بھی تو اسی طرح چلتی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال یوں ہی بل کھائے رہتے تھے۔ موسیٰ خان نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ اسی رفتار سے اُس کا دل بھی بھاگ رہا تھا ہانپتے ہوئے وہ پگڈنڈی کے قریب



پہنچا تو نقاب پوش نے حیرت سے اُسے پلٹ کر دیکھا۔ اُمید کا دیا ایک جھٹکے سے بچھ گیا۔ ندامت سے موسیٰ خان کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چپکنے لگیں۔ شاید ”دیوانہ ہو گیا سائیں!“ اُس نے ٹھوڑے کا رخ موڑا دل اب بھی بے قابو تھا۔

شہباز آج قیصر اور فیضی کو لینے آیا تھا گھڑ سواری کے لیے۔ یہ دلاور کا حکم تھا وہ زمان خانے کی جانب بڑھا تو لمحہ کمرے کے انتہائی دائیں جانب صاحبان کا سایہ نظر آیا۔ سبز چادر میں لپٹی صاحبان جیسے اُسی کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے پیچھے زرد رنگ کے مٹلیں پردے زمین کو چھو رہے تھے۔ کمرے کے دونوں اطراف میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی جس سے صاحبان کا چہرہ واضح نظر آ رہا تھا۔

”مبارک ہو!“ شہباز اُس کے قریب چلا آیا۔ ”کس بات کی؟“ آواز معجب تھی۔ ”اس حویلی کی شہزادی بننے کی!“ شہباز نے گہری سانس لے کر سرگوشی کی ”بخدا یہ سب تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا صاحبان تم واقعی شہزادی لگ رہی ہو!“

”تم مذاق کر رہے ہو شہباز“ صاحبان کا لہجہ اداس ہونے لگا تو وہ مسکرا دیا۔

”یہ مذاق نہیں، میرے دل کی آواز ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں ان دیواروں نے میرے سامنے سر اٹھایا ہے۔ اس حویلی کے ایک ایک حصے کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور پھر مختلف چیزوں سے سجے ہوئے دیکھا لیکن جو حسن تمہارے آنے کی وجہ سے اس بے کیف فضا میں اتر آیا ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ کہیں نہیں تھا۔“ شہباز کی آواز جذبات میں بھینکنے لگی۔

مول کو لمحہ یہ لمحہ بھیگتی شب بوجھل لگ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی، باہر کالے آسمان پر چاند نکل آیا ہوگا ستارے ہمیشہ کی طرح جل بجھ رہے ہوں گے اور جنگل کے ہرے پتوں پر خنجر جیسے چپکے کر رہی ہوگی۔ لیکن وہ اس چھت تلے دنیا سے دور پہنچی دیواروں کے بیچ کس قدر بے چین تھی یہ کسی کو کیا خبر۔ بڑی اُس کے قریب ہی دوسرے پلنگ پر دراز تھی وہ شام سے ہی آنکھیں بند کیے ہوئے تھی اور اب گہری نیند میں اپنے گرد و پیش سے غافل بھی بہت دیر تک ساکت رہنے اور منتش چھت کو تنکے کے بعد چپکے سے مول اٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹی سی کھڑکی کے آ پار دیکھنے کی کوشش کرنے لگی باہر غالباً دالان کا کوئی حصہ تھا اور اُس کے دونوں طرف چھوٹے کمرے جن کے بند دروازے سیاہ دیواروں کے درمیان بکھرے نظر آ رہے تھے۔ آسمان دور تک دکھائی نہ دے رہا تھا۔ مول نے گہرا کراچی آنکھیں بند کر لیں۔ جانے شب کا کون سا پہر تھا بڑی کے مدھم خراٹے جب اور تیز ہونے لگے تو اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سانس لینا چاہا لیکن تازہ ہوا تو شاید کہیں نہ تھی۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ پانی کا گلاس قریب ہی رکھا تھا اُس نے سوکھے لیوں کو تر کیا لیکن وہ اس کے جلتے وجود کا حصہ ہی تھے۔ پیاس تو روح تک اتری ہوئی تھی اُسے کیسے سیراب کرنی۔ وہ بے مقصد ادھر سے ادھر بھرتی رہی تارکی کے آ پار دیکھنے کی سعی ناکام کرتی رہی اور جب اُس نے اپنا ہاتھ ہوا جسم نرم اور آرام دہ بستر پر ڈالا باہر صبح ہونے والی تھی۔ اجالا ہوتے ہی مردان خانے کا دروازہ کھلا اور نئے لباس اور خوشبو میں سجا دلا در نمودار ہوا۔ اُس کا رنگ سرخ اور صحت قابل رشک لگ رہی تھی۔ سر پر لہراتی ہوئی نیلی گچڑی اور کالے پٹاوری چیلوں میں ملبوس وہ پہلے سے زیادہ چاق و چوبند اور پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ لفافے تھے جو اُس نے پلنگ پوش کے اوپر بے پرواہی سے پھینک دیے۔



”اپنا حلیہ بدل لو“ مول کی طرف اُس نے کسی پسندیدہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے ترجیحی نظر سے ایک تنقید بھرا جائزہ لیا تھا۔ صاحبان کے لیے یہ پیلا چوڑا تھا جو دلاور لایا تھا ورنہ اُس سے پہلے شہزادی اپنے پرانے ملبوسات کا سائز چھوٹا کر کے اُسے پہنا دیتی تھی یا شہباز کے ہاتھوں بازار سے سوئی کپڑا منگوا کر سلائی کشین پر سی دیتی تھی۔ صاحبان اپنے ہاتھوں میں ریشم سے بنا نرم کپڑا دیکھ کر حیران ہونے لگی۔ باپ کا ایک دم سے ہونے والا یہ کرم نہ صرف اُسے بلکہ بڑی کو بھی اچھنے میں ڈال رہا تھا مول نے بادل خواستہ دلاور خان کا لایا ہوا چوڑا اپہنا تو ہمیشہ کی طرح نئے جوڑے میں خوبصورت لگنے والا چہرہ آج کمزوری اور گردش ایام کی پختلی کھانے لگا۔ اُس نے دکھ سے آئینہ ایک طرف رکھ دیا۔ وہ بے دلی سے بال سنوارنے کے بعد بستر پر دراز ہو گئی، رات بھر جاگنے کے بعد جسم کی تسکندی بڑھ رہی تھی۔ دن رخصت ہوا اور رات چار سو پھیلی تو حویلی کے در و دیوار کو سجایا جانے لگا۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر رنگ برنگی بتیاں جل رہی تھیں۔ باقی لڑکیوں کی صورت میں درختوں سے لٹک رہی تھیں جلتے بجتے دیووں کی ایک قطار تھی جو چھت سے لے کر فرش تک چمک رہی تھی گویا نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ کئی افراد تھے جو دلاور خان کے حکم کے مطابق اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اگر کوئی اچانک در و در تک پھیلے ہوئے تاریک اور پیابان جنگل کی طرف مٹکتا آ نکلتا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پتھر ہو جاتیں۔ ایک طرف درختوں کے جھنڈ اور ایک طرف جگمگ کرتی پتھروں سے بنی یہ دیواریں گویا آسمان سے چاند اور ستارے زمین پر آگراے تھے۔ مول کو اس سے حویلی کا یہ چھوٹا سا حصہ نظر آ رہا تھا اور یہ حصہ گواندر کی طرف تھا اور باہر سے اس کا باقاعدہ رابطہ نہ تھا لیکن اسے بھی سجاوٹ میں شریک کیا گیا تھا۔

مول سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی پھر اس نے صاحبان کو بھی اندر بلالیا ”یہ جانے کیا ہے چھوٹی ماں اور کیوں ہو رہا ہے“ وہ کھڑکی سے بدستور باہر کی جانب جھانک رہی تھی۔ ”شہباز کہہ رہا تھا کہ آج بابا شہر گئے ہیں..... پھر یہ سب؟“ اُس نے فقرہ ادا چھوڑ دیا۔

”وہ بھی تو دو پہر کے بعد نیند آیا، نہ جانے کہاں ہے اس وقت!“ مول نے پریشانی سے صاحبان کو دیکھا۔

اب باہر دھول کی ہلکی ہلکی آواز بھی آنا شروع ہو گئی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دور سے بجتا ہوا لمحہ یہ لمحہ قریب آ رہا ہے پھر چند ہی گھنٹیوں کے بعد جنگل کی سخت اور کھردری زمین پر چرچا جاتے ہوئے ٹائروں کی آوازیں آنے لگیں غالباً دلاور خان واپس آ گیا تھا۔ کاریں جو صدر دروازے پر آ رہیں تو دھول کی لے تیز ہو گئی۔ فضا میں مٹھلیاں پھوٹ رہی تھیں اور آسمان پر نہری کمانیں بن رہی تھیں گویا شور مچاتے، ناچتے ستارے تھے۔ جو زمین سے اٹھ کر آسمان تک پہنچ رہے تھے۔ فضا کو نکلیں بنا رہے تھے۔ آج اس خاموش اور بیابانی خطے میں جیسے روشنی جسم ہو کر اتر آئی تھی۔ ستاروں کے کارواں تھے جو جوق در جوق چلتے ہوئے یہاں تک آئے پہنچے تھے فضا میں چھانے والی نفسی اُس لمحے اور بھی بڑھ گئی جب دھول کے ساتھ کچھ اور لوازمات شامل ہوئے۔ سارنگی اور رانزنی سر جب نکا پک فضا میں بکھرے تو مول نے اپنا دل تمام لیا۔ صاحبان اگر اُس کا ہاتھ نہ تھامتے تو وہ یقیناً چکرا کر نیچے آگرتی۔

”کیا ہوا چھوٹی ماں؟ کیا ہوا؟“

دووں ہاتھوں سے مول کو تھامے صاحبان پریشان تھے۔ مول کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ مسکلائے اسے۔ ریسن پاپوں والے پلنگ پر لے آئی اب وہ اُسے کیا بتانی کہ کیا ہوا اور کیوں..... وہ سب جو خواب ہو گیا تھا یادوں میں دفن ہو چکا تھا آج جانے کہاں سے مجسم ہو کر سماعتوں میں اتر رہا تھا۔ باہر اب بھی ویسا ہی شور تھا۔ اُس نے صاحبان سے پوچھا کہ ”کیا واقعی راترئی کا سُر بکھر رہا ہے یا یہ اُس کا وہم ہے“ صاحبان سوچ میں ڈوب گئی۔ ”جھوٹی ماں مجھے کیا خبر، یہ راترئی کیا ہوتی ہے۔ ہاں ڈھول کے ساتھ کچھ اور بج رہا ہے، ہلکا ہلکا سا جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو۔ جیسے دور کہیں برستا ہوا پانی پتوں پر لے چھیر رہا ہو.....“ اُس نے دیکھا مول کا ارتعاش زدہ چہرہ اُنسو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

دلاور خان کے ساتھ سنگین خان، بہروز خان اور دوسرے بے شمار لوگ تھے۔ سب سے آخری گاڑی جس کی کھڑکیوں پر سفید رنگ کے پردے نظر آ رہے تھے۔ جب رکی تو گھوڑی ہی دیر میں نازک انداز میں رپا سرخ اور سرخ بزم لباس میں بچا اُترا تو سب کی نظریں اُس کی طرف اٹھ گئیں۔ گھنٹوں کو بچھوتے کالے رنگی بالوں میں گلاب کے تازہ پھول گندھے ہوئے تھے۔ نازک بازوؤں میں چوڑیاں تھیں جھمن کرتے ہوئے گویا موسیقی کی ایک نئی صنف کو جنم دے رہی تھیں اُس کی سیاہ کاجل سے بھی جام سے مثل آکھیں دلاور اور سنگین خان کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے موسم کی طرح چہرے پر کہیں پریشانی کے آثار بھی تھے وہ چند عانیے یہاں کھڑی رہی اور پھر دلاور خان اُسے پھولوں سے مہکتی روش پر خوش آمدید کہہ رہا تھا اور وہ سنہری چپلوں میں چھپائے گورے پاؤں دھیرے دھیرے رکتی آگے بڑھنے لگی۔ گویا ایک گھنٹہ جی جی جو یہاں سے وہاں تک خوشبو اور رنگینی کے ساتھ بھڑک رہی تھی۔ صدر دروازے کو آج مکمل طور پر دکھایا گیا تھا۔ دلاور خان کی مہمان خصوصی کو خاص طریقے سے سج کرے میں لاکر تحلیل نشست گاہ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو خواتین اور بھی تھیں جو ذرا ادا جیزم تھیں اور غالباً اُس کی عزیز تھیں۔ مہمانوں کو بلوریں گلاسوں میں ٹھنڈا مشروب پیش کیے جانے کے بعد کھانا پُچن دیا گیا۔ جس وقت شہباز اندر آیا مول گھنٹوں میں سر چھپائے گھڑی کی صورت بنی تھی۔ صاحبان نہ جانے کہاں تھی۔ شہباز کے ہاتھ میں کھانے سے بچی ٹرے تھی جو اُس نے چپ چاپ میز پر رکھ دی اور واپس جانے کو قدم بڑھائے تو مول کی آواز نے اُسے روکنے پر مجبور کر دیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بھائی۔ اتنی جھاوٹ، اتنی روشنیاں کیوں ہیں۔ باہر ڈھول بج رہا ہے۔ میرا تو دم کھٹنے لگا ہے۔“

”خان نے بتایا نہیں؟“ شہباز کی آواز میں حیرت تھی۔ ”آج خان حویلی بننے کی خوشی میں جشن منا رہا ہے۔ سنگین خان اور بہروز خان کے علاوہ بہت سے لوگ آج رات یہیں گزاریں گے اور اس کے علاوہ وہ.....“ شہباز کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

”تو کیا آج پھر ویسا ہی ساں ہوگا جیسا پرانے گھر میں ہوتا تھا۔ نہ جانے خان نشے میں کس پر ہاتھ اٹھائے گا۔ کس کے زخم مسکس گے اور کون فریاد کرے گا۔“ مول خوفزدہ تھی۔ شہباز مسکرانے لگا۔

”آج سب کچھ بدل گیا ہے خانم! آج بہت خوشیوں کی رات ہے۔ ابھی تو شراب کی بوتلیں کھلیں بھی نہیں اور وہ جموم رہا ہے۔“ شہباز کا لہجہ معنی خیز تھا۔ اُس کے جانے کے بعد مول نے باہر کی جانب نظر

دوڑائی۔ تمام آوازیں ختم چکی تھیں اور شب پر اسرار انداز میں اتر رہی تھی دوسرے کمرے میں بڑی سفید برف جیسا سر لیے بے خبر سو رہی تھی۔ صاحبان چھوٹے بھائی کو سینے سے لگائے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس وقت طبیب اور ستار کے ساتھ کھنگروؤں نے حویلی کے درو دیوار میں آواز اٹھائی، زمان خانے میں موجود مٹی کے بے جان پتلوں کے دل دھڑکنے لگے۔ مول بے چین ہو کر صدر دروازے کے آ پار دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ صاحبان بھائی کو لٹا کر بھاگتی چلی آئی۔ ان دونوں کی آنکھوں میں سوالوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ مول سمجھ چکی تھی کہ شہباز کیا بات کہتے ہوئے خاموش ہوا تھا۔ اُس نے سر دھوا کو اپنے اندر بھر اور آنکھیں کھڑکی سے لگا دیں۔ باہر اس لمحے کوئی ذی روح نہ تھا۔ بتیاں تنہا جل رہی تھیں اُس کے خوابوں کی طرح جو چپکے چپکے راکھ ہوئے تھے۔ مثل چراغ شب ہوئے تھے۔ مردان خانے کے مٹھلیں فرش پر جیسے پھیرنے، رقص کرتے قدم اب تیز ہو رہے تھے۔ کھنگروؤں کے ساتھ بے خود کرتی آواز مڑ کے رنگ نکمیر لگی تو حویلی کے بند دروازے اسے مردان خانے تک محدود نہ رکھ سکے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کا ایک ایک ذرہ سر اور گیت سے بوجھل ہے۔ بے خود ہے۔ دلاور خان اور اُس کے دوستوں کے علاوہ دوسرے چھوٹے کارندے بھی مردان خانے میں نجی رنگ و مستی کی محفل میں شریک تھے۔ ہمیشہ کی طرح نازک بوتلوں میں قید ہے مستی سے لٹائے جا رہی تھی۔ آج نہ پینے والوں کا کوئی حساب تھا نہ جام سناپی کا۔ پہلا گیت ختم ہوا، پھر دوسرا اور اس کے بعد سلسلہ طویل ہو گیا۔ دلاور خان خود سے بے خود نشے میں چور چور تھا۔ وہ بلوریں گلاس ہاتھ میں پکڑے سنہرے گاؤٹیکے سے کاندھا جوڑے آنکھیں بند کیے جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ اُس کے لیے تو جیسے ساری دنیا مختصر ہو کر اس کمرے کی چھت تلے آگئی تھی۔ وہ بے پروائی سے نئے اور کرارے نوٹ کمرے کے درمیان میں پھٹکنے لگا۔ سنگین خان بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ اُس نے بھی ملازم سے کہہ کر اپنا چڑی بیگ کھلوایا۔ گویا نوٹ بے قیّت کا غدو کی صورت میں لٹائے جا رہے تھے۔ پانی کی طرح بہائے جا رہے تھے اور گھٹکھڑو تھے کہ خون کی گردش میں تلاطم پیدا کرتے ہوئے تیز سے تیز تر ہو رہے تھے۔ شب کا جانے کون سا پہر تھا مردان خانے سے اٹھتا شور جوں کا توں تھا جب مول نے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ دستک یقیناً اونچی آواز میں دی گئی تھی لیکن اس وقت وہ شور میں مدغم ہو گئی تھی۔ صاحبان نے خوفزدہ ہو کر مول کو دیکھا۔ دلاور خان کے بے دردی سے اٹھتے ہاتھ اور نشے میں ہلکی آواز اُس کے سامنے آئی تھی۔ مول خوفزدہ ہو کر خود کو کمرے کے کونے میں یوں چھپانے لگی جیسے وہ واقعی دلاور خان کی نگاہوں سے دور ہو جائے گی۔ دستک ایک دفعہ پھر دی گئی اب کی دفعہ آواز اونچی تھی۔ دوسری طرف گانا ختم ہو چکا تھا اور دوسرے گیت کا آغاز کرتے ہوئے طبیب دھیرے دھیرے بچ رہا تھا۔

”صاحبان..... دروازہ کھولو“ دستک دینے والا مدھم آواز میں بول رہا تھا۔ یہ آواز یقیناً شہباز کی تھی صاحبان نے اگلے ہی لمحے دروازہ کھول دیا اور شہباز دے قدموں کے ساتھ اندر آ گیا..... ”بس تمہاری خاطر آیا ہوں، سوچ رہا تھا تم نہ جانے کیا سوچ رہی ہوگی، کتنی پریشان ہوگی“ اُس کی آواز مدھم تھی لیکن صاحبان تک آسانی سے پہنچ گئی۔

”تم نے ناچ گانا دیکھا؟ وہاں کیا ہو رہا ہے؟“ صاحبان نے مردان خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ خاص نہیں بس خان کا شوق ہے یہ سنگیت اور کھنگرو اب تو شاید یہ سب کچھ حویلی کے معمولات میں شامل



ہو جائے۔ وہ دیر کو کرکا۔ ”آج خان نے ایک گلاس مجھے بھی پکڑا چاہتا تھا لیکن میرے ہاتھ لرز اٹھے تھے۔ تمہارا چہرہ آنکھوں میں اتر رہا تھا میں غلیظ راہوں پر چل کر اپنے خواب اپنے ہاتھوں سے لانا نہیں چاہتا تھا“ وہ بات ختم کر کے جانے کو پلٹا۔ اور پھر کچھ سوچ کر کر گیا۔

”ہو سکتا ہے خان کی مہمان عورتیں کچھ دیر کے لیے زنان خانے میں آ کر ٹھہریں، خانم کو کہنا تیار رہے۔“ صاحبان شہباز کے جانے کے بعد اُس کے جملوں کی شیرینی کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ ایک مکان اُس کی سوچوں کے ساتھ لبوں پر پھیلنے لگی۔ رشتہ کی آج اُس کے سر سے سرک رہا تھا۔ اور وہ بے خودی میں بیٹھی جانے کس دنیا میں تھی۔ موسیقی کا شور تو چند لمحات بیشتر اُسے بے ہنگم لگ رہا تھا اب جیسے اُس کی دھڑکنوں میں شامل ہو رہا تھا۔ ایک انگڑائی لے کے اُس نے خود کو ریشمی چادر سے ڈھکے پٹنگ پر ڈال دیا۔ بند آنکھوں کے اُس پار خوابوں کا ایک گلستان مہک رہا تھا۔ عورت کے وجود سے راحت اور خوشی حاصل کرنے والا یہ مرد کس قدر مست تھا اس گھڑی کہ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ اسی چھت کے نیچے اُس کی جوان بیٹی بھی موجود ہے۔ معصوم، پانچتہ ذہن رکھنے والے بچے اور ضعیفی کو دستک دیتی ہوئی کمزور اور بیمار عورت بھی۔ مول نے دکھ اور نفرت کے شدید احساس سے اندھیرے کمرے میں نظریں جمائیں۔ اس سے اُسے اپنے اُن دیکھے بچے کی موت پر سکون محسوس ہونے لگا۔ نہ جانے وہ شیطانت کے اس چنگل سے کیا بن کر نکلتا، کس کس کی عزت بامال کرتا۔ کس کس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا۔ مول کو نفرت اور اضطراب کی اذیت اپنے وجود پر ریشتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کسوٹیں لیتی رہی لیکن نیند ایک دفعہ روٹھ کر گویا دوبارہ آنے کو تیار نہ تھی۔ صبح ہونے والی تھی جب ساز و آواز کی سنگھم یک لخت ختم گیا۔ اور نضا میں خاموشی چھا گئی۔ گھٹکھروں کی چھین چھین کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ مول نے اندازہ لگایا کہ گانے والی غالباً اب تھک چکی ہے اور گھٹکھروں سے بچے پاؤں اب مردان خانے سے باہر نکل رہے ہیں۔ پھر کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے جب وہ چھم چھم زنان خانے کے بہت قریب آئی محسوس ہوئی اور پھر دروازے پر ایک زوردار دستک ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے مول کا بدن لرز گیا۔ دستک برابر ہو رہی تھی۔ بالکل کی آواز رک چکی تھی۔ مول نے گھونگھٹ میں خود کو چھپا کر آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ باہر دلاور خان کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں، اُن میں دہشتی آگ سی سرخی تھی۔ اور پورے وجود سے شراب کی مہک آ رہی تھی۔ اُس نے اپنے کھڑے کھڑے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنے پیچھے کھڑے وجود کو آگے آنے کے لیے کہا۔ مول نے دیکھا وہ ایک نازک اندازِ حسن تھی جس کے جسم پر ریشمی پوشاک اور دل کش زیور چمک رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سجاوازه کبھی تازہ رہا ہوگا لیکن رات بھر جاگنے کے باعث اب کاجل پھیل رہا تھا اور لبوں کی لالی اپنی چمک کھورہی تھی۔ بالوں کی لٹوں کو اُس نے آہستہ سے پیچھے کیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھائی اندر آ گئی۔ اُس کے پیچھے مضبوط جوتے کی ایک اور عورت بھی تھی جس کی اوزنمی کے نیچے سے جھلکتا ریشمی لباس اب حسن آلود تھا۔ ”اُن کا خیال رکھنا، یہ میری خاص مہمان ہیں!“ دلاور خان کی آواز میں سختی کے ساتھ ساتھ ڈھٹائی بھی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ رخصت ہوا تو مول نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا، وہ جس نے تمام شب مردان خانے میں تھمک چھپا تھا اب تھکے ہوئے سراپے کے ساتھ مہندی لگے نازک پاؤں مسہری پر

رکھے گھنگھر و اتار رہی تھی اُس کے کالے بال ہر قید سے آزاد ہو کر آس پاس جھول رہے تھے اور گلاب کے پھول مرجھانے کے بعد پتی پتی ہو کر غالیجہ پر بکھر رہے تھے اُس نے گھنگھر و اتار کر ایک طرف رکھے اور بالوں کو سینٹے ہوئے مول کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ ”تم بیٹی ہو؟ دلاور خان کی؟“ اُس نے کچھ توقف کے بعد بلا آخر پوچھا شرمندگی کی ایک لہر مول کے سر اپنے میں دوڑنے لگی۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا اور رکتے ہوئے بولی۔

”بیٹی نہیں..... بیوی ہوں اُس کی!“

”ہوں.....“ لہجہ خاصا متعجب تھا۔ ”لیکن وہ تو عمر میں تم سے بہت بڑا دکھائی دیتا ہے؟“

”ہاں“ دکھ کے احساس نے مول کی آواز کو بوجھل کر دیا۔

”یہ ظالم وقت کے اس کھیل کا نتیجہ ہے جس میں ہار سدا مجھ جیسی بے بس لڑکیوں کی ہوتی ہے۔“

آنے والی کے چہرے پر ترجم کے جذبات ابھرنے لگے۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”مول!“

”اور مجھے یلا کہتے ہیں“ اُس نے تھکے ہوئے جسم کو کشادہ پلنگ پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”کیا تمہیں دلاور خان اٹھالایا تھا؟“

”ہاں.....!“

”تم کہاں کی رہنے والی ہو؟“

”یہاں سے دور ریگستان ہے وہی میرا وطن ہے۔ میرا سب کچھ!“

”کیا تم چولستان کی ماسی ہو؟“

مول کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دل دھڑک دھڑک کر گویا اپنے اندر موجزن طوفان کا پتہ دینے لگا۔

”چولستان تو میرے شہر کے ساتھ ہی ہے، بالکل ہمسائے میں“ یلا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مول نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ نبض تھم تھم کر چل رہی تھی۔

”تم کہاں سے آئی ہو؟“

”بہاد پور سے“

”بہاد پور.....!“ کانپتے ہوئے ہونٹوں نے سرگوشی کی۔

”کیا تم واقعی بہاد پور سے آئی ہو؟“ وہ اٹھ کر بیلا کے پاس جا بیٹھی۔ آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔ اور ان کے اندر سمندروں کا پانی جیسے بہہ نکلنے کو بے تاب۔ کتنے بہت سے دنوں کے بعد کسی نے

بہاد پور کا نام لیا تھا۔ مولیٰ کے شہر کا نام! بیلا نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بہاد پور میں تمہارا کون ہے؟“

ایک انجانا سا احساس اُس کی روح میں اتر آیا اور زرد چہرے پر بہت دنوں کے بعد سُرخ چھانے لگی۔

مولیٰ کا مسکرا تا سراپا یوں آنکھوں میں اتر رہا تھا جیسے وہ سانس ہی موجود ہو اور اپنے خاص انداز میں اس کی

طرف متوجہ ہو، اس لمحہ وہ مہول گئی تھی کہ کہاں ہے، کیوں ہے اور اب کس کی بیوی ہے..... وہ تو جیسے بے خود

ہو کر اپنے محبوب کو خود سے بہت قریب دیکھ رہی تھی۔ اُس کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔ بیلا نے دیکھا اُس

سکی آنکھوں میں عجیب سی جوت جل رہی تھی۔ وہ کم عمر سی لیکن تجربہ کار تھی سمجھ گئی کہ بہاد پور کے ساتھ اس کا کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔ ایسا تعلق جس نے اس کے دل کے تاروں کو چھیر ڈیا ہے۔

”مول تم نے بتایا کہیں کہ بہاد پور میں تمہارا کون ہے؟“ لہجہ نرم تھا اور آواز شیریں۔ مول گویا خواب کی دنیاسے واپس لوٹ آئی۔ بیلا اب تک اسی طرح مسہری کے گاؤں کیے سے لگی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مول نے گہرا سانس لیا اور ایک ہی لمحے میں چہرے پر چند لکات بیشتر چھانجانے والی دھوپ غائب ہوگئی۔ وہاں پھر سے تاریکیاں اور غم کے سائے تھے۔ بیلا نے دیکھا اس کی آنکھیں بس چمکنے ہی والی تھیں۔ اس نے اپنے دل میں اس اجنبی لڑکی کے لیے نرم گوشہ محسوس کیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

”کیا بات ہے، تم پریشان نظر آ رہی ہو؟ کیا میں نے کوئی غلط بات پوچھ لی تھی؟“

”نہیں..... نہیں تو“ مول نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر؟ اب تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”شاید میری محبت اب تک زندہ ہے۔ اب تک وہی ہی تروتازہ بخشنی 4 برس پہلے تھی“ خشک ہونٹوں نے دھیرے سے جنبش کی۔

’تب ہی تمہارے پوچھنے پر کنواری دوشیزہ کی طرح میرا دل ہلکنے لگا تھا۔“ بے اختیار رو کر دھڑکنے لگا تھا اور میں اس کے شور میں کم ہو کر یہ بھول گئی تھی کہ اب کہاں ہوں اور وہ کبھی سب کچھ تھا اب فقط خواب ہے مثل سراب ہے۔ ہاں اب فقط ایک خواب فقط ایک احساس ہے اور کچھ بھی نہیں.....“ مول کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جذبات کا ایک منہ زور طوفان اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

”مجھے افسوس ہے میں نے نا سچائی کی بنا پر تمہارے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا۔ دراصل مجھے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر دکھ پہنچا ہے۔ گو میں ایک باعزت لڑکی نہیں، ہزاروں محفلیں سجا چکی ہوں اور لاتعداد دل دھڑکا چکی ہوں، لیکن پھر بھی میرے اندر کے جذبات زندہ ہیں میرے دل میں نرم گوشہ اب بھی موجود ہے اور تم یقین کر دو کہ میں نے تمہارے لیے اپنے دل کے اندر جو کچھ محسوس کیا ہے وہ پہلے بھی کسی کے لیے نہیں کیا تھا نہ جانے کیا بات ہے جو مجھے تمہاری طرف کھینچ رہی ہے۔“ بیلا کی آواز میں درد کا عنصر شامل ہو گیا۔ اس وقت وہ مول کو ایک ہمدرد اور عام سی چھوٹے دل والی لڑکی محسوس ہوئی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ وہی ہوش ربا ہے جو چند گھنٹا پہلے دلاور خان اور سکین خان جیسے پھر دلوں کو دھڑکا رہی تھی۔ مول نے اپنے آنسوؤں کی پھٹی پر گرتے ہوئے محسوس کیے۔ تو دل لب کشائی کے لیے آمادہ ہو گیا۔

”بیلا! بہاد پور سے میرے دل کی تاروں کا رشتہ ہے۔ گو میں نے کبھی وہاں کے راستوں کی خاک کو نہیں چھوا نہ ہی اس کی بارش میں اپنا چہرہ بھگوایا ہے لیکن پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے دل کا ایک حصہ اس کی یادوں سے آباد ہے۔ بہاد پور میں کبھی میرا محبوب رہتا تھا نہ جانے اب وہ کہاں ہوگا۔ لیکن بھی یہ شہر اس کا مسکن تھا۔ اُسے روزی دیتا تھا۔ جس کے لیے اُسے مہینوں میری نظروں سے اپنی جھوک سے، اپنے وطن سے دور رہنا پڑتا تھا۔ مجھے بھی اس کے اونٹ کے گلے میں بچتے جرس کی صدا یاد ہے جو چلتے سے گویا پورے صحرا پر

چھا جاتی تھی۔“

”کیا نام تھا..... تمہارے محبوب کا.....؟“ بیلا نے جھپکنے ہوئے پوچھا۔

”موسیٰ!“ مول نے جواب اُسی کیفیت میں تھی سرگوشی کی۔

”موسیٰ!“ بیلا کا لہجہ غیر یقینی تھا۔ ”تم نے موسیٰ کہا نا.....! موسیٰ خان.....!“

”ہاں..... سجاد ل چا چا کا بیٹا موسیٰ خان.....!“

”میں تو اُسے جانتی ہوں مول“ بیلا کی آنکھیں ایک عجیب احساس سے چپکنے لگی تھیں۔

”تم اُسے جانتی ہو؟“ مول کی آواز میں جیسے سارے جہاں کی حیرت سمٹ آئی تھی۔

”ہاں، میں اُسے جانتی ہوں وہ میرے پاس آتا تھا اور اب بھی میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے.....!“

”تم کیا کہہ رہی ہو بیلا مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ مول کی آواز جذبات کی شدت سے لڑکھڑاہی تھی۔

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا دل ابھی بند ہو جائے گا۔

”پچھلے برس تک وہ مختصر بازار میں آتا رہا۔ کبھی بھٹے، کبھی مینے کے بعد اور کبھی ہر دوسرے دن اور

مجھے اس لیے اچھا لگتا تھا کیونکہ باقی مردوں سے مختلف دکھتا تھا۔ نہ اُس میں بناوٹ تھی اور نہ ہوس۔ شروع

میں تو میں حیران تھی کہ بھلا اُس جیسا شریف، ذی ہوش انسان کا اس جگہ سے کیا تعلق، پھر ایک دن اُس نے

مجھے بتایا کہ..... ہاں ہاں مجھے یاد آ رہا ہے کہ اُس نے مجھے یہ ہی بتایا تھا کہ اُس کی محبت اُس سے جھین لی گئی

ہے غالباً اُس کی سنگتر کو کسی نے رات کی تاریکی میں اغوا کر لیا تھا تب سے ہی وہ دیوانہ بنا دھرے اُدھر گھومتا

رہتا تھا اور کبھی میری طرف آنکھتا تھا۔“

مول کی آنکھیں پلکیں جھپکتا بھول گئیں تھیں۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین اسے مدار میں چلتے چلتے

یک لحظہ رک گئی ہے۔ اُداس اور بے یقینی کی کیفیت چہرے پر عجیب اخراج پیدا کر رہی تھی۔ اُس نے برف

کی مانند سرد ہاتھوں سے بیلا کا ہاتھ تھاما۔ دل رک رہا تھا۔ سانسیں تھم رہی تھیں۔

”تم سچ کہہ رہی ہو!“

”ہاں.....“ بیلا نے دھیرے سے سر ہلایا۔

”ویسے تو ہم لوگ اپنے ہاں آنے والوں سے زیادہ باتیں نہیں کرتے لیکن میں کہا نا موسیٰ خان مختلف

آدمی تھا۔“

مول جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی پیاسی آنکھیں سمندر بن کر بہہ رہی تھیں جیسے ایک طوفان اُٹھ آیا

تھا، اُس کا وجود لرزاں تھا اور گدے میں اذیت کا احساس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بیلا نے دیکھا وہ نازک سی

کنزور لڑکی مایہ بُرے آب کی طرح نظر آ رہی تھی غالباً یہ آنسو یہ آپس اُس نے اُن گت دنوں سے اپنے

اند ر قید رکھی تھیں اور اب جیسے کسی نے دروازہ کھول دیا تھا۔ بیلا خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔ فرط جذبات

سے اُس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ اُسے کیا خبر تھی کہ موسیٰ خان کی وہ محبوبہ جس کا ذکر اُس نے کئی

مرتبہ دھاتی شاموں کے سنگ ستا تھا، زندگی کے کسی موڑ پر یوں اچانک اُس کے سامنے آ جائے گی۔

(اس دلچسپ داستان کا باقی حصہ آئندہ ماہ کے دھیرے میں ملاحظہ فرمائیے)



# چاہتوں کے رنگ

~~~~~

اماں بی نے ضد باندھ لی تھی کہ بیٹے کو پسند کی بیوی نہیں
لانے دوں گی مگر یوسف انہی کے بیٹے تھے..... ماں کو ماننا ہی
پڑا.....

~~~~~

دودھیا چاندنی میں رنگ برنگے ستارے چم  
ہو گئے بارات دلہن کو رخصت کرا کے واپس آ رہی  
تھی اور سہ منزلہ گھر کی چھت پر لگا لاؤڈ اسپیکر دلکش  
چم کرتے بکھرے اور نشیب میں دوڑ کر معدوم



آواز میں بارات کی آمد کا بے سرت اعلان کر رہا تھا حالانکہ آج کل تو نہ فیشن رہا نہ رواج کہ لاؤڈ اسپیکر پر شادی بیاہ کے لیے گیت گائے جائیں مگر اماں بی برائے وقتوں کے رسم و رواج کو سینے سے لگائے اس کی پاسداری کیے جا رہی تھیں وہی رکھ رکھاؤ، وہی وضع داری اور وہی طور طریقے مگر کسی کوچوں کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی حمزہ تو کبھی کبھی مذاق میں کہہ بھی دیتا۔ ”اماں تو اب تک 1857 میں جی رہی ہیں۔“ تب کوئی بہن لقمہ دیتی۔ ”ہاں تو اس وقت جنگ آزادی ہوئی تھی۔“ دوسری فوراً بولتی۔ ”تو ہم بھی گھر میں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں جدید اور قدیم رسم و رواج“ بڑے بھائی کی موجودگی میں کسی کی بلہ جگہ کرنے کی مجال نہیں ہوتی تھی مگر وہ خود ہی چشم پوشی کر گئے اور بارات کے ساتھ جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ گھر پر بارات کا استقبال کریں گے۔ سب ان کی عادت سے واقف تھے اس لیے کسی نے اصرار نہیں کیا اور حمزہ دلہن بیاہ لائے۔

اماں بی اس گھر کی سربراہ تھیں جنہوں نے شوہر کی وفات کے بعد تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کو بڑی محنت سے پالا تھا مگر وہ اسی مقولے کی قائل تھیں کہ ”کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے“ اماں بی بڑی بخوری سے حمزہ کی شادی کے لیے راضی ہوئی تھیں کیونکہ اصولاً تو بڑا ہونے کی وجہ سے یوسف کا نمبر پہلا تھا مگر انہوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ ان کو اپنی بھانجی اقراء بے حد پسند تھی اور خالہ کو بھی جلدی تھی یوں بھی بڑے بھائی کا کوئی کب تک انتظار کرتا وہ تو شادی کے نام سے ایسے بھاگتے تھے جیسے کو اتیر سے اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی وجہ سے کسی کی بھی شادی

میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اماں بی بڑے سے پہلے چھوٹے کی شادی کرنے میں ہچکچا رہی تھیں کہ چھوٹے کی دلہن آجائے اور بڑا بیٹا رہے، خوش شکل اسمارٹ شہر کے بہت بڑے ڈاکٹر معقول آمدنی اب تو عمر بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے انہیں اکثر، ڈاکٹر رانیہ کے ساتھ دیکھا تھا جو ان کے انڈر کام کرتی تھی خوش شکل، بنجیدہ اور تین دنوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے مگر اماں نے سن کر صاف منع کر دیا۔ انہیں ہمیشہ سے یوسف کے لیے اقراء پسند تھی مگر جب یوسف تیار نہ ہوئے تو انہوں نے حمزہ کے لیے بہن کے آگے چھوٹی پھیلا دی اور انہوں نے ہاں کرنے میں دیر نہیں لگائی زیب النساء کو تو تینوں ہی بھائی بے حد پسند تھے اس لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی یوں اقراء حمزہ کی دلہن بن کر گھر آ گئی۔ اماں کو غصہ تو بہت تھا لیکن یوسف بولنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے سب سے الگ تھلک، حد درجہ خاموش، تنہائی پسند ماں تو کیا بہن بھائیوں سے بھی گفتگو کی نوبت کم ہی آتی تھی شادی میں اقراء کی چھوٹی بہن فرودا بھی شریک تھی جس کی ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے کم ہی کسی سے ملاقات ہوتی تھی کلیوں کی طرح نازک، پیاری سی، بے حد شوخ و شنگ اور شریر لگتا تھا جیسے جسم میں پارا بھرا ہوا ہوا ایک منٹ چلی نہ بیٹھنے والی۔ اماں کے ذہن میں ابراہیم کا سراپا گھوم گیا۔ خوش شکل، بدلہ رخ اور خوش مزاج۔ دونوں کی جوڑی خوب جے گی انہوں نے فوراً ہی اپنی چھوٹی بہن زیب النساء کو جالیا۔

”بھئی ہم بتا دیر رہے ہیں فرودا ہماری ہے اسے ہمیں دے دو۔“ وہ بہن کی طرف جھک کر بولیں۔ ”دے دو کیا مطلب.....! دے دی وہ آپ کی ہی

ہے کہیں تو آج ہی چھوڑ جاؤں۔“ وہ شرارت سے  
 نہیں، ”نہیں خیر لینے تو میں ابراہیم کے ساتھ ہی  
 آؤں گی۔“ انہوں نے خوش ہو کر کہا زب النساء  
 سن کر خاموش سی ہو گئیں پھر بھیجتے ہوئے بولیں۔  
 میں تو سمجھ رہی تھی آپ یوسف کے لیے کہہ رہی  
 ہیں..... کیا بتاؤں میری بہن یوسف تو پیٹھے پر  
 ہاتھ نہیں رکھنے دیتے انہیں ایک کلمہ وی ڈاکٹر پسند  
 آگئی ہے اور اس کے لیے جوگ لے لیا ہے اب ان  
 کو کون سمجھائے مجھے یہ پسند و سہ کی شادیاں ایک  
 آنکھ نہیں بھاتیں بھلا بتاؤں باپ مر گئے ہیں کیا  
 پڑھایا لکھایا معاشرے میں سر اٹھا کر بچنے کے قابل  
 بنایا تو کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ اپنی پسند سے اولاد  
 کی شادی کریں۔ اماں بی بی تک کر بولیں تو زب  
 النساء بھی چپ نہ رہ سکیں ”دیکھیں باجی میں تو خدا  
 لگتی کہوں گی پسند کی شادی کی نہ مذہب میں  
 ممانعت ہے نہ معاشرے میں تو آپ کیوں ظالم  
 سامان بن رہی ہیں کر دیں اس ڈاکٹر سے شادی آخر  
 زندگی تو ان دونوں کو ہی گزرانی ہے۔“ چھوٹی بہن  
 کی بات نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی ”بس  
 بس بہن ہونے بہن ہی رہو میری ماں بننے کی کوشش  
 مت کرو۔ یوسف کو میری مرضی سے شادی کرنا  
 ہوگی ورنہ بیٹھے رہیں ساری عمر کنوارے۔“ اماں بی  
 ایسی ہی تھیں ہٹ دھرم ضدی اور سخت مزاج۔ فروا  
 کے کانوں میں بھی بھٹک پڑی تو وہ لڑکیوں کے  
 نرنے میں سے نکلی اور اندھا دھند باہر لپکی یوسف  
 بھی اسی وقت اندر آ رہے تھے وہ دوڑتی ہوئی ان  
 سے جا گلگرائی اگر یوسف بانهوں کا سہارا نہ دیتے تو  
 وہ چاروں خانے چت ہو جاتی ”دیکھ کر نہیں چلتیں  
 کیوں پاگلوں کی طرح بھاگ رہی ہو!“ انہوں نے  
 گلوں کر کہا تو وہ فروا ہی کیا جو چپ ہو جائے چمک کر

بولی ”آپ دیکھ لیتے آپ کی آنکھیں نہیں ہیں  
 کیا؟“ یوسف کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اس طرح  
 آج تک کسی نے ان سے بات نہیں کی تھی ”آپ  
 ہیں کون جو اس طرح دندنا پی پھر رہی ہیں“ وہ گلوں کر  
 بولے۔ ”آپ خود کو سے فرصت ہو تو دیکھیں نا  
 کہاں سے آئی ہوں، کون ہوں“ پھر وہ سر اٹھا کر فخر  
 سے بولی ”اقراء کی چھوٹی بہن یعنی آپ کی کزن  
 ایم ایس سی کی طالبہ اور کچھ.....“ وہ ان کی آنکھوں  
 میں آنکھیں ڈال کر بیباکی سے بولی تو یوسف دنگ  
 رہ گئے اور برا سامنا کرنا اندر بڑھ گئے۔

چھوٹی بہن زب النساء کا گھر ان کے قریب  
 ہی تھا اس لیے آنا جانا لگا ہی رہتا تھا وہ فروا کی  
 خوبصورتی سے متاثر ہو کر بہن سے کہتے تو بیٹھی تھیں  
 مگر اپنی جلد بازی پر اب پچھتا رہی تھیں ابراہیم کو  
 بھی پتا نہیں تھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نادرون  
 ایریا زکھونے گیا ہوا تھا اقراء اور فروا میں زمین  
 آسمان کا فرق تھا اقراء نے گھر میں قدم رکھتے ہی  
 سب کے دلوں میں جگہ بنالی تھی لگتا ہی نہیں تھا وہ  
 اس گھر کی بہو ہے دونوں چھوٹی ننڈیں بھی بھانج پر  
 فدا تھیں یوسف کی خشک مزاجی کے باوجود اقراء ان  
 کا ہر طرح خیال رکھتی۔ فجر کی نماز پڑھ کر وہ سیدی  
 ساس کے کمرے میں آتی جھک کر سلام کر کے  
 ڈھیروں دعا میں لیتی۔ بھلا آج کل کی لڑکیوں میں  
 یہ ڈھنگ اور سلیقہ کہاں کہ شادی کے فوراً بعد صبح  
 اٹھ جائیں اور سرسرایوں کو اہمیت دیں آج کل تو  
 شادی شدہ جوڑا دوپہر کی خبر لاتا ہے جبکہ فروا اس  
 کے بالکل الٹ تھی ہوش میں رہنے کی وجہ سے اس  
 میں خود اعتمادی اور بے باکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی  
 اس کا زیادہ تر وقت بہن کے سرال میں ہی گزرتا  
 جس پر اماں کو حیرت ہوتی تھی بے شک یہ اس کی

میں بھوت ہو رہی تھی ” کیا ہو گیا ہے فردا نہیں  
..... خالہ نے تو خود ابراہیم کے لیے تمہیں پسند کر لیا  
تھا اور میں تو بہت خوش تھی۔“ اقراء متانت سے  
بولی۔

”وہ گھونچو مجھے پسند نہیں مجھے یوسف اچھے لگتے  
ہیں۔ انہی سے شادی کرنا چاہتی ہوں تم کیسی بہن ہو  
کوشش نہیں کرتیں.....“ وہ جھجک بولی اور اقراء کو ہنسی  
آگئی ”فردا کیوں دکانداری نہیں کہ تم ایک کپڑا چھو کر  
دوسرا پسند کر لو بڑے بھیا جیتے جاگتے انسان ہیں ان کی  
اپنی مرضی اور پسند ہے تم زبردستی نہیں کر سکتیں آخر  
ابراہیم میں کیا برائی ہے“ اقراء نے پیار سے پوچھا  
”پھر وہی سرخے کی ایک ٹانگ نہیں پسند مجھے ابراہیم  
میں شادی صرف یوسف سے کروں گی۔“ وہ جیخی تو  
اقراء کو بھی غصہ آگیا ”تم پاگل ہو گئی ہو بڑے بھیا  
باشعور انسان ہیں ان کی اپنی پسند ناپسند سے..... وہ  
پہلے ہی کسی کو پسند کرتے ہیں آج نہیں تو کل اماں  
راضی ہو ہی جائیں گی تم کیوں اپنا تماشا بنا رہی  
ہو.....“ اقراء نے محل سے سکھایا تو ایک مرتبہ پھر جھنجھ  
گئی۔ ”کیا وہ مجھ سے زیادہ بڑھ چکی تھی اور حسین ہوگی  
جب خالہ اس کے لیے راضی نہیں تو پھر کیوں  
نہیں.....!“ اسی لمحے یوسف اندر داخل ہوئے شاید  
انہوں نے سب کچھ سن لیا تھا وہ سنجیدگی سے  
بولے ”فردا مجھے لگتا نہیں کہ تم اقراء کی بہن ہو اتنی  
پیاری اور بے جالی تو ہم لڑکوں میں نہیں تم نے کہاں  
سے سیکھ لی۔ کیا ڈگریوں نے تمہیں یہی سب کچھ سکھایا  
ہے پسند کرنا کوئی گناہ نہیں مگر یوں پیاری سے اعلان  
کرنا لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا شرم و حیا بھی کوئی چیز  
ہوتی ہے پھر اماں نے تمہیں ابراہیم کے لیے پسند کیا  
تھا پھر میں سچ میں کہاں سے آگیا۔ خود کو اپنی نظروں  
میں اتارنا گراؤ کہ عورت کی عظمت، عصمت اور شرم و حیا

خالہ کا گھر تھا لیکن اب تو اس کا ہونے والا سسرال  
بھی تھا مگر اس کا جب دل چاہتا منہ اٹھائے چلی آتی  
خاص طور پر جب یوسف گھر میں ہوں تو اس کے  
گرد ہی منڈلائی رہتی تو اماں بی کو عجیب لگتا لیکن وہ  
بھی آخر اسی کی خالہ تھیں تنگ آ کر انہیں زیب  
النساء سے کہنا ہی پڑا ”اے لویہ کیا ڈھنگ ہیں فروا  
کے ویسے تو وہ میری بھانجی ہے مگر اب تو وہ اس کا  
ہونے والا سسرال بھی ہے بیشک ابھی میں نے اس  
کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا ہے مگر اس کے علم میں تو  
ہے ناں.....“ زیب النساء شرمندہ ہو گئیں پھر  
غجالت سے بولیں ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں تو  
خود عاجز آگئی ہوں اس کی حرکتوں سے میں ہوش  
بھیجنے کے تحت خلاف تھی مگر ضد کر کے چلی گئی۔“ پھر  
جھنجھکتے ہوئے شرمندگی سے بولیں ”مجھے آپ سے  
ایک اور بات کرنی تھی ابھی تو بات گھر کی گھر میں  
ہی ہے وہ ابراہیم کے لیے منع کر رہی ہے۔“

”ہاں تو ابھی تو یہ بات ہم دونوں تک ہی ہے  
ختم کر دیتے ہیں“ اماں بی لا پر وای سے بولیں خس  
کم جہاں پاک وہ تو خود فردا کے حق میں نہیں تھیں  
مگر بہن کی ناراضگی کے ڈر سے خاموش تھیں ”وہ  
یوسف کے لیے راضی ہے“ زیب النساء نے  
ڈرتے ڈرتے زبان کھولی ”کیا ہو گیا ہے تمہیں  
لڑکی کو بالکل ہی سر پر چڑھا لیا ہے میں نے یوسف  
کی پسند کو مت نہیں لگا یا اور یہ لڑکی اپنی مرضی سے بر  
مانگ رہی ہے کیا زمانہ آگیا ہے گھر کی بات بھی میں  
مان بھی لیتی لیکن تم تو جانتی ہو یوسف کو، بھئی نہیں  
مانے گا اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے اس ڈاکٹر کے لیے  
.....“ فردا نے سنا تو اقراء کے پاس پہنچ گئی۔ ”یہ  
سارا فساد تمہارا پھیلا یا ہوا ہے تم چاہتی ہی نہیں کہ  
اس گھر میں آؤں اور عیش سے رہوں۔“ وہ غصے



سے فوراً خون کی ضرورت تھی جو گھر کے کسی فرد کا بیج نہیں کر رہا تھا۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں میرا بلڈ بیج کر جائے گا آخری کو خون میں دے دوں گی۔“ ڈاکٹر کے اس ایثار پر سب حیران تھے ”نرس یہ ڈاکٹر کیا ہر مریض کی اسی طرح مدد کرتی ہے؟“ اقراء نے ایک نرس کو روک کر بے قراری سے پوچھا۔ ”یہ ڈاکٹر انسان نہیں فرشتہ ہے بے حد خدا ترس نیک اور ہمدرد ہم تو حیران ہوتے ہیں کسی مسیحا ہے جس کو اپنی کوئی فکر ہی نہیں پورا ہاسپٹل ان کا گردیدہ ہے جو مریض ایک مرتبہ ان کے پاس آجائے پھر کسی اور سے علاج کرانے کو تیار نہیں ہوتا۔ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ یہاں ضرورت مندوں میں لٹا دیتی ہیں ہم سب تو ان کو ماڈرن زمانے کا ”حاتم طائی“ کہتے ہیں۔“ دوسری طرف دونوں بینیں ڈاکٹر سے پوچھ رہی تھیں ”آپ کا ہماری اماں بی سے کیا رشتہ ہے جو آپ نے ایک اجنبی کو اپنا خون دے دیا؟“ ..... ”وہی رشتہ جو ایک ڈاکٹر کا مریض سے ہوتا ہے جان پہچان ضروری نہیں.....“ یوسف کو اطلاع نہیں دی گئی تھی لیکن حمزہ اور ابراہیم مسلسل اماں بی کے پاس تھے اور ڈاکٹر کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے آخر ایک دن اماں بی نے تنگ آ کر کہا ”میں مانتی ہوں یہ عام ڈاکٹروں کی طرح خردماغ، بد مزاج اور جڑی نہیں ہے بلکہ بے حد ہمدرد اور پر خلوص ہے مگر تم دونوں کس خوشی میں اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہو ابراہیم کی تو خیر ہے مگر حمزہ، اقراء نے سنا تو اس کو برا لگ جائے گا۔“

”اقراء کی تو آپ نے خوب کئی اماں وہ تو خود سارا دن تعریفیں کر کر کے ڈاکٹر کی میرے کان کھاتی رہتی ہے۔“ اماں نے ایک لمحے سوچا پھر ابراہیم کے کان میں سرگوشی کی ”کیا خیال ہے تمہارے

بے معنی ہو کر رہ جائے رہا رانیہ کا سوال تو اماں مائیں یا نہ مائیں میں اس کا ساری زندگی انتظار کروں گا وہ بھلے تم سے زیادہ خوبصورت نہ ہو مگر اس کا اندر بہت خوبصورت ہے۔“ فردا سے ایک لفظ نہ کہا گیا وہ فوراً باہر چلی گئی اقراء میں نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ ”بھئی تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو ہر شخص اپنے فعل کا خود مدد دار ہے مجھے تو حمزہ کی قسمت پر رشک آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتنا اُمول ہیرا اس کی جھولی میں ڈال دیا.....“ انہوں نے شفقت سے اقراء کے سر پر ہاتھ بھیرا اور باہر نکل گئے۔

پورا گھر اماں بی کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا لیکن رانیہ کے لیے اماں بی نے اپنا دل پتھر کا کر لیا تھا حالانکہ یوسف پہلو بھٹی کی اولاد ان کے جگر کا ٹکڑا اور بے حد عزیز تھا۔ مگر وہ اپنی ”نا“ کو ”ہاں“ میں بدلنے کے لیے تیار نہیں تھیں اور یوسف نے تو جیسے کچھ نہ کہنے کی قسم کھالی تھی آج کل وہ ٹریننگ کے سلسلے میں ایک ماہ کے لیے امریکہ گئے ہوئے تھے اور اماں بی نے ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر لڑکیاں دیکھنا شروع کر دی تھیں جن کا ساتھ صرف اقراء ہی دے رہی تھی اور اماں بی کو یقین تھا اس مرتبہ وہ یوسف کو مٹا ہی لیں گی۔ اس دن بھی وہ اقراء کے ساتھ ایک لڑکی دیکھنے جا رہی تھیں جب گاڑی سے اترتے ہوئے شوار کا پانچہ پاؤں میں پھنسا اور وہ منہ کے بل گریں اقراء کی توجہ نکل گئی وہ بیہوش ہو گئی تھیں اور سر سے بری طرح خون نکل رہا تھا ڈرائیور کی مدد سے انہیں گاڑی میں ڈال کر اقراء ہاسپٹل دوڑی اور امیر جنسی وارڈ میں موجود ڈاکٹر نے ان کا فوراً ٹریجنٹ شروع کر دیا۔ اس دوران اقراء کی کال پر سب ہی ہاسپٹل آگئے تھے ایک تو ان کی عمر تھی دوسرے خون زیادہ بہنے کی وجہ

بڑھ کر خیال رکھا کہ "اماں بی آپ نے ڈاکٹر سے  
 اس کا نام نہیں پوچھا۔" یوسف نے مسکرا کر سوال  
 کیا۔ "اے بٹو مجھے اس کے نام سے کیا لینا دینا پس  
 مجھے پسند ہے۔" اماں بی لا پرواہی سے بولیں "سن  
 تو لیں یہ ڈاکٹر رانیہ ہیں جنہیں آپ نے بغیر دیکھے  
 ہی مسٹر کر دیا تھا۔" اماں کی آنکھیں حیرت سے  
 پھٹ گئیں اور لگا جیسے ان کے قریب بم پھٹا ہو سکے  
 طاری ہو گیا ان پر۔ اس دوران ڈاکٹر رانیہ خاموشی  
 سے باہر جانے لگی تو اماں نے زور سے آواز دی  
 "رانیہ" ڈاکٹر حیران ہو کر پلٹی کیونکہ آج تک انہوں  
 نے نام سے نہیں پکارا تھا۔ "ادھر آؤ میرے پاس"  
 وہ رعب سے بولیں اور رانیہ گھبرا کر ان کے نزدیک  
 آ گئی "اپنا ہاتھ ادھر دو" رانیہ نے گھبرا کر یوسف کی  
 طرف دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا اماں بی نے  
 اپنے ہاتھ سے سونے کا چھلانا کر اس کی انگلی میں  
 پہنایا پھر گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولیں "مجھے  
 معاف کر دینا ہیرے کو بغیر دیکھے بغیر پرکے مسٹر  
 کر دیا تھا مجھے اپنے بیٹے کی پسند پر ناز ہے اور اپنی  
 ضد پر شرمندگی۔ میں جلدی ہی تمہارے گھر آؤں  
 گی مجھے یقین ہے وہ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"  
 پھر وہ یوسف کی طرف گھومیں "بس اب میں اس  
 ہیرے کی روشنی سے اسے گھر کو منور کرنے میں دیر  
 نہیں لگاؤں گی۔" ان کی آنکھوں میں خوشی کے  
 آنسو تھے ایک طرف رانیہ بانہوں میں تھی اور  
 دوسری طرف یوسف ان کی ہناہ میں..... اور پھر پورا  
 کمرہ شور سے گونج اٹھا یوں لگتا تھا سب کو پہلے ہی  
 اس سین کا پتا تھا دونوں بھائی باقاعدہ خوشی سے  
 ہنسنے لگے اور اتر آئے اور دونوں ہمیں رانیہ  
 گلے لگ رہیں تھیں جس کا شرم سے چہرہ لال ہو گیا تھا  
 اور خوشیاں چاروں طرف رقص کر رہی تھیں۔ ☆

لیے لسی رہے گی مجھے تو بہت اچھی لگی۔" بستر پر  
 لیٹے لیٹے اماں بی کو ہری ہری سوچ رہی تھی "توبہ  
 کریں اماں بی" ابراہیم نے دونوں ہاتھوں سے  
 گال پیٹے "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا بس بڑے بھیا  
 کو ڈاکٹر کے روپ میں برداشت کرتا ہوں ورنہ  
 ڈاکٹر مجھے طبعی پسند نہیں بیوی ڈاکٹر ہو تو کمرہ ہاسپٹل  
 لگے گا کیونکہ پرفیوم کی جگہ وہ دوا میں اسپرے  
 کرے گی۔" ابراہیم نے مسخرے پن سے کہا تو  
 اماں بی کو ہنسی آ گئی "پتہ نہیں کہ تک مجھے ہسپتال  
 میں رہتے بڑے گا میرا یوسف بھی نہیں آیا اس کی  
 موجودگی سے مجھے بڑی ڈھارس رہتی ہے۔".....  
 "کل آرہے ہیں آپ کے لاڈلے پریشان نہ  
 ہوں وہی آپ کو ڈسپانچ کرائیں گے۔" دونوں  
 بھائیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے  
 کیے اور روم سے باہر نکل آئے۔

دوسرے دن ایئر پورٹ سے یوسف سیدھے  
 ہاسپٹل پہنچے اور اماں گلے لگ کر رونے لگیں "ارے  
 اماں بی اب تو آپ بالکل ٹھیک ہیں بازو میں بھی  
 معمولی سا ہیرا لائن فریج پر جلدی ہی پلاسٹر کھل  
 جائے گا اور سر کا زخم بھی کافی ٹھیک ہے۔ ویسے اب  
 کو کسی نے بتایا نہیں میں اسی ہاسپٹل میں کام کرتا  
 ہوں۔"..... "اچھا" اماں بی کو بڑی حیرت ہوئی  
 اسی لمحے ڈاکٹر اندر آئی اور سلام کر کے اماں بی کا  
 معائنہ کرنے لگی پھر اس نے یوسف کے کان میں  
 سرگوشی کی "یہ تمہیں کسی لگی میں تو فدا ہو گئی ہوں یہ  
 میری پسند ہے اب میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی پورا  
 گھر عاشق ہو گیا ہے اس ڈاکٹر پر..... تعریفیں سن  
 سن کر میرے کان پک گئے ہیں مگر میں بہت خوش  
 ہوں دل جیت لیا اس نے میرا یہ ڈاکٹر تو ہے ہی  
 تعریف کی مستحق۔ کوئی جان نہ پہچان مگر اپنوں سے

## فصلِ خار

.....

ایک اللہ ایک رسول، اور ایک کتاب کے ماننے والے نجانے  
کیوں گروہوں، فرقوں اور برادری کے چکر میں پڑ گئے حالانکہ  
دکھ اور ناکامیوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا.....

.....

نیلیم کو اپنی کلاس فیلو کی سالگرہ میں گئے بہت  
دیر ہو گئی تھی رات کے نو بج رہے تھے اس بات پر  
ای جی بہت غصے میں تھیں اور ٹہل رہی تھیں لمحہ بہ لمحہ  
ان کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔



آسیہ بنت عبداللہ

صالحہ خاتون کے پڑوس میں رہنے والی یہ فیملی اپنے خیالات و افکار میں کچھ عجیب ہی تھی اور پھر اپنے خیالات کو اتنی اونچی آواز میں بولنا کہ گھر کے سامنے سے گزرنے والے بھی بخوبی مستفید ہوتے تھے پھر صالحہ کا گھر توان کے گھر سے جڑا ہوا تھا اب بھی وہ برآمدے کے تحت پوش پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھیں کہ ایک دم ایک چٹکھڑا سنا دی۔

”کہاں مرگئی تھی..... اب آ رہی ہے نوبے رات کو..... یہ شریف لڑکیوں کے چھن ہوتے ہیں؟“

”امی جی! سوری..... خفا نہ ہوں مجبوری تھی میں نے بہت کوشش کی کہ جلدی آ جاؤں مگر ثانیہ کی امی کو بھی اسی طرف آنا تھا اپنی بہن کے پاس انہوں نے کہا کہ جاؤں میں چلتی ہوں تمہیں بھی گھر چھوڑ جاؤں گی ابھی وہ مجھے روزانہ سے تک چھوڑ گئی ہیں۔“

”اچھا بس آئندہ ایسا نہیں ہوگا ارے فون ہی کر دیا ہوتا کیا وہ بھی نہیں ہو سکتا تم سے؟“

”وہ میں جانے کی تیاری میں بھول گئی فون گھر پر ہی رہ گیا تھا اور نمبر زبانی تو مجھے یاد نہیں اپنے گھر کا مگر ایک بات ہے آپ بھیا کو تو کچھ نہیں کہتیں وہ دو بجے رات کے بعد ہی گھر آتے ہیں۔“

”وہ مرد ہے اس کی برابری کرے گی؟ ارے مرد کا کیا ہے وہ جیسے چاہے رہے، اپنی مرضی کا مالک و مختار اور پھر اس کا کیا جڑتا ہے مسئلہ تو لڑکی اور عورت کا ہے دامن پر بندائی کی الکی سی چیخت بھی پڑ جائے تو عمر بھر کے لیے راندہ درگاہ ہو جاتی ہے۔“

یہ ارشادات اعلیٰ صالحہ نے بھی سنے اور اخبار پڑھتے ہوئے زاہد نے بھی اور بے ساختہ اپنی ماں کی طرف دیکھا وہ کتاب بند کیے کسی گہری سوچ میں تھیں۔

”امی کیا یہ صحیح کہہ رہی ہیں؟“ زاہد نے جھپکتے ہوئے سوال کیا وہ چونک گئیں ”نہیں یہ بالکل غلط کہہ رہی ہیں جس طرح عورت کی عزت قیمتی ہے اسی طرح مرد کی بھی پاک دامنی اللہ کو مطلوب ہے قرآن پاک میں کہا گیا عورتیں اپنے آپ کو چھپا کر رکھیں اور اپنی عزت کی حفاظت کریں مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عزت کی حفاظت کریں“

”تو امی جان آپ سمجھائیں نہ انہیں“ زاہد نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”کوشش کی ہے میں نے مگر جو باتیں، جو اصول کبھی میں پڑے ہوں وہ نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں لوگ انہیں چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔“

”صحیح کہہ رہی ہیں آپ..... ہم سے بھی ایسے بہت سے کٹ چکی لوگ ٹکراتے رہتے ہیں۔“

”بس پھر ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے ہدایت دینا تو بس اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اچھا اب تم سونے کی تیاری کرو، صبح فجر میں اٹھنا ہوتا ہے۔“

صالحہ بیگم کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھے ان کے شوہر سرکاری محکمے میں مسخیر کلرک تھے..... مناسب تنخواہ اور ذاتی مکان کی وجہ سے سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے تھے۔

محکمے کی مسجد کی کمیٹی کے صدر تھے اور خزانچی بھی۔ ایسے محکمے میں جہاں رشوت کا بازار گرم رہتا تھا وہ اور ان کے کچھ کو لیگ حلال روزی کمانے کے عہد پر ڈٹے ہوئے تھے یہ سراسر اللہ کی توفیق تھی مگر بڑا بیٹا آصف اپنے ابا کے دفتر میں ہی جاب کرنا تھا اس کا تعلق ٹیکنیکل کے شعبے سے تھا نئے آنے والے ٹرینر کو ٹریننگ دینا کسی اسٹوڈنٹ سے رقم لے کر پاس کرنے کی روایت اس کے پاس بھی نہ پھسکی



ہوشیار ذہن کا ہے آٹھویں پاس ہے اسے بورڈ کے امتحان سے ڈر لگتا تھا تو نویں دسویں کے امتحانات نہیں دیئے اور ضرورت بھی کیا ہے باپ کا اتنا بڑا جرنل اسٹور ہے اسی پر بیٹھتا ہے چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے صبح سے دپہر تک بھائی جی بیٹھتے ہیں اور دوپہر سے رات تک میرا داماد بیٹھتا ہے گزارہ ہو جاتا ہے۔ باپ بیٹے کی الگ الگ موٹر سائیکل ہے اور کیا چاہیے شکر ہے میری بچی کا مناسب وقت پر رشتہ ہو گیا بلکہ اس کا بہت پہلے ہی ماموں نے رشتہ مانگ لیا تھا۔“

”چلیں اچھی بات ہے اللہ تعالیٰ ہر لڑکی اور ہر لڑکے کو خوشگوار شادی شدہ زندگی نصیب کرے، آمین۔“

☆.....☆

آصف اور زاہد دونوں کیرم کھیل رہے تھے کافی دیر کھیلنے کے بعد انہوں نے ٹائم دیکھا اور چونک گئے ”ارے رات کے دو بج رہے ہیں ابھی امی ابا اور طاہرہ نہیں آئیں..... بہت دیر ہو گئی ہے بھی۔“

”بھائی آپ کو کیا یہ نہیں ہے کہ کراچی میں بارہا تیس کتنی کتنی دیر میں آتی ہیں اور جب تک بارات نہ آ جائے لڑکی والے پچارے انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے یوں دیر پر دیر ہوتی چلی جاتی ہے۔“

”مگر یہ دیر ہوتی کیوں ہے؟“ آصف نے جھنجھلا کر کہا۔

”اصل میں دولہا کے خاندان کی ہر خاتون تو پارلر چلی جاتی ہیں اب طاہرہ بے شکلیں بدلنے میں ٹائم تو لگتا ہے اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے آج کل دولہا بھی پارلر جاتے ہیں“ زاہد نے معلومات بہم پہنچائیں۔

یہی طاہرہ ابھی فرسٹ انیر میں تھی اور کمر کے قریب ہی گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھی۔ رہے زاہد میاں؟ تو یہ کچھ علیحدہ مزاج رکھتے تھے..... زاہد کو اردو لٹریچر پسند تھا وہ لکچرار بننا چاہتے تھے۔

تو بات یہ ہے کہ تربیت کی ضرورت تو دونوں ہی کو ہے انہی کو آنے والی سسل پروان چڑھانا ہے ماؤں کی ساری زندگی بیٹیوں کے اچھے نصیب کی دعائیں کرتے گزرتی ہے مگر بد بختوں کے حوالے کر کے کہیں نصیب اچھے ہوا کرتے ہیں؟

”امی رضیہ خالہ آئی ہیں“ طاہرہ نے آواز دی ”اچھا تم ان کے ساتھ بیٹھو میں آتی ہوں“ صالحہ نے جواب دیا وہ ظہیر کی نماز کے لیے وضو کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم؟“ وہ دوپٹے سے پانی خشک کرتی ہوئی اندر آئی تھیں ”کیسے سب خیریت ہے؟“

”ہاں اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے بس یہ کارڈ آگئے تو میں نے سوچا قریب کے لوگوں کو میں خود ہی دے آؤں“ انہوں نے جواب دیا۔

”نیلیم کی شادی ہم نے طے کر دی ہے۔“

”اچھا مبارک ہو آپ کو ویسے کہاں کی ہے؟“

”میرا بھتیجا ہے اپنے ماموں کے گھر جاری ہے تمہیں تو پتہ ہے ہم خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے لڑکے تو پھر بھی کر لیتے ہیں مگر لڑکیاں خاندان ہی میں بیاہی جاتی ہیں“ انہوں نے بڑے فخر سے کہا (یہاں بھی لڑکوں کو استنسا حاصل ہے)

”بہن گر خاندان میں کوئی مناسب رشتہ نہ ہو تو؟“

..... ”پھر بھی جیسے لڑکا اندھا ہوا، لنگڑا ہوا، پاگل ہو کر لڑکی خاندان میں ہی جائے گی۔“

”اپنی نیلیم کے دولہا تو ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟“ صالحہ نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں ہاں میرا بھتیجا خیر سے تندرست توانا اور

”لاحول ولا قوۃ“ زاہد نے منہ بنا کر کہا۔ ”سنو میں فون کر کے صورتحال معلوم کروں؟“

”چلو کچھ دیر اور دیکھ لیتے ہیں دس منٹ بعد کر لیتا فون“ ابھی وہ دونوں کیم کی گونیاں سمیٹ ہی رہے تھے کہ کال بیل بجی اور کیم کھلنے پر تھکے تھکے سے تینوں افراد گھر میں داخل ہوئے اور کمرے میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”کیا ہوا آپ لوگ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں..... شادی میں خیریت تو رہی نا؟“ آصف نے پوچھا۔ ”توبہ تو یہ کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں“ صالحہ نے چادر اتار کر تہہ کرتے ہوئے کہنے لگیں ”ارے بھئی رضیہ کی سمدھن جوان کی بھابھی بھی ہیں اور ان کی چاروں بیٹیاں نکاح ہوتے ہی اکڑ دکھانے لگیں دولہا کی اماں نے آواز لگائی او دلہن کی اماں تمہیں تو پتہ ہی ہے میرے بیٹے کو نظر لگ جاتی ہے اور آج تو اس کی چھب ہی الگ ہے تم نے صدقے کی سرغی کالی منگوائی کہ نہیں؟“ ”ہاں بھابھی منگوائی ہے ابھی بھجواتی ہوں“ رضیہ نے لپک کر کہا ”تو جلدی بھیجونا گاڑی سے اترتے ہی اس کے سر سے وار کر کہیں دور چھوڑ آئے سرغی کو“

”چلو جی اب وہ مرغی کسی کتے کا شکار ہو جائے گی یا پھر کسی اٹھائی کیمرے کے حوالے جو اس کا بہن بچا کر شوق سے کھائے گا..... زب نے لے کر“ زاہد نے کہا۔

”امی صدقے سے کیا ہوتا ہے اور کیوں کرتے ہیں؟“ آصف نے سوال کیا۔

”بیٹا صدقے کا اصل معافی تو یہ ہے کہ ہر وہ کام جو اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے وہ صدقہ ہے اب مرغی کو اوپر نیچے گھما کر ویرانے میں یا

آبادی میں چھوڑ دینے سے اللہ تعالیٰ کو خوشی نہیں ہو سکتی وہ تو اللہ کے بندوں کی مدد کرنے سے خوش ہوتا ہے اگر یہ مرغی یا اس کی قیمت لے کر صدقے کی نیت سے کسی غریب کی مدد کر دی جائے خواہ رشتہ دار ہو غیر شرط یہ ہے کہ ضرورت مند ہو تو صدقے کے دینے سے مصیبت ٹل جاتی ہیں۔“

”مگر دولہا میاں جو ایک بلائے جان مستقل اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں“ زاہد نے شوشہ چھوڑا اور سب ہنس دینے سے سنجیدہ ماحول میں تھوڑی سی خوشگوار آگئی۔

”اور امی جی دولہا کی اماں کتنا اکڑ کر بول رہی تھیں“ طاہرہ نے تبصرہ کیا۔

”ہاں اماں کیا سارے ہی ایسا بول رہے تھے اور یہ بات، یہ لہجہ انتہائی گھٹیا اور جاہل لوگوں کی پہچان کرواتا ہے جیسے پرانے زمانے میں بادشاہ کی فوج جس ملک کو فتح کر لیتے تو اس کی ہر چیز کو برباد کر دیتے اور عوام پر ظلم کرتے اس طرح وہ اپنی فتح کا اعلان کرتے آخر دولہا والوں نے بھی تو دلہن اور اس کے خاندان کو فتح کیا ہے نا؟“ صالحہ بولیں۔ ”توبہ تو یہ کتنے خراب لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح کرتے ہیں“ طاہرہ نے کہا۔ ”بس بیٹی اللہ کو ناراض کرتے ہیں ہمارے دین میں جتنا زیادہ زور اچھے اخلاق پر دیا گیا ہے ایسے لوگ اتنی ہی اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور بیٹی ہمیں بھی اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہم اخلاق حسنہ کے کس درجے پر ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ“ طاہرہ نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

”ہونہہ مثالیں اور محاورے خوب بنائے ہیں لوگوں نے نیلیم کے بوے اچھے اور شریف لوگوں

”ٹھیک ہے“ کہہ کر وہ چلے گئے..... آج ننھے ماموں کچھ بدلے لے سگ رہے تھے یعنی بنجیدہ سے مثلاً اگر وہ بنجیدہ نہ ہوتے تو مجھے بچن کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر یوں کہتے۔ ”اے ماسی! ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ اور قافٹ دو پیالی چائے لے کر مابدولت کے کمرے میں حاضر ہو۔“ اور میں جواب دیتی ”اچھا صاحب۔“

میں نے جلدی جلدی کچن کا کام سمیٹا اور چائے لے کر اوپر کمرے پر پہنچی دروازہ کھڑا ہوا تھا میں نے ناک کیا تو آواز آئی ”آ جاؤ“ بھاری آواز جیسے زلزلہ زکام ہو جانے پر ہوا کرتی ہے۔

اندر داخل ہوئی ان کو گہری سوچ میں پایا۔ ٹرے تپائی پر رکھ کر میں نے آواز دی۔ ”ننھے ماموں! کہاں کھوئے ہوئے ہیں؟“ ننھے ماموں میں انہیں چھینرنے کے لیے کہتی تھی وہ سچ جاتے ”ارے میں اٹھائیس سال کا نیم تحیم آدی تمہیں ننھا نظر آتا ہوں؟“

”میں نے آپ کا بیک نیم رکھا ہے، آخر اکلوتی بھانجی ہوں“ میرے پوچھنے پر وہ چونکے اور مسکرا کر میری طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں کچھ خواب تھے کچھ رنگ اور لہجہ شہد کی طرح بیٹھا۔

”ہاں سوچ تو رہا ہوں مگر بہت اچھا بہت سہانا دھنک کے ساتوں رنگ لیے ہوئے۔“

”چلیے چائے شروع کیجئے“ میں نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کیسے آپ نے کیوں بلایا مجھے؟“

”سنو کی تو اچھل پڑ گئی“ مسکراہٹ اور گہری ہوئی ”تو بتائیے نادی کیوں کر رہے ہیں؟“

”وہ..... وہ مابدولت کو ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔“

سے رشتے آئے تھے مگر رضیہ کی وہی رٹ غیروں میں نہیں دوں گی، اپنوں میں دوں گی، میں نے پوچھا آخر کیوں؟ تو بولیں اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں ڈالے گا۔ لو بھلا کوئی مارے گا بھی کیوں کیا منہ میں زبان نہیں سمجھانے کے لیے اور رہی چھاؤں کی بات تو مارنے کے بعد دھوپ یا چھاؤں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”فرق پڑتا ہے ای دھوپ میں میت جلد خراب ہو جاتی ہے“ آصف نے کہا زہد اور طاہرہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔

”نہ بیٹا مذاق نہیں اڑاتے اللہ کرے سب کچھ اچھا ہو ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔“

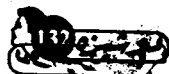
”چلو اب تم بنجئے والے ہیں اب سو جاؤ شکر ہے صبح اتوار ہے تمھاری دیر سے انھیں گے انشاء اللہ۔“

ساجد صاحب تو تھکے ہوئے تھے بیڑ پر لیٹے ہی سو گئے مگر صالحہ بیگم کی نیند ایسی رنجی کہ ساری رات تو آنکھوں میں کٹ گئی آنکھوں کے آگے مختلف سین

چل رہے تھے ہوا یوں کہ سب سے چھوٹے ماموں جان کو ایک لڑکی پسند آ گئی ساری خالادوں اور ماموں کی شادی ہو چکی تھی اور اب باقی امی سب سے چھوٹے کی بات چلانے کے موڈ میں تھیں۔

”صالحہ دو پیالی چائے بنا کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔“ ہمیشہ کی طرح آرڈر ملا میں چونکہ ان سے عمر میں بہت زیادہ چھوٹی نہیں تھی اس لیے وہ مجھ سے مختلف کھیل بھی کھیلتے جیسے لودو، کیرم اور آج کل تو وہ اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر موج منار ہے تھے۔

”جی آ جاؤں گی مگر دیکھئے کوئی کھیل نہ نکالے گا کل میرا اسائنمنٹ جمع کرانے کا دن ہے اور کام ابھی باقی ہے“ میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔



”ہائیں.....“ میں واقعی حیران تھی یہ نگاہیں جھکا کر چلنے والے مسٹر صادق و عاکف نے لڑکی کہاں دیکھ لی..... میرا دوسرا سوال لازمی طور پر یہی تھی۔

”کہاں دیکھی اور کیسی ہے؟“

”اپنی N.E.D یونیورسٹی میں، مگر تو جانتی ہو کہ انجیسٹرنگ میں بہت کم لڑکیاں آتی ہیں جس لیے سمجھو اگر کلاس میں ہیں لڑکے ہوں تو زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ لڑکیاں ساری کلاسوں کی ملا کر بھی پچاس ساٹھ بنتی ہیں دوسری بات کہ کیسی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس جینیٹکس دنیاء میں دوسری کوئی نہیں ہاں جنت کی خوروں کو دیکھ کر جتا سکتا ہوں کہ ان میں سے کس جیسی ہے!“

”اوہ..... ہو..... میں تو لا جواب ہوتی جا رہی ہوں اگر ایسی بات ہے تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟“

”میں نے سوچا پہلے تعلیم مکمل کر لوں دو راتن تعلیم نہ میں خود ڈسٹرب ہونا چاہتا تھا نہ اسے ڈسٹرب کرنا ٹھیک ہوتا مگر اب ہم دونوں ہی یونیورسٹی سے فارغ ہو رہے ہیں تو اب تھوڑا سلسلہ چل جانا چاہیے۔“

”مگر ماموں آپ کم از کم ایک سال پہلے اسے اپنی دلچسپی ظاہر کر دیتے تو آپ دونوں کی انڈر سٹینڈنگ ہو جاتی ایسا ہی ہوتا ہے ہم نے تو یہی سنا ہے۔“

”ٹھیک سنا ہے“ ننھے ماموں نے کہا۔

”تو پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ صالحہ نے پوچھا۔

”اس لیے کہ جو سچی محبت کرتے ہیں وہ اپنے حبیب کی جان، آن اور شان کی حفاظت کرتے ہیں انکی ماموں کی نگہبانی خود پر فرض کر لیتے ہیں اور

پھر وہ تو ہے ہی باوقار محتاط، کہ خود بخود احترام کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے مکمل لباس پھر اس پر بھی عبا یا پنے سر اسکارف سے ڈھکا ہوا.....“

”اور..... اور نام کیا ہے ان کا؟“

”مقدس عزیز سب اسے مس عزیز کہتے ہیں..... کسی لڑکے کو ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی سوائے نوٹس اور کتاب وغیرہ کے۔“

”اور آپ نے انہیں دل میں بسا لیا، اتنی بہت کر لی.....؟“

”کہنا محبت معجزہ ہے یہ بڑے بڑے ناممکن کام کروا لیتی ہے۔“

”اچھا تو محترم ماموں صاحب اب اسی معجزے کو ایک بار پھر رونما ہونے دیجئے اور کل ہی اُن پر اپنی جاہت کا اظہار کر دیجئے، میرا مخلصانہ مشورہ ہے یہ۔“

”کل ہی.....؟“ سوچتا بڑے گا انہوں نے سر کھجایا۔ ”اب سوچنے کا وقت نہیں ہے آپ کے پاس اور لگتا ہے دو چار دن میں فاضل کر قیس گی پھر کیا کریں گے آپ؟ میری بات یاد رکھیے کل نہیں تو کبھی نہیں، کل شام میں آپ سے مقدمہ محبت کی رپورٹ لوں گی اب میں چلتی ہوں اللہ حافظ“ میں نے چائے کی پیالیاں اٹھا میں اور تیزی سے کمرے سے نکل دی دل میں ہنس رہی تھی ابھی جذبات عروج پر ہیں ابھی بات کر بھی لیس گے اگر ٹال دیا تو بات ملتے جاتے گی۔

☆.....☆

صبح فجر کے بعد باجی نے آ کر اس کا دروازہ زور سے بجایا ”عاکف اٹھو، نماز کے لیے بھی نہیں اٹھے، امی کی طبیعت خراب ہے۔“

یہ جملہ کان میں پڑتے ہی اس نے چادر ایک





سے نکل گیا۔

پہلا پیر یفری تھا بلکہ پہلا کیا ستارے ہی فری تھے۔ فاضل ایک نام ہو چکے تھے گھر سے نکلا تو امید اور ناامیدی کی کیفیت تھی جب سوچا کہ اس سے بات کیسے کروں گا تو ہمت پست ہونے لگتی کیا یہ وہ اکیلے میں ملے گی یا نہیں پچھلے پانچ برسوں میں ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا وہ ہمیشہ ہر جگہ اپنے گروپ کے ساتھ ہوتی تھی نہ ہی کبھی اس نے کوشش کی لیکن اب وقت بہت کم تھا اماں کی طرف سے اس کے لیے لڑکی پسند کرنے کی ہم تیز تر ہونے والی تھی اسپتال سے گھر آتے ہی انہوں نے بیٹی اور نواسی سے تاکید کرنی شروع کر دی کہ لڑکیاں دیکھنا شروع کر دو۔ میرے رب مدد کرنا نیک سیرت شریک حیات کی خواہش کرنا تو میرا جائز حق ہے کیونکہ کسی نے خوب کہا ہے۔

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط  
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا  
اور اس کی سیرت کی خوشبو پچھلے پانچ برسوں سے مجھ تک پہنچ رہی ہے وہ رکھ رکھاؤ، ادب، آداب و حیاء اور نرم لہجہ، پاکیزہ مسکراہٹ اور وہ لباس میں مکمل حیاداری گفتگو بھی ضرورت کے مطابق نہ کم نہ زیادہ لگتا تھا الفاظ گن کر بولتی ہیں محترمہ۔

ان لمحات میں ایک دل آویز مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا تھا..... آج میری مراد پوری ہو جائے کاش.....! دوسرے ہی لمحہ خیال آیا کہیں اس کے برعکس معاملہ نہ ہو جائے ایسا بھی ہو سکتا ہے مجھے دونوں طرح کے نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے ہاں بھی اور نہ بھی ایک ٹھنڈی آہ اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلی۔

کلاس میں پہنچا تو چاروں لڑکیاں غائب

طرف چھٹکی اور دوڑ کر دروازہ کھولا۔ ”جی ہاجی!“  
”چلو جلدی سے گاڑی نکالو.....! اسپتال جانا ہے.....“

”بس ابھی نکالتا ہوں“ اس نے کلی کی، دو چھپکے منہ پر بارے اور صحن کی طرف دوڑ گیا۔ گاڑی بھائی جان کی تھی کبھی ضرورت پڑنے پر سب استعمال کر لیا کرتے تھے۔

اسپتال جا کر پتہ چلا انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے اس نے کوریڈور میں جائے نماز بچھائی اور نماز حاجت پڑھنے لگا اماں کی تو وہ جان تھا اور وہ خود اماں کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔

سلام پھیرا تو ڈاکٹر صاحب کو آتے دیکھا دونوں لپک کر آگے آئے ”پریشان نہ ہوں خیر ہوئی مائٹر سے اٹیک ہوا تھا اب مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہے دوا کے زیر اثر سو رہی ہیں آئندہ بہت احتیاط کی ضرورت ہے خاص طور پر غذا میں برہیزی کھانا اور ہاں کسی قسم کا جذباتی دھچکا یا بڑی خبر سے لازمی پرہیز کرنا ہوگا۔“

”ہاجی آپ امی کے پاس جا کر بیٹھ جائیں مگر جگنا نہیں میں ذرا مسجد جا کر فجر کی قضا پڑھ لوں۔“  
”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“

جب تک اسپتال سے چھٹی نہیں ہوئی وہ کہیں نہیں گیا بس ان کے قدموں میں بیٹھا رہا خدمت میں کھڑا رہا یوں ان کے قدموں تلے کی جنت اس کے قریب آتی گئی۔

آج وہ کتنے دنوں بعد وہ یونیورسٹی جا رہا تھا آج پھر سے صالحہ نے یاد کروایا ”وہ ضروری کام بھولنا نہیں عاکف ماموں!“ جواب میں اس نے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ”یہ بھی کوئی بھولنے والا کام ہے بس تم دعا کرنا“ یہ کہہ کر کمرے

گی؟“

”ہمارے ہاں سارے ارادے، سارے پروگرام والدین کے ہوتے ہیں، بس ہمیں تو عمل کرنا ہوتا ہے۔“

”معاف کیجئے گا میں کچھ ذاتی قسم کی بات کر رہا ہوں، میرا خیال ہے کلاس فیلو ہونے کی حیثیت سے اتنی جسارت کرلوں تو آپ برا نہیں مانیں گی!.....“

”جی ٹھیک کہا آپ نے“ پھر وہی نپا تلا انداز ”یا الہی! میں کیسے اپنے مقصد پر آؤں“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”آپ کے گھر میں اپنی والدہ کو بھیجتا چاہتا ہوں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“ یہ کہہ کر عاکف نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھ لیا یا اللہ! جو بھی جواب ملے اس کو برداشت کرنے کی مجھے ہمت دے، دل میں دعا مانگتے ہوئے اس نے اپنی پسندیدہ ہستی کی طرف دیکھا جو بونٹی کی اول دن سے آج تک اس کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، خیالوں پر چھائی ہوئی تھی۔

”میں نے کہا نا.....“ اس نے سیدھے ہو کر بیٹھے ہوئے کہا ”آپ نے شاید غور سے نہیں سنا۔“

”کیا..... کیا کہا آپ ایک بار اور دہرا دیں، عنایت ہوگی“ انداز نہایت ہی عاجزانہ تھا جیسے کوئی سوالی ہاں سوال ہی تو کر رہا تھا اپنی حالت وہی جانتا تھا لگ رہا تھا جیسے زندگی کا آخری سوال کر رہا ہو۔

”مہی کہ سب کچھ والدین کے سپرد ہے وہ اگر کسی کھبے کے ساتھ باندھ دیں تو ہم یہ بندھن بھی قبول کر لیتے ہیں“..... ”تو پھر آپ قابل احترام والدین کا ارادہ پتا دیجئے۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں برادری

تھیں۔ بس ان لڑکیوں کو تو گھر بیٹھے کا بہانہ چاہیے اب تو ویسے بھی یونیورسٹی سے فارغ ہونا ہی ہے پھر بھی آج چھٹی مارچی وہ الجھتا ہوا باہر آیا تھا مایوسی دل پر چھاری تھی دل بیٹھا جا رہا تھا محبت میں انسان کتنا کمزور دل ہو جاتا ہے؟

ایک موہوم سی امید نے اس کا یاد دیکھ لو شاید کہیں بیٹھی ہوئی نظر آجائے یکا یک نظر کے سامنے چراغ سے جل اٹھے۔ یہ کیا وہ گمراہ ٹڈ میں ایک چوڑ کے نیچے بیچ پر بیٹھی تھی اور وہ بھی بالکل اکیلی۔

یہ تو معجزہ ہو گیا چلو بھی عاکف یہ موقع شاید پھر کبھی نہ آئے..... وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ”السلام علیکم مس عزیزہ“ وہ اپنی نظریں جھکائے سوچ میں گم تھی چونک پڑی ”وعلیکم السلام“ نے پنے تلے انداز میں جواب ملا۔

”وہ آپ کی سب دوست کہاں ہیں؟ وہ نہیں آئیں؟“ جواب ملا۔ ”خیریت؟ کیا ہوا۔“

”کچھ نہیں..... بس اتفاقاً تینوں کو کسی کچھ کام آ پڑے ابھی کے بعد دیگرے تینوں کے فون آ گئے میں بھی جانے والی ہوں اکیلی بیٹھ کر کیا کروں گی، پڑھائی بھی ختم ہو گئی۔“

”اب تو آپ اکیلی نہیں ہیں!.....!“

”جی؟“ اس نے بوجھل پلٹیں اٹھائیں۔

”وہ میرا مطلب ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟“ عاکف نے سامنے پڑے ہوئے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔

”جی ضرور بیٹھ جائیں.....“

”شکریہ!.....!“ دونوں ایڑیاں جوڑ کر وہ بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کر لیں ”پڑھائی مکمل کرنے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے، آگے جاری رکھیں گی یا جاب کریں

سٹم ہے باہر کا رشتہ اگر آجائے تو لڑکی کی شامت آجانی ہے اور آنے والوں کو نکا سا جواب دے دیا جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے آپ برادری میں ہی انجیج ہیں؟“

”جی میں اپنے چچا زاد سے ٹھیکرے کی مانگ ہوں یعنی میرے پیدا ہوتے ہی چاچی نے مجھے مانگ لیا تھا اور بس۔“

”آپ کے فیائی کیا کرتے ہیں.....؟“ اس سوال پر نقدس نے تیوری پڑھائی۔

”اوہ..... آپ برائے بانیں اور نہ ہی کچھ غلط سوچیں..... میں تو بس اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہا ہوں کہ ایک پیاری سی، ٹیک سیرت لڑکی کس کے حوالے کی جا رہی ہے۔“

”جی یہ بھی بتا دیتی ہوں وہ زمیندار ہیں عرف عام میں ڈیرے کہلاتے ہیں اپنے ملازموں، ہارپوں اور گاؤں کے لوگوں سے خدمت لیتا اور عوض میں تھوڑا سا تاج دے دیتا مگر ذرا سی غلطی پر دردناک سزائیں دیتا یہی ان کا کام ہے..... میٹرک تک پڑھائی کے بعد اس نے اعلان کر دیا مجھے اب اور نہیں پڑھنا میں نے کون سی نوکری کرنا ہے اور یہ بات بڑے آرام سے مان لی گئی۔“

”ایک بار پھر معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس صورت حال پر آپ نے احتجاج کیوں نہیں کیا؟“

”کس لیے احتجاج کرتی خاندان یا برادری میں لڑکے سب اسی طرح کے ہیں بلکہ اس سے بھی کمتر جو دو چار اچھے نکلے ہیں وہ باہر ملکوں میں جا کر شادی کر لیتے ہیں۔“

اس بات پر عاکف نے بے چینی سے پہلو بدلا

اور کہا۔ ”پھر بھی آپ کو حق ہے کہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے خود فیصلہ کریں یہ حق آپ کو شریعت نے دیا ہے۔“

”غور سے سنئے میری بات.....“ اس کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا..... ”آپ کا مطلب ہے میں والدین سے بغاوت کروں..... ان کے فیصلوں کو قبول نہ کروں..... مسٹر عاکف! کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ انتہائی اقدام اٹھا کر بہت سارے لوگوں جن میں والدین، بہن بھائی سرفہرست ہیں صدمات اور رسوائی کا سامان کروں انہیں ہمیشہ کے لیے معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے سے محروم کروں؟ جن شفیق ہستیوں نے میری جان، مال، اور ناموس کی جی جان سے حفاظت کی میں انہی کو رسوا کروں؟ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے نا!“

یہ کیا کہ اک جہاں کو کیا وقف اضطراب یہ کیا کہ ایک دل کو ٹھیکنا نہ کر سکو بات چیت کے دوران مقدس نے دیکھا عاکف کا رنگ لعلی بار بدلا جب پرپوزل کی بات کر رہا تھا تو چہرہ نورانی خوشی سے چمک رہا تھا پھر جب برادری کی بات ہوئی تو غصے سے متمنا لگا جب صاف انکار ہوا تو زرد پڑ گیا پھر مگتیر کا ذکر سن کر غم کے بادل آنکھوں میں آکر برسنے کو تیار تھے.....

جانے کس ضبط سے اس نے اپنی آنکھوں کو برسنے سے روکا مگر زمانے کو اس سے کیا غرض کہ کسی پر کیا گزرتی ہے لوگ تو دم درواج اور قبیلے برادری کے نام نہاد اصول بنا کر اس کی پابندی یوں کرتے ہیں جیسے اللہ رسول کے احکام کی پابندی کرنا چاہیے کاش معاشرتی جرائم کی طرح اخلاقی گراوٹ کے لیے بھی ہمارے قانون میں کچھ دفعات ہوتیں کاش!

”آپ نے جو کچھ کہا اس کا مطلب ہے مس

حافظ“ اور آج پہلی بار مقدس کا نام زبان پہ آیا تھا اور یہ آخری بار تھا۔

ابھی صرف گیارہ بجے تھے صبح تو کالج میں ہوگی یہ بھی اچھا ہے..... ٹھہر کے پچھلے گیٹ سے سیدھا اپنے کمرے میں جا کر دروازہ لاک کیا رائٹنگ ٹیبل پر گر سا گیا اب آنسوؤں کو روکنا اختیار سے باہر تھا اندر سے آواز آئی رولے جتنا جی چاہے عاکف مگر کبھی نہ رونے کے پختہ عزم کے ساتھ۔ رات آٹھ بجے تک وہ اپنی کیفیت کو بہت بہتر کر چکا تھا سیدھا لاؤنج میں پہنچا وہاں کھانے کی ٹیبل پر سب موجود تھے..... اماں نے فوراً کہا ”کیا بات ہے میرے بچے آج تم پورا دن کمرے سے باہر نہیں نکلے؟“

”وہ اماں جان! اب جاب کے لیے ڈاکومنٹس جمع کرنا رہا، کاغذات کہیں کہیں رکھے تھے کھٹا کیا۔“  
”اچھا! اچھا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“  
”جی ٹھیک ہے آپ کے لاؤنلے کو کیا ہوتا ہے ہر وقت تو آپ ہم سب کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہیں اماں!“ حمیرہ نے جواب دیا ”اور یونیورسٹی کے ساتھیوں سے پھمڑنے کا غم بھی ہوگا آخر اتنے برسوں کی رفاقت ہے نا؟“..... ”ٹھیک کہتی ہے بیٹی“ نانی اماں نے تائید کی۔

عاکف نے شکر گزار نظروں سے اُسے دیکھا اللہ تم سے راضی ہو میری گڑبادل ہی دل میں اس نے کہا۔  
”کھانا بھی اس نے رغبت سے کھایا اور اسٹرنگ چائے بھی پی۔“ جاؤ بیٹا تھکے ہوئے ہو آرام کرو“ اماں نے کہا۔  
”جی بہتر۔“

”عاکف ماموں میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں

عزیز کہ آپ ظلم کی اس بھٹی میں ساری عمر جلنے کے لیے تیار ہیں؟“

”صرف میں نہیں بہت سی لڑکیاں ہیں اسی طرح جل جل کر راکھ بن رہی ہیں اور بن چکی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو عادی ہو چکی ہیں یا انہوں نے اس سب کو قبول کر لیا ہے..... پھر مجھی جبراً ناروا پر مفاہمت نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کہہ سکتے ہیں آپ مرد، میں خود مختار ہوں، لڑکیاں جب ان معاملات میں زبان کھولتی ہیں تو فوراً ان کو بدکردار، بے حیا کا خطاب دے دیا جاتا ہے آپ نہیں سمجھ سکتے مسٹر عاکف..... اب اچھے بچوں کی طرح گھر جائیے، خدا کرے آپ کی زندگی میں بہار ہی بہار ہو۔“

ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے جو کہا اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اب وقت ختم ہو گیا قیدی سے ملاقات وہ ایک قیدی ہی تو تھی رسم رواج کی، برادری کی، والدین کی محبت کی یہ ان دیکھی زنجیریں نظر نہیں آتیں میرے آقائے نامدار ساری زنجیریں تو ڈر نہیں اللہ کی بندگی کے لیے آزاد کیا تھا ہم نادان اور جاہل ایسے جاہل جو ڈگریوں کی تعویذ گلے میں ڈال لیتے ہیں مگر سسٹم وہی اور ٹیل در ٹیل نافذ کرتے رہتے ہیں۔

آنکھوں سے آنسو نکلنے سے روک لیا مگر اس آواز کا کیا کرتا جو آنسوؤں میں بیٹھتی ہوئی تھی ”آپ کے حکم کے مطابق میں اچھے بچوں کی طرح گھر جا رہا ہوں کبھی نہ آنے کے لیے بس دعا کرتا رہوں گا کہ بہار آپ کے قدموں سے جدا نہ ہو موسم بہار کے سب پھول آپ پر غار، ہمارا رب ہم سے راضی رہے“

”آمین“ مقدس نے دھمے سے کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا ”خدا حافظ مقدس! ہمیشہ کے لیے خدا



گی بس میٹھ کے دو سوال سمجھنے ہیں ابھی آ جاؤں؟“  
 ”ہاں آ جاؤ مگر بعض سوال ایسے ہوتے ہیں کہ  
 جن کے آگے بندہ لاجواب ہو جاتا ہے وہ جو کسی  
 شاعر نے کہا ہے نا!

دعویٰ بہت ہے علم ریاضی کا آپ کو  
 طول شب فراقی ذرا ناپ دیجئے  
 رائٹنگ ٹیبل پر کہنی ٹکائے چپ چاپ بیٹھا ہوا  
 صادق حسین (عاکف) کھویا ہوا تھا شاید ماضی میں  
 وہ بھی جا کر مقابل والی کرسی پر بیٹھ گئی، چپ چاپ  
 کتنی دیر گزر گئی۔  
 ”کچھ پوچھو گی نہیں؟“

”پوچھنے کی کیا ضرورت ہے سب کچھ نظر آ رہا  
 ہے صدمہ بھی کہیں چھپتا ہے؟ یہ اور بات ہے کہ ہم  
 مختلف بہانوں سے چھپا لیتے ہیں اور لوگ مطمئن  
 ہو جاتے ہیں جیسے آج سب گھر والے ہو گئے ہیں  
 راضی بہ رضا ہو جائیے ماموں جی یہی آپ کے حق  
 میں بہتر ہے۔“

”ہر صدمے پر دھچکے اور ہر محرومی کے اثرات  
 کو مننے میں کچھ وقت تو لگتا ہے؟“  
 ”ہاں لیکن نانی اماں نے اپنی کوششیں تیز کر  
 دی ہیں اس لیے کہہ رہی ہوں۔“

”مجھے اپنی اماں کی خوشی دنیا میں سب سے  
 زیادہ عزیز ہے مقدس کی آرزو اس لیے کی تھی کہ  
 اماں جان یقیناً اسی طرح کی لڑکی چاہتی ہیں سسر د  
 کیے جانے کے بعد میں کیا کر سکتا ہوں سوائے اس  
 کے کہ ان رسوم، رواجوں، ذات بات اور برادری  
 سے جیسے ہوئے لوگوں کے ہدایت کی دعا کروں سو  
 وہ میں کرتا رہوں گا۔“

”ٹھیک کہا آپ نے دعا سدل کو سکون ملتا ہے۔“

☆.....☆

اللہ اکبر، اللہ اکبر فجر کی اذان کی آواز کان میں  
 پڑی تو صالحہ بیگم چونکی، اوہ صبح ہو گئی ساری رات  
 آنکھوں میں کٹ گئی تین بجے رات سے صبح چھ بجے  
 تک وہ ماضی میں کھوئی رہیں انہوں نے کلمہ پڑھا  
 اور وضو کرنے چل دیں۔

وقت کا کام گزرتا ہے اور وہ قیامت تک گزرتا  
 رہے گا عاکف ماموں کی شادی ہوئی اور انہوں نے  
 اپنی شریک حیات کو خوش رکھ کر اور خود بھی خوش رہ کر  
 نانی اماں کو کچھ چین دیا اور وہ مطمئن دنیا سے سفر  
 آخرت اختیار کر گئیں۔

پھر ایک دن ہمایوں کے یہاں سے رونے  
 دھونے کی آوازیں سنائی دیں رضیہ بیگم جب  
 عادت اپنی بیٹی نیلم کے سسرال والوں کو بددعا میں  
 دے رہی تھیں وہ فوراً احوال معلوم کرنے پہنچیں  
 سامنے ہی کمرے میں پٹنگ پر نیلم بیٹھی تھی ”ہائے یہ  
 نیلم ہے؟“ ان کے دل کو دھکا لگا گا ب جیسی لڑکی  
 سوکھ کر کاٹا ہو گئی تھی آنکھیں بے رونق اور رو رو کر  
 پلکیں جھڑ گئی تھیں دکھ میں گزرا ہوا وقت اپنا حال  
 آپ سنارہا تھا۔

”کیا ہوا رضیہ بہن خیر تو ہے؟“ پچھلے گزرے  
 وقت نے رضیہ کو صالحہ کے قریب کر دیا تھا وہ اپنا ہر  
 دکھ ان سے شیر کرنے لگی تھیں۔

”خیر کیسی آپا، میری بیٹی برباد ہو گئی اور اس  
 کے ساتھ ایک ننھی جان بھی پہلی بیٹی پیدا ہونے کے  
 جرم میں اس نے میری بیٹی کو طلاق دے کر بیٹی  
 سمیت ٹیکسی میں بٹھا کر یہاں روانہ کر دیا.....  
 ارے بد بخت ٹوٹے یہ کیا کیا؟ اللہ کی رحمت کو گھر  
 سے نکال دیا اب اس کو بھی برباد ہونے سے کوئی  
 نہیں روک سکتا“

”صبر کرو میری بہن صبر۔“

غزل

نقاش کاظمی

گھر میں گرمی باہر کتنی سردی ہے  
چپ رکھنا بھی موسم کی بے دردی ہے

آپ جو چاہیں سو وہ کریں دنیا بھر میں  
ہم انگڑائی لیں تو دہشت گردی ہے

ہے یہ کہات مرد اگر چوڑی پہنیں  
جبر کے آگے قوموں کی نامردی ہے

پورے چاند کا چہرہ دیکھ کے لگتا ہے  
بھوک میں روٹی یا انڈے کی زردی ہے

کس کس کے ملبوس پہ کچھڑ ڈالو گے  
شہر کا شہر ہمارا تو باوردی ہے

پانی مہنگا اور لہو اب ارزاں ہے  
قدم قدم پر پیچھی ہوئی بے دردی ہے

بہہ نکلے نقاش مگر مجھ کے آنسو  
شاید انسانوں سے بہت ہمدردی ہے

رضیہ کی گود میں لپٹی ہوئی بچی معصوم فرشتہ سی  
بے خبر سو رہی تھی، بہت پیاری، بہت خوبصورت!  
”کیا ہوا تھا نیکم بیٹی ایسی کیا وجہ تھی جو اتنا بڑا  
قدم اٹھا لیا اس نے؟“

”وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا مجھے تم بالکل پسند نہیں ہو  
برادری کے چکر میں میری اماں نے مجھے پھنسا  
دیا۔ اور اماں کہتی تھی مجھے بھی کبھی اچھی نہ لگیں تم  
..... کون زندگی بیٹی اپنے گھر لاتا ہے ہمارے آہیں  
کے جھگڑے ہی نہیں بھولتے نہ نذکو نہ بھاون کو ادھر  
سے اس کی بیٹی کا منہ دیکھو ہر وقت مگر بس یہ برادری  
کا خوف۔ بس اسی لیے تو کہتے ہیں دین کا اپنے  
مذہب کا علم ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں  
رہتا مگر وہاں تو نہ دین کا علم ہے نہ دنیا کا..... اللہ رحم  
کرے مسلمانوں کے حال پر۔“  
”اچھا بہن میں چلتی ہوں، پھر آؤں گی۔“

کیا بات ہے ایسی طاہر نے ان کا اترا ہوا چہرہ  
دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بتاؤں؟ یہی ہوتا ہے زبردستی کی شادیوں  
کا انجام یا اللہ! ہمیں اپنی نہاہ میں رکھنا تو نے تو دنیا  
بڑی خوب صورت بنائی مگر تیرے بندوں اسے  
اجاڑنے پر لگے ہوئے ہیں اپنے خود ساختہ اصولوں  
سے سب نے اپنی اپنی سلطنت بنائی ہوئی ہے اور  
خود کہیں جو دھری، کہیں وڈیرا، کہیں سائیں اور کہیں  
خاندان کے بڑے حکم چلاتے ہیں باقی لوگ انکی  
رعایا ہیں بے بس اور مجبور۔ ان شیطانی حربوں کا  
نتیجہ خیر میں تو نہیں نکل سکتا بس شر ہی شہیتا ہے  
“بے حد افسردگی سے وہ کہہ رہی تھیں۔

”چلو طاہرہ بیٹی! مغرب کی نماز پڑھ لیں ہر غم  
کا مددوار دیکھ کی دوا میرے رب کی یاد میں ہے۔“

☆☆☆

# محببتوں کا سفر



اپنے آخر اپنے ہی ہوتے ہیں..... دولت کی چکا چوند  
نے حسن آفریدی کو سگوں سے بھی بہت دور کر دیا تھا.....



کچھ عرصے پہلے اس گھرانے کی خوشحالی اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ کہیں تفریح کے لیے گیا خوش و خرم زندگی کو جو لوگ رشک سے دیکھا کرتے تھے..... دوستوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور وہ اب یہ دیکھ کر حیران تھے کہ وقت کا بیبا کیسا معاملہ ہاتھ پائی سے نکل کر آتشیں اسلحہ کے بے دریغ گھوما تھا اور زندگی نے کروٹ لی تھی کہ سب کچھ استعمال تک جا پہنچا۔ یہ سب لڑکے دولت مند تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔

چند ہفتے پہلے ہی تو اس گھر میں شادی کے چند ہنگامے جا گئے تھے۔ حسن آفریدی کی بیٹی شازمہ کی شادی ان کے دوست اور بزنس پارٹنر شہباز خان کے بیٹے سے ہو رہی تھی..... حسن صاحب کا بیٹا شازمہ جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک مقیم تھا۔ وہ بھی اپنی بہن کی شادی میں شرکت کرنے اپنے گھر آ گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک ایسا انسو ناک واقعہ ہوا کہ سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ شازمہ کا ہونے والا دولہا جیسے ہی واقعے کی اطلاع ان کو ملی تھی۔ دونوں اپنے چند دوستوں کے ساتھ کہیں تفریح کے لیے گیا تھا..... دوستوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور وہ اب یہ دیکھ کر حیران تھے کہ وقت کا بیبا کیسا معاملہ ہاتھ پائی سے نکل کر آتشیں اسلحہ کے بے دریغ گھوما تھا اور زندگی نے کروٹ لی تھی کہ سب کچھ استعمال تک جا پہنچا۔ یہ سب لڑکے دولت مند تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔

کے پاس ریوالور موجود تھے۔ پورا علاقہ ہوائی فائرنگ سے گونج اٹھا تھا۔ آس پاس موجود پولیس موبائلیں اس علاقے کی طرف دوڑ پڑی تھیں۔ ایسے میں شہباز خان کے بیٹے کی ریوالور سے نکلنے والی ایک گولی اس کے ایک دوست کو چاٹ گئی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ پولیس نے اسے وقوع سے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا تھا۔ اس جھگڑے کے پیچھے ایک بدنام زمانہ لڑکی کا نام بھی سامنے آیا تھا جو اس واقعے کے وقت ان لڑکوں کے ساتھ موجود تھی۔

جیسے ہی واقعے کی اطلاع ان کو ملی تھی۔ دونوں





گھروں میں صف ماتم بچھ گئی تھی..... شازمہ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ شہباز خان کے گھر میں بھی کہرام مچا ہوا تھا۔ شہباز جو ایک بے حد طاقت ور اور سیاسی شخصیت تھا اس نے بیٹے کو رہا کروانے کے لیے جوڑ توڑ شروع کر دیا تھا۔ اخبارات اور ٹی وی چینلوں پر مجرم کے باضی کو کھنگلا جا رہا تھا۔ جس کی رو سے وہ ایک بے حد عیاش اور بے راہ رونو جوان ثابت ہوتا تھا۔ یہ سب خبریں شام کے لیے بڑی تکلف دہ تھیں۔ اور اس دن تو وہ بھٹ پڑا تھا اور حسن آفریدی سے کہا تھا ”بابا یہ سب کیا ہے؟ آپ شازمہ کی شادی ایک عیاش اور گناہ گار شخص سے کروا رہے تھے۔ آپ نے اس کے بارے میں چھان بین کیوں نہیں کی تھی؟“

”بیٹا اس عمر میں لڑکے ایسے ہی لالبا لی ہوتے ہیں۔ وہ سونے کا چنچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والا لڑکا ہے اور شہباز خان کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار میں تھوڑا بگڑ گیا ہے۔ شادی کی ذمہ داریاں پڑیں گی تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ حسن آفریدی نے قہر سے کہا تھا۔

”ہرگز نہیں بابا اب شازمہ کی شادی اس سے نہیں ہوگی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“  
”تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد رہا ہو جائے گا۔ پھر تمام حالات پہلے جیسے ہوں گے۔“

”بابا ایک مجرم کو آپ اپنی بیٹی سوئپ دیں گے؟“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔  
”اس شادی سے انکار کا مطلب تم جانتے ہو کیا ہوگا؟..... شہباز بیٹا ہمارا کاروبار، ہمارا گھر..... نہیں نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا.....“ ”کچھ بھی ہو..... میں ہر قسم کے حالات سے نمٹ لوں گا.....“

مجھ پر بھروسہ کریں.....“ اس نے کہا تھا۔  
پھر اس نے تنہائی میں شازمہ سے بھی بات کی تھی۔ تو شازمہ نے بھی دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ بھی اس رشتے سے خوش نہیں تھی۔ اس نے بھی اپنی سہیلیوں اور جاننے والیوں سے اس کی آوارگی کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ صرف اپنے بابا کی وجہ سے چپ تھی اور ان کے فیصلے پر بے چون چرامان چکی تھی۔ بھائی کے حوصلہ دلانے پر اس نے بھی انکار کر دیا تھا۔ ان دنوں ان کے گھر کی فضا بڑی الجھی ہوئی تھی۔ مسز آفریدی ایک طرف شوہر کو سمجھاتیں تو دوسری طرف بیٹے کی طرف داری کرتیں تھیں۔

پھر وہی ہوا تھا جو حسن آفریدی نے کہا تھا۔ شہباز خان نے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے اور پیسہ پانی کی طرح بہا کر اپنے بیٹے کے خلاف سارے ثبوت ختم کر وا دیے تھے۔ اور کچھ ہی دنوں میں وہ گھر آ گیا تھا۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکی تھی۔ اب شہباز خان حسن پر اپنے بیٹے کی شادی کے لیے بے حد دباؤ ڈال رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہ شادی انجام پا جائے۔ ادھر گھر کے تمام افراد اس شادی کے خلاف تھے اور تو اور شازمہ نے بھی صاف انکار کر دیا تھا حسن کو اندازہ تھا کہ اس انکار کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن وہ مجبور تھے۔

رشتہ ٹوٹنے کا اعلان تھا یا ہم دھماکہ جو شہباز خان اور اس کے خاندان پر گر تھا۔ طاقت اور دولت کے نشے میں سرشار شہباز خان جو ہر شخص کو اپنی رعایا سمجھتا تھا نے اسے اپنی ہنک سمجھا تھا۔ پھر تو جیسے ایک طوفان آ گیا تھا۔ شہباز کا بیٹا بھی میدان میں آ گیا تھا اور اسے جب سے پتا چلا تھا کہ شازمہ



نے اس شادی سے انکار کیا ہے تو وہ بہت تلملایا تھا اور اس نے یہ کھلی دھمکی دی تھی کہ وہ شازمہ کو اٹھا لے جائے گا۔

چند ہی دن گزرے تھے جب شہباز نے کاروبار میں کرپشن کے الزام میں حسن پر مقدمہ دائر کر دیا تھا اور اس کے لیے جو دستاویز پیش کی تھیں ان پر حسن کے دفعہ موجود تھے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کے گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ وہ اب اور زیادہ غمِ محفوظ تھے۔ پریشانی میں انہیں کوئی راہ بھائی نہ دیتی تھی۔ سب سے پہلے شارم کو شازمہ کو محفوظ ہاتھوں میں پہنچانے کا خیال آیا تھا۔ اس موقع پر زور و تقار روتی ہوئی اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ سب ان کے والدین کے پاس اسلام آباد چلے جائیں گے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہاں جا کر وہ اپنے والد اور بھائیوں سے مدد طلب کریں گی مگر شارم نہیں مانا تھا۔ اسکا کہنا تھا کہ شہباز اسلام آباد میں اس کے نکھال والوں سے واقف ہے وہاں شازمہ محفوظ نہیں رہے گی اور اس نے شازمہ کے لیے ایک بہتر مقام سوچ رکھا ہے۔ جو توجیز اس نے ماں کو دی تھی وہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی تھیں۔ اور وہاں جانے سے انہوں نے صاف انکار کر رہا تھا۔ لیکن شارم اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ چاہیں تو اپنے والدین کے گھر جاسکتی ہیں مگر شازمہ کو وہ اپنے ساتھ لے جائے گا۔ پھر آئندہ کا لا محمل بنائے گا..... بہر حال وہ روتی دھونی دونوں بچوں کو دعائیں دیتی اسلام آباد چلی گئی تھیں.....

گلے دن اس نے شازمہ سے کہا تھا..... ”تم اپنا تمام ضروری سامان پیک کر لو ہمیں آج یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“

”لیکن ہم کہاں جارہے ہیں بھائی؟“ وہ

پریشانی سے بولی تھی..... ”کراچی..... تمہیں محفوظ  
ہاتھوں کے حوالے کر کے مجھے یہاں واپس آنا ہے  
اور بابا کو رہائی دلوانی ہے..... اور کاروباری  
معاملات نترمانے ہیں..... بہت کام ہیں گڑیا تم  
جلدی سے تیار ہو جاؤ.....“

”کراچی میں ہمارا اپنا کون ہے.....؟“

”یہ تمام معاملات تم مجھ پر چھوڑ دو..... وہاں جاکہ سب بتا چل جائے گا..... شکر ہے کہ شہباز کے بیٹے سے تمہاری شادی نہیں ہوئی اور وقت کی طنائیں ابھی ہمارے ہاتھ میں ہیں..... ویسے بابا سے مجھے ان احمقانہ اقدامات کی توقع نہیں تھی۔ ہمارا بزنس اچھا خاصہ چل رہا تھا پھر انہیں شہباز کی پانر مشپ کی ضرورت کیوں پڑی..... نہ جانے اس نے انہیں کیسے گھبرا ہوا..... بہر حال تم تیاری کر دو.....“

”بھائی میں آپ کو یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتی..... آپ ان کا مقابلہ کیسے کریں گے وہ لوگ بہت طاقت ور ہیں اور آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں..... ان حالات میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی بس.....“

”دیکھو شازی مجھے مشکل میں نہ ڈالو..... تم محفوظ رہو گی تو میں بھی مطمئن رہوں گا کہ سب معاملات کو نمٹا سکتا ہوں ورنہ کچھ بھی ممکن نہیں رہے گا..... پلینز تجھنے کی کوشش کرو..... اب اٹھو میری پیاری بہن کیا تمہیں اپنے بھائی پر بھروسہ نہیں ہے.....“ اس نے رسائیت سے سمجھا یا تھا..... ”خود سے بھی زیادہ.....“ وہ اعتماد سے بولی تھی.....

”بس پھرتیا رہو جاؤ.....“ اس نے جلدی سے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

آفریدی ہاؤس قدرے قدیم لیکن وسیع و



سب تمہارے اپنے ہیں..... تمہارے باپ نے آج تک تم دونوں کو اپنے خاندان سے دور رکھا..... غلطی بھی اس نے کی اور دوریاں بھی اسی نے پیدا کیں..... اگر شازم ہم سے رابطہ قائم نہ کرتا تو یہ ٹوٹے ہوئے رشتے بھی جڑ نہیں پاتے اور شازم آج سے نہیں اپنے کالج کے زمانے سے ہم سے رابطہ میں ہے.....“

”سوری..... شازمہ میں نے تمہیں کبھی نہیں بتایا..... اس ڈر سے کہ کہیں تم می یا بابا کو نہ بتا دو اور وہ مجھے دادی اور تایا وغیرہ سے بات کرنے سے روک نہ دیں.....“

”ارے یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی..... چلو بچوں تم فریش ہو جاؤ پھر میں کھانا لگواتی ہوں.....“ تائی نے کہا تھا..... ”محشر بچوں کو ان کا کمزہ دکھاؤ.....“ انہوں نے ایک پیاری سی لڑکی جو شازمہ کی ہم عمر تھی کی طرف دیکھ کر کہا..... وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی اور اپنی ماں کے کہنے پر اس کے قریب چلی آئی تھی..... اور بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور کہا تھا..... ”آئیں میرے ساتھ.....“

شازم کو تایا اور چچا جان سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی..... تایا جان کا رویہ شازم کو کچھ ناراض اور لیے دیئے سا نظر آیا تھا جبکہ چچا جان بڑے کھلے دل سے اس سے ملے تھے..... شازم تو سب افراد سے اس طرح گل مل گیا تھا جیسے برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہا ہو.....

اسے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا..... ایک دوسرے سے محبت کے رشتوں میں گندھا ہوا یہ گھرانہ کس قدر خوش و خرم تھا..... اسے یہاں آ کر بالکل کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا.....

عریش مکان تھا جہاں دو بھائی حسین آفریدی اور رضا آفریدی اپنی ماں اور بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے..... حسین آفریدی کے تین بچے تھے دو بیٹے اور عیر اور ایک بیٹی محشر تھی جبکہ رضا کے دو بچے تھے..... ایمان اور بلال..... محشر کی منگنی بلال سے ہو چکی تھی.....

وہ دونوں سہ پہر تین بجے آفریدی ہاؤس پہنچے تھے..... گھر میں موجود تمام افراد ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے..... ایک معشر خاتون نے آگے بڑھ کر شازم کو گلے لگایا تھا پھر وہ شازمہ کی طرف بڑھی تھیں اور ”میری بچی.....“ کہہ کر گرجوٹی سے اس سے لپٹ گئی تھیں..... اور کچھ دیر بعد دو ادھیڑ عمر اور فرہ اندام خواتین گرم جوشی سے اس سے ملی تھیں..... وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی اور اس گرجوٹی پر حیران تھی..... اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی..... پھر شازم اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا.....

”شازمہ..... یہ ہماری دادی ہیں..... اور یہ تائی جان اور چچی جان ہیں.....“ شازم نے گویا اس کی سماعتوں میں دھماکہ کر دیا تھا..... وہ بری طرح چوکی تھی..... کچھ دیر تک تو اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا..... وہ آنکھیں پھاڑے ایک ایک کا منہ تک رہی تھی..... اس کا کوئی دودھیالی بھی ہے اسے پتا نہیں تھا..... کبھی بابا نے ذکر ہی نہیں کیا تھا.....

”تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“ دادی نے اس کی حیرانی محسوس کر لی تھی اور شازم کو آنکھیں دکھائی تھیں..... ”نہیں دادی.....“ وہ شرارت سے مسکرایا تھا..... ”بیٹی..... یہ تمہارا دودھیال ہے..... تمہاری رگوں میں اسی خاندان کا لہو دوڑ رہا ہے..... ہم

ان کی مدد کر رہی تھی۔

”آلو گوشت پکایا ہے۔“

”افوہ..... ای سب گھروں میں کتنے مزے مزے کی ڈشیں بنتی ہیں..... پیزا، چکن چاؤمن، فرائیڈ رائس اور ایک ہمارا گھر ہے۔ دسی کھانوں کے سوا کچھ پکاتا ہی نہیں.....“ وہ منہ بسور کر بولی تھی..... وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کب دادی وہاں چلی آئی تھیں اور انہوں نے اس کے نادر خیالات سن لیے تھے۔ وہ تیز قدم اٹھاتی اس کے عقب میں جا کھڑی ہوئی تھیں..... ”سحش“ انہوں نے اسے پکارا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مرکز دادی کو دیکھا..... ان کے چہرے پر غصہ صاف نظر آ رہا تھا..... اسے یقین آ گیا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں۔

”خدا کی پناہ..... کس قدر ناشکری ہو تم.....“

”اوہو دادی..... میں نے کیا غلط کیا ہے..... اب کون یہ دسی کھانے کھاتا ہے۔ ہر گھر میں نئی نئی ڈشز بنتی ہیں۔ کتنے چیلو ہیں جو نئے نئے کھانے پکانا سکھاتے ہیں یقین کریں دادی بہت مزے دار رہ سچز ہوتی ہیں ان کی..... سب ہی شوق سے کھاتے ہیں..... اور ایک ہمارا گھر ہے جہاں آلو گوشت، دال، بزی کے علاوہ کچھ نہیں پکاتا.....“

دادی جان حشر کے جواب دینے پر چراغ پا ہونے لگیں..... شازمہ کے روئی بلیتے ہاتھ لمبے بھر کے لیے تھم گئے اور اس نے جو بک کر دادی کو دیکھا تھا۔ ”خبردار! جو خرے کیے..... ناشکری کی حد ہوتی ہے۔ پیٹ بھر کھانا ملتا ہے اور پہننے کو اچھے سے اچھا لباس..... ذرا ان لوگوں کی طرف دیکھو جنہیں کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس گھر میں نہیں پکیں گے یہ انگریزی کھانے.....“ وہ اپنے بے لچک تھکسانہ لہجے میں کہتی اسے گھور رہی تھیں۔

پہاں اسے سحش اور ایمان جیسی دوست نما بہنیں ملی تھیں اور جان نچھاور کرنے والی دادی، تائی اور چچی بھی ملی تھیں..... یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنوں سے دور تھی۔ اور بابا کی وجہ سے بہت دکھی تھی نہ جانے وہاں ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ یہ سوچیں اسے رلاتی رہتی تھیں..... مگر یہ سب بھی اس کے اپنے تھے جو اسے ایک پل بھی دکھی نہیں ہونے دیتے تھے۔

اس صبح وہ نماز فجر ادا کر کے باہر لان میں نکل آئی تھی..... خشک ہوا، جنم میں بیگی ہری ہری گھاس اور کیاریوں میں ترتیب سے لگے دل نشین پھولوں کا نظارہ بڑا دلکش تھا..... اس کی روح اندر تک معطر ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ محلی گھاس پر در تک چہل قدمی کرتی رہی تھی۔ ادھر سے ادھر چکر لگاتے وہ اس خوبصورت ماحول کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی..... اپنے گھر میں بھی یہ اس کا روز کا معمول تھا..... اسے اپنے گھر کا لان بہت پسند تھا..... وہ بھی تو بہت خوبصورت اور وسیع و عریض رنگ برنگے پھولوں سے لدا ہوا..... شاید ہی کوئی ایسا پودا ہو جو وہاں نہ ہو..... بابا نہ جانے کہاں کہاں سے پلانٹس منگوا کر لاتے تھے..... اسے اور بھی کو بھی گارڈننگ کا بہت شوق تھا..... شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا لان آس پاس کے تمام گھروں سے زیادہ خوبصورت اور صاف ستھرا تھا..... وہ سوچوں میں کھوئی ہوئی اپنے گھر کے لان میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس وقت اسے لڑش تمام واقعات خواب لگ رہے تھے جی چاہ رہا تھا وقت تھم جائے اور وہ خوابوں کے اسی جزیرے میں گھومتی رہے۔ ”ای کیا پکایا ہے، آج بہت زور دار بھوک لگی ہے.....“ سحش جو ابھی کالج سے لوٹی تھی مکن میں کھانا پکاتی اپنی ای کے پاس جا کر بولی تھی..... شازمہ بھی وہاں کھڑی





شازمہ روٹیاں پکا چکی تھی..... تو انا کر اس نے چولہا آف کر دیا تھا۔

”رہنے دیں دادی جان..... نا سمجھ ہے.....“ اس نے دادی سے کہا تو وہ بولیں..... ”میں اس گھر کی یا اس کی دشمن نہیں ہوں..... سب کے بھلے کے لیے ہی کہتی ہوں اب نہ تو یہ بچی ہے نا نا سمجھ..... جب میں اس کی عمر کی تھی تو اس کا باپ خیر سے میری گود میں تھا.....“

”اس زمانے میں بچپن میں شادیاں کر دی جاتی تھیں.....“ سحرش جو غصے سے تھلا رہی تھی جھٹ بولی۔

”سیدھی ہو جاؤ تم..... بہت زبان دراز ہو گئی ہو..... جو سب کھاتے ہیں وہی تم بھی کھاؤ گی۔ کسی کی پسند کے لیے الگ سے کچھ نہیں کئے گا.....“

”آپ بجا فرما رہی ہیں..... میں ہی ناشکری ہوں.....“ بول کھلا کر سحرش نے کہا تو شازمہ مسکرانے لگی۔

”بھئی جلدی کھانا گاؤ..... سب انتظار کر رہے ہیں.....“ سحرش کی امی نے کہا۔ کچھ دیر بعد دادی اور امی وہاں سے چلی گئی تھیں تو شازمہ نے کہا..... ”اتنے مزے دار تو ہوتے ہیں تم لوگوں کے کھانے..... ایسا میٹ تو مجھے کبھی نہیں آیا.....“

”یہ آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کہ آپ نے کبھی ایسے کھانے نہیں کھائے..... ابھی آپ کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں یہاں رہتے ہوئے..... کچھ وقت گزرائیں گی تو اس روشنی سے اکتا جائیں گی..... میں انہیں برا تو نہیں کہہ رہی بس چاہتی ہوں کہ کبھی روشنی سے ہٹ کر کبھی کچھ پکانا چاہیے.....“ وہ دل کی ہمز اس نکال رہی تھی۔ شازمہ مکمل کر نہیں تھی۔ سحرش اپنی جگہ درست تھی اور دادی اپنی جگہ..... وہ

پرانے خیالات کی روایتی خاتون تھیں جو ہر بات میں دیسی ٹونکوں اور بزرگوں کی نصیحتوں کو اہمیت دیتی تھیں چاہے معاملہ کھانے کا ہو یا صحت کا یا پھر کوئی عام گھریلو مسئلہ ہو وہ ہر کام اپنی سوچ اور اپنی مرضی کے مطابق کرتی تھیں..... گھر کے بزرگ افراد تو ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے مگر نئے دور کے پروردہ نو جوان نسل اپنی سوچ کے مطابق عمل چاہتے تھے پھر انہیں دادی کی جھڑکیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اسے یہاں رہتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس دوران شازمہ دو بار یہاں آیا تھا۔ اور بند کمرے میں اس کی اور تایا چچا سے دیر تک باتیں ہوتی تھیں..... بابا کی رہائی کے لیے سب مل کر کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کیا پیش رفت ہوئی تھی وہ ان سے لاعلم تھی۔ شازمہ اپنے دوستوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ شہباز اور اس کے ساتھی اب کھلی دشمنی پر آمادہ تھے اور شازمہ کو پاگوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ ایسے میں شازمہ کی حفاظت پہلے سے بڑھ کر جاری تھی۔ اس کے لیے گھر سے باہر نکلنے پر مکمل پابندی عائد تھی۔ ایسے میں وہ بڑی خوفزدہ تھی۔

کافی دن گزر گئے تھے شازمہ نہیں آیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بڑی فکر مند تھی۔ اور می اور بابا کی یاد بھی آ رہی تھی۔ رات وہ بستر پر لیٹی تو آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے لگ گئی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ بیٹھی اور باہر لان میں آ گئی۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ لان کے چاروں جانب گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا جیسے گیٹ پر لگے بلب کی روشنی بھی روشن کرنے میں ناکام تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔ خنک ہوا کے

ہی سحر انگیز تھا..... ”کون بھی یہ اور اس کے گھر میں کیا کر رہی تھی.....“ یہ ابھن اسے بے چین کر رہی تھی۔ مزید ستم یہ کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ اس کے سینے سے لگی بازوؤں کی گرفت میں تھی..... نہ جانے وہ بے ہوش کیوں ہو گئی تھی حالانکہ اس نے تو صرف اسے چپنے سے روکا تھا..... وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی اصل پریشانی موجودہ صورت حال تھی اگر اس قت کوئی گھر سے باہر نکل آتا تو کیا ہوتا..... اپنی پوزیشن اسے خاصی آکورد محسوس ہو رہی تھی..... بہت آہستگی سے اس نے لڑکی کو گھاس پر لٹایا۔

”ہیلو..... دیکھو ہوش میں آؤ..... پلیز اٹھو.....“ دونوں ہاتھوں سے ایک اس کے گلابی رخساروں کو چھتہاتے ہوئے اس نے کہا مگر وہ بے حس و حرکت رہی تھی..... کیا ضرورت تھی اسے چپ کرانے کی اس نے سوچا پھر اس کی نبض چیک کی تو کچھ مطمئن ہو گیا..... وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اندر کی طرف بڑھا۔ ”امی..... دادی..... چچی جان.....“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے سب کو پکارنا شروع کر دیا۔

”امی.....“ وہ پکارتا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھا..... اس کی ماں اس کی آواز سن کر حیران ہوئی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ ”سمیر.....“ وہ تیزی سے اس کی سمت بڑھیں اور اس کا ہاتھ چوما۔

دوسرے کمروں سے دادی اور چچی بھی آگئی تھیں..... دادی کو دیکھتے ہی وہ ان کی طرف لپکا اور ان سے لپٹ گیا..... اس کی اچانک آمد پر دادی بھی حیران تھیں.....

جھونکوں نے اسے کافی حد تک پرسکون کر دیا تھا۔ پھر وہ ابھی اور ادھر سے ادھر چکر لگانے لگی۔ چکر لگاتے وہ لان کے ایک تاریک گوشے میں چلی آئی تھی جب اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ شاید کوئی اس کے قریب آ کر کھنکھار رہا تھا۔ وہ چونک کر ایک دم مڑی اور اپنے بہت نزدیک کھڑے قطعی انجبی شخص کو دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اسے پہلا خیال شہباز کا آیا تھا۔ اس کے بدترین اندیشے اس کے سامنے تھے۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں پھر اس کے حلق سے ایک طویل چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی آواز سے گھر والے بیدار ہو جاتے۔ انجبی نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا کھردرا اور مضبوط ہاتھ رکھ دیا تھا..... دوسرے ہاتھ میں پکڑا سفری بیگ اس نے وہیں گھاس پڑھیر کر دیا تھا..... انجبی کی اس جرات پر اس کا خوف دوچند ہو گیا تھا۔ اپنے منہ سے اس کا فولادی ہاتھ ہٹانے کے لیے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا مضبوط اور توانا بازو تھام کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر بے سود تھی۔

”خبردار جو شور مچایا..... کون ہو تم.....؟“ جسم کی طرح اس کا لہجہ بھی بہت کڑخت تھا آواز اتنی بھاری گونج دار اور محکم بھری تھی کہ اس کے رہے سبے اوسان بھی خطا ہو گئے..... وہ حواس کھو چکی تھی اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ ”اوہ no.....“ کالج کی طرح نازک اور

روشن چہرے والے خود پر گئے معطر وجود پر اس نے ایک نظر ڈالی تھی اور وہ نظر اس کے وجود پر گویا جم کر رہ گئی تھی..... لڑکی ہلا کی حسین تھی..... اتنا مکمل حسن اس نے پہلی بار دیکھا تھا بلکہ اس کا پورا وجود

”تم نے آنے سے پہلے بتایا نہیں میر.....“  
چچی نے کہا..... سب اس کی اچانک آمد پر حیران  
تھے.....

”بس آپ سب کی بہت یاد آ رہی تھی اور چھی  
بھی مل گئی تھی اس لیے آ گیا.....“ اور پھر سر پرانز  
بھی تو دینا تھا مگر سب سے ملنے ملانے میں  
وہ بالکل بھلا بیٹھا تھا کہ باہر کوئی اس کی وجہ سے بے  
ہوش پڑا ہوا ہے.....

اسی وقت حشر بھی آنکھیں ملتی وہاں آ گئی  
تھی.....

”ارے میر بھائی..... کب آئے.....؟“  
”ابھی آیا ہوں..... وہ مسکراتے ہوئے بولا۔  
”کل ہی تو آپ سے بات ہوئی تھی فون پر  
آپ نے بتایا نہیں کہ آنے والے ہیں.....“ اسی  
وقت اچانک اسے باہر بے ہوش ہونے والی لڑکی  
یاد آئی..... تو چونک کر بولا۔

”دادی جان سارے گلے شکوے بعد میں  
پہلے میرے ساتھ باہر چلیں وہاں لان میں ایک  
لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی ہے پلیز دیکھیں وہ کون  
ہے.....؟“ اس نے غلت میں کہا تو دادی سمیت  
سب چونک گئے۔

”کون لڑکی.....؟“ دادی کے لہجے میں شک  
بول رہا تھا.....

”پتا نہیں کون ہے..... میں جب گیٹ سے  
اندر آیا تو وہ لان میں پکڑ لگا رہی تھی۔ اس سے پہلے  
کہ میں اس سے کچھ پوچھتا وہ مجھے دیکھنے ہی چھٹنے  
چلانے لگی..... میں نے اسے چپ کرانے کی  
کوشش کی تو بے ہوش ہو گئی..... پلیز آپ لوگ چل  
کر دیکھیں.....“

”ارے کون ہے؟“ دادی باہر لپکیں ان کے

پیچھے حشر نے بھی دوڑ لگا دی چچی بھی بڑبڑاتی ہوئی  
ان کے پیچھے چل دیں..... شانزہ اسی حالت میں  
تھی جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ دادی جان نے جو  
اسے یوں ہوش دیا اس سے بیگانہ دیکھا تو ترپ کر  
آگے بڑھیں۔

”ہائے میری بچی..... کیا ہوا اتنے.....؟“ اس  
کا سراپنی گود میں رکھتے ہوئے انہوں نے بغور میر کو  
دیکھا..... میر بڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا..... یہ  
لڑکی ابھی تک اس کے لیے اجنبی تھی۔

”ارے کوئی اسے اٹھاؤ..... ڈاکٹر کو بلاؤ.....

اللہ رحم..... یہ امانت ہے ہمارے پاس.....  
کیا جواب دوں گی میں اس کے باپ بھائی کو.....  
میرے خدا عزت رکھ لیا.....“ اوپنی آواز میں کہتے  
ہوئے انہوں نے سب کو دیکھا تو حشر اور چچی  
آگے بڑھیں۔ میر فکر فکر سب کے منہ تک رہا  
تھا..... ”دیکھ کیا رہے ہو..... اٹھاؤ اسے.....“ چچی

نے کہا تو وہ جلدی سے آگے بڑھا اور پھولوں کی  
ڈال کی طرح اسے اٹھا لیا اور اندر لے آیا۔ اسے  
اس کے کمرے میں لے جانے کے بجائے دادی  
جان کے بیڈروم میں پہنچا دیا تھا..... میر کی امی نے  
تک اس کے سر کے نیچے رکھا..... دادی اور چچی اس  
کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے لگیں۔ حشر پانی کی  
بوٹل اور گلاس لے آئی تھی..... اس نے گلاس میں

پانی انڈیلا اور اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگی مگر  
اسے ہوش نہیں آیا تو دادی جان نے باقاعدہ رونا  
شروع کر دیا..... وہ اپنی جگہ چور بنا کھڑا تھا.....  
لڑکی کا تعارف حاصل کیے بغیر اسے اندازہ ہو گیا تھا  
کہ یہ لڑکی گھروالوں کے لیے تھی، ہم ہے..... ”بہو  
اس کے ہاتھ پاؤں ملو..... کچھ کرو خدا کے  
لیے..... کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ.....“ دادی نے انتہائی

پریشانی سے کہا۔ جیسے ہی اس کی نظر ساحر پر پڑی تو وہ چونکی وہی تو تھا

جو اس کی اس حالت کا ذمہ دار تھا..... کہنتی بے رحم گرفت تھی اس کی جس نے شازمہ کے حواس چھین لیے تھے..... دادی جان نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا..... ععرش اور امی یکدم ہنس پڑیں چچی جان بھی اس کے قریب بیٹھ گئیں..... وہ ناگواری سے بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چلا گیا..... ععرش اسے اس کے کمرے میں لے آئی تھی..... اس کا دماغ ابھی تک سنسنار ہا تھا..... بستر پر لیٹے ہی اسے نیند آگئی تھی۔

کھانے پینے کے بعد وہ غافل ہو کر ایسا بے خبر  
 سویا کہ سارا دن سوتا رہا شام کو امی کے بار بار  
 پکارنے پر وہ بمشکل اٹھا تھا..... اور بغیر حلیہ سنارے  
 اور کپڑے بدلے وہ باہر نکل آیا تھا۔

”کیا ہے امی کیوں آوازیں دے رہی ہیں..... کتنے عرصے بعد سکون کی نیند آئی تھی۔“ وہ آنکھیں ملنے لاؤنج میں رکھے صوفے پر ہی دراز ہو گیا۔ کچن سے باہر نکلتی شازمہ نے اسے دیکھا اور واپس کچن میں چلی گئی۔ کچن میں کھڑی وہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی..... رات کا وہ واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا..... اسے اپنی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا..... نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا..... اسی وقت سمیر کی امی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جو اپنے بیٹے سے مخاطب تھیں۔

”کہاں لیٹے ہوئے ہوتم..... یہ وقت ہے سونے کا..... اٹھو تم از کم اپنا حلیہ ہی سدھار لو..... بچے نہیں ہوتم کہ بار بار سمجھانا پڑے“ امی کی نظریں بیٹے پر پڑیں..... بلیک ٹراؤز اور بلیک ٹی شرٹ میں اس کا کسرتی جسم نمایاں تھا۔ اس کے

ان سب کو پریشان دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور  
سحرش کے ہاتھ سے بوتل لے کر پوری کی پوری  
بوتل کا پانی اس پر اٹھیل دیا..... بج پانی ایکدم  
گرنے سے وہ ہڑبوا کر اٹھ بیٹھی..... اسے ہوش  
میں آتے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی  
تھی..... ”کیا ہوا تھا میری بچی.....؟“ دادی نے  
پر شفقت انداز میں اس سے پوچھا تھا۔ وہ جب سب کو  
خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ فوری طور پر اس  
کی کچھ کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر جیسے ہی اس نے نمبر کو  
دیکھا سب کچھ اسے یاد آ گیا۔

”دادی..... وہاں..... اس نے مجھے.....“  
اس نے سمیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر  
پھوٹ پھوٹ کے رو دی..... سب نے یکبارگی  
حیرانی سے سمیر کو دیکھا..... ”لاحول ولا قوۃ.....“ وہ  
با آواز بلند بولا۔

دادی نے جو اسے بچوں کی طرح روتے دیکھا تو خود سے چٹایا..... ثانی امی نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ”لو یہ پانی پو شاہاش.....“ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ ”ارے یہ میرا بیٹا ہے سمجھ..... تم خواہ خواہ ڈر گئیں..... وہ دو سال سے دئی گیا ہوا تھا آج ہی واپس آیا ہے..... اسے سر پر اتر دینے کی عادت ہے اسی لیے بغیر بتائے آیا تھا..... تم نے اچانک اسے دیکھا تو شاید پریشان ہو گئیں..... ویسے تم رات کے اس پہر لان میں کیا کر رہی تھیں.....“ اس کے مرمریں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی..... اور انہوں نے مجھے.....“ اس نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی



مضبوط بازو اور کندھے عیاں تھے۔ وہ بے حد وجہ بہ تھا۔ انہوں نے ستاسی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور اسے اختیار ان کے ہونٹوں سے ماشاء اللہ نکلا تھا ان کا بیٹا لاکھوں میں ایک تھا۔ انہوں نے بے اختیار نظریں پھیر لیں کہ کہیں ان کے لاڈلے کو ان کی ہی نظر نہ لگ جائے۔

”سیر سنا نہیں تم نے کیا کہہ رہی ہوں میں۔“ انہوں نے پھر سیر کو ٹوکا۔ شازمہ جو کچن سے نکل رہی تھی کی سیدھی نظر سیر پر پڑی تھی اسی لمحے ماں کی آواز پر اس نے بھی آنکھیں کھولیں تھیں نظروں کا رخ شازمہ کی ہی جانب تھا۔ سرخ ڈوروں موٹی موٹی خوار آؤ نیند سے بھری آنکھیں جب شازمہ کی جانب انھیں تو کچھ بے باکی اور تجسس سے پھیل گئیں۔ شازمہ اس کے یوں بے دھڑک اور بے باکی سے دیکھنے پر ٹھٹھکی گئی تھی۔

کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تا تمہاری۔۔۔۔۔؟“ وہ فکر مندی سے اس کے قریب بیٹھیں اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو سیر نے اپنا سراں کی گود میں رکھ دیا ”بالکل ٹھیک ہوں امی۔۔۔۔۔ بہت عرصے بعد گھر آیا ہوں تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔۔۔۔۔ امی بے اختیار مسکرا دیں اور لاڈ سے اس کے بال بکھرا دیے۔

”جیتے رہو۔۔۔۔۔“ آنکھوں میں ہزاروں ستاروں کی چمک لیے انہوں نے دعا دی۔۔۔۔۔ شازمہ جو اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی ماں بیٹے کو یوں لاڈ کرتے دیکھا تو اس کے دل سے ہوک سی اٹھی اسے اپنی می بہت یاد آئی تھیں

”میں آپ کو بہت یاد کرتا تھا۔۔۔۔۔ سچ امی بڑی یاد آتی تھی۔“ وہ چھوٹے بچے کی طرح اپنی ماں سے دوری پر بیتنے والی بے قراری کا اظہار کر رہا

تھا۔۔۔۔۔ سیر نے ماں کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگالیا۔۔۔۔۔ ”قسم سے امی میں اس محبت بھری آغوش کو ترس گیا تھا۔“ کتنا سچا لہجہ تھا اس کا۔۔۔۔۔ شازمہ کے لیے یہ محبت بھرے جملے اور اپنائیت کے مظاہرے نے آن واحد میں اس کے دل میں حسرت جگادی تھی ماں سے دوری نے اسے تڑپا دیا تھا۔

میں نے بھی ایک ایک بل تمہیں یاد کیا تھا۔۔۔۔۔ تم ایک ماں کی محبت اور بے قراری کو نہیں سمجھ سکو گے۔۔۔۔۔ میں نے یہ ماہ و سال کیسے گزارے تمہیں بتا نہیں سکوں گی۔۔۔۔۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہاری سلاستی کی دعائیں کی ہیں۔۔۔۔۔

”مجھے ان بے قرار یوں کا اندازہ ہے۔۔۔۔۔ یہ آپ کی دعاؤں کا ہی اثر ہے جو خدا نے مجھے اتنی کامیابیاں اور کامرانیاں عطا کی ہیں۔“ بہت سنجیدگی سے کہتے اس کی نظریں کچھ قاصط پر کھڑی شازمہ پر پڑی تھیں جو بت بنی دونوں کو انہماک سے دیکھ رہی تھی۔

”امی یہ لڑکی کون ہے جو ہمارے گھر میں رہ رہی ہے۔۔۔۔۔؟“ امی نے مڑ کر اسے دیکھا تھا جو ایکدم چونکی تھی پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ماں سے پھڑکنے کا غم کیا ہوتا ہے اور گھر والوں سے دوری کیا قیامت ڈھاتی ہے۔۔۔۔۔ وہ اس کی حسرتوں سے بے خبر نہیں تھیں۔۔۔۔۔ وقت کیسے اسے ان کے در پر لے آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ سب اس کا غم ہلکا کرنے میں ہلکان ہو رہے تھے۔۔۔۔۔ ساحر کو گزشتہ رات کے وہ پل یاد آئے۔۔۔۔۔ اس کے معطر بلوریں وجود کی یاد نے اس کے احساس سے لپٹ کر اسکی دھڑکنوں کو بے ربط کر دیا تھا۔۔۔۔۔ ”یہ شازمہ ہے۔۔۔۔۔ تمہارے حسن چٹا کی بیٹی۔۔۔۔۔“ یہ سنتے ہی وہ بری طرح چونکا اور اٹھ

بٹھا..... ”یہ یہاں کیا کر رہی ہے.....؟ حسن چچا نے تو ہم سے مارے رشتے توڑ رکھے ہیں.....“  
”بس بیٹا حالات انہیں ہماری چوکھٹ پر لے آئے ہیں.....“

”اور آپ سب نے سب کچھ بھلا کر کھلے دل سے انہیں معاف کر دیا ہوگا.....“ اس نے تلخ لہجہ میں کہا تھا۔

”مشکل کی اس گھڑی میں اپنے ہی کام آتے ہیں اور وہ لڑکی تو بڑی محسوس ہے اور ویسے بھی مہمان ہے.....“ پھر انہوں نے تفصیل سے وہ سب حالات اسے بتائے تھے جن سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچی تھی..... سیر نے ایک گھر اسانس لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ویسے امی یہ تو اچھی خاصی ڈر پوک ہے..... چڑیا جیسا دل ہے اس کا..... رات لمحوں میں بے ہوش ہو گئی تھی.....“ اس نے ہستے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

حسن آفریدی نے اپنے خاندان کی مخالفت مول لے کر اپنی پسند سے شادی کی تھی..... اس سے پہلے ان کے ہاں شادیوں کی روایت کے مطابق خاندان میں ہی کی جانی تھیں..... حسن نے ان روایات کو توڑ دیا تھا..... جس کی وجہ سے ان کے والد سمیت پورا خاندان ان سے ناراض تھا..... یہ صورت حال حسن کے والد کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی اور وہ یہ دیکھ کر برداشت نہیں کر سکے تھے..... اور انہی دنوں ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔

حسن والد کے مرنے پر اپنی بیٹی فاطمہ کو اپنے ساتھ گھر آیا تھا تو اس کے بڑے بھائی نے انہیں گیت پر ہی روک دیا تھا اور والد کی میت میں

شرکت کرنے نہیں دی تھی..... انہوں نے بہت کوشش کی تھی مگر انہیں معافی نہیں ملی تھی..... یہ بات ان کے دل کو لگ گئی تھی..... پھر حسن نے بھی اس خاندان سے ہر تعلق توڑ لیا تھا..... اور وہ شہر بھی چھوڑ دیا تھا جہاں ان کا خاندان رہتا تھا۔

حسن کی بیوی کا تعلق ایک بے حد دولت مند گھرانے سے تھا..... وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لائی تھیں..... بہت جلد حسن نے اپنا بزنس سیٹ کر لیا تھا..... اور رفتہ رفتہ ان کا کاروبار بہت پھیل گیا تھا..... مال و دولت کے علاوہ خدا نے انہیں اولاد کی خوشیاں بھی عطا کر دی تھیں ایک بیٹا اور بیٹی کی صورت میں.....

پھر نہ جانے کب انہیں وہ مکار شخص ملا تھا جس کا نام شہباز خان تھا۔ اس نے حسن پر کچھ ایسا سحر چھوڑا تھا کہ انہیں اس کے علاوہ دنیا میں کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ بزنس پارٹنر بننے والا یہ شخص آہستہ آہستہ پورے کاروبار پر حاوی ہوتا جا رہا تھا..... شام کوئی مشورہ دیتا یا اپنے والد کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اسے ناجذبہ کار کہہ کر ٹال جاتے تھے۔ اسی دوران شام پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔

شہباز نے اپنی چالاکی اور عیاری سے کام لے کر بزنس پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اور اپنے عیاش بیٹے کے لیے ان کی سیدھی سادی بیٹی شامہ کا رشتہ مانگا تھا۔ حالات اس بچ پر پہنچ گئے تھے کہ انہیں اس رشتے کے لیے ہاں کرنی پڑی تھی۔ مگر میں کوئی اس رشتے سے خوش نہیں تھا۔ شادی کے موقع پر شام بھی آ گیا تھا۔ اس خاندان کے بچاؤ کی تمام راہیں مسدود تھیں اور حالات کنٹرول سے باہر ہو گئے تھے۔ پھر وہ واقعہ ہو گیا۔ اور شہباز کے بیٹے کو پولیس

نے پکڑ لیا۔ شام کی تو دلی مراد بر آئی تھی اور اس نے اس وقت کو بنیاد بنا کر اپنے والد پر باؤ ڈالا تھا کہ وہ یہ رشتہ فوری طور پر ختم کر دیں۔ انہوں نے جب رشتہ توڑنے کا اعلان کیا تو شہباز نے ان کے دستخط کیے ہوئے پیپرز ان کے سامنے رکھ دیے۔ بلکہ انہیں دھمکیاں بھی دیں کہ وہ انہیں جیل کی ہوا کھلوائے گا اور شازمہ کو اٹھا کر لے جائے گا۔ وہ بے حد طاقت ور انسان تھا اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔

شہباز کا اصل روپ اب ان کے سامنے آیا تھا۔ ان کی کم عقلی اور غلطیوں کی وجہ سے نہ صرف بزنس ان کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا بلکہ انکی بیٹی کا مستقبل بھی خطرے میں تھا۔ اس نے ان پر چھوٹے مقدمات قائم کر دیے تھے۔ اور پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ یہ اس گھرانے کے لیے بڑا تکلیف دہ وقت تھا۔ حسن صاحب کی گرفتاری اور بزنس پر قبضے کے بعد شہباز کا اگلا ٹارگٹ شازمہ تھی۔ اس نے شام کو دھمکی دی تھی ایک ہفتے کے اندر شازمہ کی شادی اس کے بیٹے سے نہیں کی تو وہ کسی اور طریقے سے شازمہ کو لے جائے گا۔ شام شازمہ کے لیے کوئی کوئی مضبوط گاہ کی تلاش میں تھا۔ مئی شازمہ کو اپنے ساتھ اپنے والدین کے پاس لے جانا چاہتی تھیں مگر یہ جوہر شام کو پسند نہیں آئی تھی۔ ایسے میں اسے اپنے دو خیال کا خیال آیا تھا۔ اس نے جب تمام حالات دادی کو بتائے تھے تو وہ تڑپ اٹھی تھیں اور یہ مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا کہ وہ فوری طور پر شازمہ کو ان کے پاس لے آئے پھر وہ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دیں گی اور جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو پھر سب ایک ہوں گے۔ شام کو یہ

جوہر اچھی لگی تھی۔ وہ سب اس کے اپنے تھے وہ ان سے ایک عرصے سے رابطے میں تھا۔ نہ جانے مئی اور بابا ان سے کیوں دور رہتے تھے۔ بابا بہت ضدی تھے نہ تو وہ خود اپنے خاندان سے ملتے تھے نہ بچوں کو ملنے دیتے تھے۔ مئی کی مخالفت کے باوجود وہ شازمہ کو دادی جان کے حوالے کر آیا تھا۔

اسے یہاں رہتے ہوئے دو ماہ بیت چکے تھے۔ تائی جان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے سمیر کے لیے اسے مانگ لیں۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنی ساس اور دیورانی سے بھی کر دیا تھا مگر شازمہ کے گھر والوں کے سامنے کہتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھیں وجہ ان کا اٹیس تھا۔ پھر شازمہ بھی کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی وہ ناز و نعم میں پروان چڑھی تھی۔ ملازمین کی فوج ظفر موج ان کے گھر میں موجود تھی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر آئی تھی۔ مگر خلوص، محبت اور عزت میں وہ ان سے کم نہیں تھے۔ اسی لیے ان کے دل کی خواہش فی الحال دل میں تھی۔

شازمہ نے یہاں آ کر وہی انداز اپنا لیا تھا جو اس گھر کے کینوں کا خاصا تھا۔ وہ بھدا صرار سب کے منع کرنے کے باوجود کسی نہ کسی کام میں الجھی رہتی تھی۔ گو کہ یہ بھی ایک خوش حال گھرانہ تھا مگر ان کی فکر انہیں تھا۔ مگر بے حد خلوص اور محبت بھرا ماحول تھا۔ یوں تو مئی اور بابا نے ان دونوں بہن بھائیوں سے بے حد محبت کی تھی اور کبھی کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا مگر ان کی محبت بہت قابل ہوتی تھی۔ اس کے اندر شروع سے یہ نشانی رہی تھی کہ اس کی مئی عام ماؤں کی طرح اس سے لاڈ پیار کریں جیسے دادی جان، بڑی

”آج ہی بات کی ہے“ شازمہ نے کہا۔

”شارم بھائی سے بات ہوئی؟“

”انہوں نے منع کیا ہے۔“

”چلو کوئی بات نہیں ابھی ایک دو دن میں وہ

خود آ جائیں گے۔“ اس نے تسلی دی

”پتا نہیں کب آئیں گے؟“ اس کی

آنکھوں میں آنسو چھلنے لگے۔

”اللہ خیر کرے گا۔۔۔۔۔ تم پریشان نہ ہو وہ کہیں

مصرف ہوں گے۔“ وہ سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔

”تم آرام کرو بلکہ کچھ دیر سو جاؤ۔“ وہ ابھی

اور دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔ وہ تنہائی میں

دل کھول کر رونا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ آنسو بے اختیار اس

کی آنکھوں میں بھر آئے تھے۔ اسی وقت دروازہ

دھڑ سے کھلا اور کوئی اندر آیا تھا۔

”سحرش کہاں ہو تم۔۔۔۔۔؟“ سیر کی آواز

گوئی۔ وہ کمر میں لیٹی ٹھک گئی۔ ”لو یہاں

محترمہ آرام فرما رہی ہیں اور میں پورے گھر میں

ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“ اسے بستر پر کمرل سر تک

تانے سوتے دیکھ کر وہ باؤ باز بلند بولا۔ شازمہ

کے وجود میں سنسنی مٹ رہی دوڑ گئی۔

”سحرش اٹھو۔۔۔۔۔ میرا ایک کام کر دو۔“ وہ

اس کے قریب بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ”خدا کی پناہ

گھوڑے بچ کر سوتی ہے یہ لڑکی۔“ کچھ ہی دیر

بعد اس کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی اور اس نے کمرل

پکڑ کر تختی سے بھینچا تھا۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لیے

حیرت کا تھا۔ کمرل میں سے سحرش کے بجائے

شازمہ کو برآمد ہوتے دیکھ کر وہ کمرل چھوڑ کر بستر

سے اٹھ گیا۔ ”ارے۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔“ وہ حیران

تھا۔۔۔۔۔ وہ جو متوحش نظر آ رہی تھی ایک دم اٹھ بیٹھی

اور ایک طرف پڑے دوپٹے کو کھینٹا اور ناگوار

ای یا چچی جان کرتی تھیں۔۔۔۔۔ خالص محبت،

اپنائیت، خلوص اور توجہ کے کہتے ہیں اس کا احساس

اسے یہاں قدم قدم پر ہوا تھا۔

اس کے بابا کی ہٹ دھرمی نے اسے کتنے

خوبصورت رشتوں سے دور رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس

واقعے کے بعد وہ سیر سے دور دور رہتی تھی جبکہ سیر

بھی اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔۔۔۔۔ سوائے

سیر کے وہ سب سے محل ملتی تھی اور سحرش سے تو

اس کی بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

کافی دن ہو گئے تھے شازمہ اس سے ملنے نہیں

آیا تھا اور اس کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں

تھا۔۔۔۔۔ مٹی سے اکثر فون پر بات ہوتی رہتی تھی وہ بھی

اس کی وجہ سے فکر مند تھیں۔۔۔۔۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر

انہیں اطمینان دلادیا تھا کہ یہاں سب اس کا بے حد

خیال رکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ سب کتنے اچھے تھے جو

اس مشکل وقت میں ہر ناراضگی بھلا بیٹھے تھے۔

اس کا احساس مٹی کو بھی ہو رہا تھا۔

اس دن دادی جان، تائی اور چچی کو ساتھ لے

کر کسی عزیز کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ وہ

ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہی پھر سحرش کے کمرے

میں آ کر لیٹ گئی۔

”کیا بات ہے شازمہ؟ پریشان لگ رہی

ہو۔۔۔۔۔؟“ اسے مسلسل ایک ہی نکتے کو گھورتے دیکھ

کر سحرش نے استفسار کیا تھا۔

”میں کیا پریشان ہوں گی۔۔۔۔۔ میں تو خود ایک

پریشانی ہوں سب کے لیے۔“ اس نے گھمبیر

لہجے میں کہا۔۔۔۔۔ تو سحرش نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”گھریا دے رہا ہے؟“ اس نے محبت سے

پوچھا۔ اس نے بے اختیار سر ہلا دیا۔

”اپنی مٹی کو بون کر لو۔۔۔۔۔“



سے اسے دیکھا۔

تھا..... اسے اپنے دوست سے ملے جانا تھا اسی لیے

وہ شرٹ استری کروانے عرش کے پاس گیا تھا.....

اور اسی وقت خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا..... ”یہ

پاگل لڑکی مجھے پاگل بنا دے گی“ اس نے سوچا۔

ادھر حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے

جارہے تھے..... تایا اور چچا جان شرم کی مدد کرنے

اس کے پاس گئے تھے..... تایا جان اپنے

اثر و رسوخ استعمال کر رہے تھے۔

”ہماری خاطر آپ لوگوں کو بہت زحمت ہو

رہی ہے.....“ شرم نے کہا تھا۔

”ارے زحمت کیسی رشتے ناتے آخر ہوتے

کس لیے ہیں.....“ تایا جان نے کہا تھا۔

”شازمہ کیسی ہے.....؟“

”وہ اپنے گھر میں ہے..... اچھا کیا جو تم نے

ہم پر بھروسہ کیا..... وہاں اسے آج تک نہیں آئے

گی تم بے فکر ہو.....“ تایا اور چچا کی آمد سے اسے

بڑا سہارا ملا تھا اور ساری پریشانیاں مفقود ہو گئی تھیں

رات کو وہ گھر لوٹا تو سیدھا اپنے کمرے میں

گھس گیا تھا..... ابھی لیٹا ہی تھا کہ امی آگئیں.....

”کہاں تھے تم صبح سے.....؟“

”دوستوں کے ساتھ تھا.....“ سمیر نے کہا۔

”کھانا لاؤں تمہارے لیے.....“

”نہیں میں کھا کے آیا ہوں.....“ اس نے

مسکراتے ہوئے کہا۔ امی اس کے قریب ہی بیٹھ

گئیں.....

”تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں.....؟“

”ایک مہینہ ہے ابھی.....“ اس نے کہا تو وہ

پرسوج انداز میں بولیں.....

”ایک مہینہ.....“ پھر کچھ دیر بعد وہ بولیں

..... ”دراصل میں تمہاری شادی کروانا چاہتی

”آئی ایم سوری.....“ وہ شرمندہ لہجے میں کہتا

دو قدم پیچھے ہٹا..... ”میں سمجھا سحر ہے.....“ اس

نے اس کی آنسو بھری آنکھوں اور سرخ ہوتے

چہرے کو حیرت سے دیکھا..... نہ جانے وہ کب

سے رورہی تھی..... حیرت کے ساتھ فکر مندی نے

اسے گھیر لیا..... ”کیا بات ہے آپ رو کیوں رہی

ہیں.....؟“ وہ خاموش رہی دوپٹہ کندھوں پر رکھتے

وہ بستر سے نیچے اتر گئی۔

”پلیز شازمہ بتاؤ مجھے..... کیا ہوا ہے..... آئی

کین لیپ یو.....“ وہ بہت خلوص سے کہہ رہا

تھا..... وہ پھر بھی خاموش رہی اور دروازے کی

سمت بڑھی مگر وہ راستے میں آگیا..... ”میرا راستہ

چھوڑیں.....“

وہ چٹان کی طرح ایستادہ تھا..... اب سمیر کی

نظروں میں الجھن سٹ آئی تھی..... ”کسی نے کچھ

کہا ہے.....؟“ ہنسنے کے بجائے وہ اس سے پوچھ

رہا تھا۔

”میرا راستہ چھوڑیں.....“ اس نے سختی سے کہا

تو وہ ہٹ گیا..... وہ اسے حیران و پریشان چھوڑ کر

باہر نکل گئی..... نہ جانے سمیر سے بے درپے غلطیاں

اس لڑکی کے ساتھ کیوں سرزد ہوئی تھیں بہر حال

اس وقت جو کچھ بھی ہوا تھا نادانستگی میں ہوا تھا.....

وہ جھنجھلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا..... وہ لاؤنج

میں صوفے پر بیٹھی رورہی تھی..... اس نے اس کی

سمت بڑھنا چاہا مگر کچھ سوچ کر نفی میں سر ہلایا اور

واپس پلٹ گیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے بیڑاری اور

کوفت سے بستر پر بڑی اپنی شرٹ اٹھائی اور زمین

پر دے ماری..... اب کہیں جانے کا موڈ نہیں ہو رہا

ہوں“ امی نے کہا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا  
 ”یہ اچانک آپ کو میری شادی کی کیا سوچھی.....“  
 ”تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو ورنہ میں لڑکی  
 دیکھ لوں گی.....“

”نہیں امی ابھی نہیں.....“

”میں محرش سے پہلے تمہاری شادی کروانا  
 چاہتی ہوں..... تمہیں کوئی پسند ہے؟“

اس کے ذہن کے پردے پر چھناکے سے وہ  
 معطر، شفاف بلوریں وجود آسایا تھا..... امی جو بغور  
 اسے دیکھ رہی تھیں پولیس ”کون ہے وہ.....؟“ وہ  
 ایک دم ٹپٹا گیا۔  
 ”کوئی نہیں.....“

”ٹھیک ہے مگر یہ سن لو میں زیادہ انتظار نہیں  
 کروں گی..... آخری بار پوچھ رہی ہوں کوئی پسند  
 ہے تو بتا دو ورنہ میں نے لڑکی دیکھ رکھی ہے.....“  
 انہوں نے دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا..... تو  
 اس نے چونک کر انہیں دیکھا..... ”کون ہے  
 وہ.....؟“..... ”تم نے بتایا ہے جو میں  
 بتاؤں.....“ وہ شرارت سے کہتی باہر چلی گئیں.....

اس دن وہ تائی اور دادی جان سکے ساتھ  
 لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب فون کی گھنٹی بجی تھی..... فون  
 دادی نے اٹھایا تھا..... شکوے شکایتوں سے شروع  
 ہوتی باتیں طویل ہوتی گئی تھیں..... وہ اور تائی ایک  
 دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھ رہی تھیں..... نہ  
 جانے کس سے وادی اتنی ساری باتیں کر رہی  
 تھیں..... پھر کافی دیر بعد انہوں نے فون بند کیا تھا  
 اور مسکراتی ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھی تھیں.....  
 ”تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے.....“  
 انہوں نے شازمہ سے کہا تو وہ چونکی..... اور سوالیہ  
 نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”تمہاری ماں اور شازمہ یہاں آرہے  
 ہیں..... مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے  
 اسی لیے میں نے انہیں یہاں بلایا ہے.....“ یہ سنتے  
 ہی وہ کھل اٹھی تھی اور دادی جان سے لپٹ گئی  
 تھی..... تائی بھی بہت خوش نظر آرہی تھیں..... ان  
 دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی تھی  
 جو شازمہ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب اس کی می کو آنا تھا.....  
 وہ بہت خوش تھی اور سراپا انتظار تھی..... گھر میں طرح  
 طرح کے پکوان تیار ہو رہے تھے..... اور گھر کا ہر  
 فرد ان کی آمد کا منتظر تھا..... وہ جیسے ہی وہاں پہنچی  
 تھیں شازمہ نے اختیار ان سے لپٹ گئی تھی ان  
 دونوں کی آنکھیں اشکبار تھیں..... پھر دادی نے  
 بڑھ کر انہیں گلے لگایا تھا..... برسوں کی جدائی لکھوں  
 میں دور ہو گئی تھی ٹوٹے ہوئے رشتے پھر ایک زنجیر  
 کی صورت جڑ گئے تھے..... شکوے شکایات بھی اور  
 معافی سنانی بھی..... آنسو بھی بہائے گئے اور  
 خوشیاں بھی منائی گئی تھیں۔

وقت کچھ اور آگے کھسکا تھا..... تایا اور چچا،  
 شازمہ کے ساتھ مل کر اپنے بھائی کی رہائی کے لیے  
 کوشاں تھے..... ادھر گھر میں کچھ عجیب سی کھجوری  
 پک رہی تھی..... گھر کی بزرگ خواتین اکثر سر  
 جوڑے بیٹھی رہتیں..... نوجوان اس سے بے  
 خبر تھے..... وہ اتوار کا دن تھا سب افراد گھر پر تھے  
 جب دادی نے بزرگ افراد کو اپنے کمرے میں  
 طلب کیا تھا..... یہاں نوجوانوں کو آنے کی  
 اجازت نہ تھی..... شازمہ سمیت سب نوجوان اس  
 بات پر حیران تھے کہ بند کمرے میں ایسا کیا اجلاس  
 ہو رہا ہے جس سے انہیں دور رکھا جا رہا ہے.....  
 بہر حال اندر کمرے میں دادی کہہ رہی تھیں.....

Digitized by Google

”لوگ تو لڑکیوں سے بھی ان کی مرضی پوچھ لیتے ہیں آپ لوگوں نے مجھ سے پوچھا تو درکنار مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا“ وہ چراغ پا ہو رہا تھا۔  
 ”تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تمہیں کوئی پسند نہیں اسی لیے ہم نے اپنی مرضی سے پسند کر لی۔“ وہ لپٹ لیا۔

”ارے بھی تاپا ابو بلا رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ بلال نے دھماکہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے ایک جھٹکے سے کبل ہٹایا۔  
 ”کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ چلایا۔

”دادی جان نے تمہاری بات سنی کہ کوئی ہے اور تمہاری منگنی کی رسم ادا کی جا رہی ہے ابھی فوراً اٹھو۔“

”کیا بکواس ہے۔۔۔۔۔ بے پناہ حیرت کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھا۔  
 ”بکواس نہیں سو فیصد سچی خبر ہے۔۔۔۔۔“

”مگر مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔۔۔۔۔“  
 ”پوچھو گے نہیں کس سے ہو رہی ہے منگنی۔۔۔۔۔“

”لاکھوں میں ایک ہے وہ لڑکی۔۔۔۔۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو بھنگڑے ڈال رہا ہوتا۔۔۔۔۔“

”وہ جو بھی ہے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔ جمہیں شوق ہے تو خود کر لو۔۔۔۔۔“ غصے میں کبل پھینک کر وہ ہاتھ روم کی سمت بڑھا۔  
 ”چاہے وہ لڑکی شازمہ ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔۔“

بلال نے کہا تو وہ چونکا۔  
 ”کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔۔۔!“ وہ حیرت زدہ تھا اسی وقت اس کی امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

”امی یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔۔۔؟“ وہ جارحانہ انداز میں بولا۔۔۔۔۔ تو وہ مسکرا دیں۔۔۔۔۔ ”سچ سن رہے ہو۔۔۔۔۔ اور تم ابھی تک یہاں ہو۔۔۔۔۔ وہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”اسی لیے تھے۔۔۔۔۔ اور تاپا اور پچا جان کی کوششیں رنگ لائی تھیں۔۔۔۔۔ انہوں نے اس شہر کے ایک مشہور معروف وکیل کو hire کیا تھا۔۔۔۔۔ جس کی کوششوں سے حسن صاحب کے خلاف جو دستاویزات پیش کی گئی تھیں وہ جعلی ثابت ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ اور چند ہی پیشیوں میں انہیں باعزت بری کر دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ جعلی دستاویزات پیش کرنے کی بنا پر شہباز کو دھریا



گیا تھا..... لیکن وہ خاموش بیٹھے والوں میں سے نہیں تھا۔

اس دن تنہائی پا کر سیر نے ایک عرصے بعد شازمہ کو مخاطب کیا تھا..... ”مجھے افسوس ہے شازمہ کہ تمہیں مجبوری میں اس رشتے پر آمادہ ہونا پڑا..... میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں..... شادی جیسا بزدلانہ اعتماد، یقین اور محبت کا تقاضہ کرتا ہے..... بہر حال کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا میری سرشت میں نہیں ہے..... تم فکر مند نہیں ہونا حالات بہتر ہوتے ہی میں یہ ممکن توڑ دوں گا.....“ وہ اس سے نظریں چرائے کہہ رہا تھا کہ مبادا اس کی نظر بھول کر اس دشمن جاں کی طرف اٹھ نہ جائے جس سے جدا ہونے کا تصور بھی اس کے لیے سوہان روح تھا پھر وہ اٹھا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔

یہ وہ کیا کہہ گیا اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا سیر کے انداز اور اس کی باتوں نے اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی..... ابھی تو پہلے کے دُخم بھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ وہ نئے تیر برسا گیا تھا..... حسن رہا ہو کر سیدھے ماں کے پاس آئے تھے ماں نے تڑپ کر بیٹے کو گلے سے لگایا تھا..... ماں بیٹے کا یہ ملن دیکھ کر ہر آنکھ اشکبار تھی..... وہ بے حد نادم تھے اپنوں سے دوری نے انہیں کیسے کیسے حالات سے گزارا تھا..... بہر حال وہ وقت گزر گیا تھا مگر کاپٹ تقدیر نے ابھی کچھ اور ہنگامے رکھے تھے..... شازمہ اور سیر اس دن باہر گئے ہوئے تھے کہ فون کی کھٹی بجی..... فون بتایا جان نے اٹھایا تھا..... ”ہیلو“ پھر وہ کچھ دیر دوسری طرف کی بات سننے رہے..... ”کیا.....؟“ کب.....؟ تم ابھی کہاں ہو شازمہ..... کون سے ہاسپٹل میں.....؟“ ان کی یہ گفتگو سن کر سب چونکے تھے۔

”یا اللہ خیر.....!“ دادی کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا وہ تیزی سے بیٹے کے قریب پہنچ گئیں۔

”میں آ رہا ہوں“ بتاتے کہا اور فون بند کر دیا سب کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”شازمہ کی گاڑی پر حملہ ہوا ہے..... سیر کو گولیاں لگی ہیں مگر شازمہ محفوظ ہے.....“ انہوں نے عجلت میں کہا پھر حسن اور چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا ”آپ دونوں میرے ساتھ آئیں، ہمیں ابھی ہاسپٹل پہنچنا ہے۔“

”ہائے میرا بچہ..... میں بھی چلوں گی.....“ دادی نے دہائی دی..... شازمہ تو سنتے ہی وہیں ڈھس گئی تھی..... ”اے سنبھالو.....“ بتایا جان نے کہا..... ”ای آپ سب کو سنبھالیں اور اس کی ماں کو کوئی کچھ نہ بتائے.....“ ثانی جان جو کچن میں مصروف تھیں ان سب حالات سے بے خبر تھیں۔

شازمہ کو نشانہ بنانے کے لیے جو گولیاں شہباز کے بیٹے نے چلائی تھیں وہ شازمہ کے دھوکے میں سیر کو لگی تھیں..... تاہم اس کا نشانہ چوک گیا تھا اور سیر کو معمولی دُخم آئے تھے..... گولیاں شانے کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھیں..... پولیس جو دُوع کے قریب موجود تھی نے مجرموں کا پیچھا کر کے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔

ایک ہفتہ ہاسپٹل میں زیر علاج رہ کر وہ گھر آ گیا تھا..... جہاں روزانہ اس کی مرہم پٹی ہورہی تھی..... اسے تکلیف میں دیکھ کر شازمہ کی حالت غیر تھی..... اس نے سیر کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی..... اس کی یہ خاموش محبت سیر کی آنکھوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی..... اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا ابو جہاڑ گیا تھا..... بے بنیاد دُخ شے وہاں اڑ گئے تھے۔

## صفائی کی گندی عادت

پچھلے سال ہمارے ایک رشتے دار امریکا سے اپنے بال بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ایک دن سب کو چڑیا گھر کی سیر کرانے لے گئے۔ راستے میں کھانے پینے کی چیزیں دلاتے رہے۔ اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر لے لیا۔ سیر تفریح تو کی نہیں۔ سارا وقت کوڑا جمع کرنے میں لگا دیا۔ بال بچوں سے فالٹو چیزیں لے لے کر شاپر میں جمع کرتے رہے۔ کبھی کیلے کے چھلکے، کبھی چمپس کی خالی تھیلیاں۔ کبھی کینوں کے چھلکے۔ کبھی نشو پیچڑ۔ کبھی منزل واٹر کی خالی بوتلیں۔ لوگ چڑیا گھر میں جانوروں سے کہیں زیادہ ان میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ہمیں دیکھ دیکھ کر کوفت ہو رہی تھی۔ ہم نے لاکھ سمجھایا۔ یوں فضول چیزیں سرعام شاپر میں جمع کرنا کوڑا چھننے والوں کا کام ہے۔ آپ کانٹیں۔ نہ مانے کہنے لگے ”امریکا میں سرعام کوڑا کرکٹ پھینکنے والوں پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔“ ہمیں یں سن کر بڑا تعجب ہوا۔ عجب ملک ہے۔ اٹھتے بیٹھتے شخصی آزادی کا پرچار کرتا رہتا ہے اور کوڑا پھینکنے کی بھی آزادی نہیں۔ واہ رے امریکا۔ ہم نے بہلا پھسلا کر شاپر ان کے ہاتھ سے لے لیا اور سونچ ملتے ہی گھما کر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ ہمیں دیکھتے دیکھتے رو گئے۔ ناراض ہو کر کہنے لگے ”آپ نے بڑی گندی حرکت کی ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ گھر چل کر کوڑے دان میں ڈالنا تھا۔ اگر یہ صفائی کی عادت ہے تو بڑی گندی عادت ہے۔“ (اقتباس ”اے دوست“ از ڈاکٹر محمد حسن)

اس دن رات گئے وہ اسے دیکھنے اس کے بیڈ  
روم میں آئی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا.....  
”آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“  
اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

ہوئے چائے چھلکی اور اس کے ہاتھ پر گری تھی.....  
تکلیف کے احساس سے ہلکی سی سسکی اس کے  
ہونٹوں سے آزاد ہوئی تو میر جو سب کچھ دیکھ رہا تھا  
نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”نہیں، سمیر نے کہا تو وہ جانے کے لیے پلٹی۔  
 ”سنو“، ”سمیر نے آواز دی۔ زحمت نہ  
 ہو تو جائے بنا دو۔“ وہ خانوشی سے سر ہلا کر کچن  
 میں آگئی۔ چائے چلے پرچہ اُٹھا کر وہ جیسی ہی  
 پلٹی تو سمیر کو کچن میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ حیران  
 رہ گئی۔ پھر جائے بنانے میں منہمک ہو گئی۔

”دھیان کہاں ہے تمہارا۔۔۔ ہاتھ جلا لیا۔“  
 وہ اس کا نرم و نازک شفاف ہاتھ ہاتھوں میں لیے  
 تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ اس نے بے یقینی  
 سے اسے دیکھا۔۔۔  
 ”چھوڑیں میرا ہاتھ۔۔۔“ اس نے ہاتھ کو  
 جھٹکا دیا۔۔۔ گمراس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔

”تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں.....؟“  
بے تکلفی سے کہتا وہ اس کے انتہائی قریب آ گیا تھا۔ وہ خاموش رہی..... اس کی نظروں کی توجہ وہ اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔  
چائے تیار ہو چکی تھی کہپ میں چائے اٹھیلے

”تمہارا ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا.....“  
ساری زندگی تھانے کے لیے پکڑا ہے.....“ اس نے شرارت سے کہا..... شازمہ نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں اس کی محبت پاش نظروں سے مگرا کر جھکتی چلی گئیں۔ ☆☆

## بچھڑنا بھی ضروری ہے

~~~~~

بعض اوقات انسان سوچتا کیا ہے اور ہو گیا جاتا ہے
... محبت اور نفرت کے درمیان بہت باریک لکیر ہے مگر اس لکیر کو
صرف وہی لوگ پاٹ سکتے ہیں جنہوں نے دونوں جذبوں کا مزہ
چکھا ہو... دوشیزہ کے قارئین کے لیے ایک خوبصورت ناول

~~~~~

عائزہ نے دلہن کے سر پر دوپٹہ ٹھیک سے جمایا اور پیار سے بولی۔

”بس اب اپنا نہ سیدھا کر لو... دلہن کے چہرے پر ایسا غم اچھا نہیں لگتا۔“

”دلہن...؟؟؟ نورالعبین نے مزید غصے سے اسے دیکھا۔ کیا دلہن ایسی ہوتی ہے؟؟؟“

کیا صرف عروسی لباس پہن لینے اور سچے سنورنے سے ایک لڑکی دلہن بن جاتی ہے؟؟؟

”اب بس بھی کرو... جو ہوتا تھا ہو چکا... عائزہ نے بھی اسے سمجھایا۔“

”کیوں فائزہ؟؟؟ آخر یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا...؟ یہ سب تو ناؤز اور افسانوں میں

ہوتا ہے... حقیقت کا کیا تعلق اس سے... یوں خواہ ناخواہ کسی بزدل سے محبت ہو جاتا... پھر... وہ ذراڑکی

... خیر محبت تو صرف افسانوں میں نہیں ہوتی... محبت ایک حقیقت ہے... کل جو ذرا پڑے بیٹھی

تھی سب باتیں سننے کے ساتھ مسلسل کبھی اپنے بال ٹھیک کرنی اور کبھی نیل پالش پر دھیان دیتی... تم

تو چپ رہو کل... نور اس پر چیخ ہی پڑی... تمہارے ساتھ ایسا ہوتا تو پوچھتی...“ کل نے ٹھنڈی آہ

بھری۔

”کاش یہ میرے ساتھ ہی ہو جاتا... مجھے تو سرخیل بھائی بہت اچھے لگتے ہیں...“

”نام مت لو ان کا میرے سامنے... نور کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔“

چلو نہیں لیتی...“ کل لا پرواہی سے بولی۔

”اصل میں تمہیں غصہ کس بات پر آ رہا ہے نور؟ عائزہ نے پوچھا... عاصم کی بزدلی اور بے وفائی





پہا سرخیل بھائی کے ہاں کہنے پر.....؟؟  
 ”دونوں پہ آ رہا ہے..... نور غم و غصے کا شکار تھی..... عاصم تو کبھی نظر آیا تو اسے کچا ہی چبا جائیں۔  
 گی..... اور سرخیل.....؟ انہیں دیکھو کیسے منہ بھر کر جلدی سے ہاں کہہ دی..... جبکہ وہ جانتے ہیں میں انہیں  
 برداشت نہیں کر سکتی.....“

”خیر جلدی سے تو ہاں نہیں کہی انہوں نے..... سچل نے مسکراتے ہوئے لقمہ دیا..... تالیا لٹو سے کافی دیر  
 بحث ہوتی رہی ان کی..... وہ آنکھیں میٹکا کر بولی۔

”تم نے پھر اپنی چونچ کھولی..... نور جل کر بولی..... سرخیل کی چچی ہوتی.....“  
 ”میں کوئی کبوتر یا طوطا نہیں ہوں نور..... وہ بُرا مان کر بولی..... اور نہ ہی میں سرخیل بھائی کی چچی  
 ہوں..... اگر تمہارے ساتھ یہ واقعہ ہو گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں تم مجھے پرندوں اور برتنوں سے تشبیہ  
 دیے لگو.....“

”اچھا اب تم دونوں لڑو تو نہیں..... عازنہ نے چیخ بچاؤ کیا..... اور سچل تم ہی کچھ خیال کرو۔ نور کے ساتھ  
 اتنی بڑی بات ہوئی ہے..... اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے.....“  
 ”مذاق کون کم بخت کر رہا ہے عازنہ..... سچل شہید کی سے بولی..... تمہیں تو پتہ ہے میں اپنی پرسنلٹی کے  
 بارے میں بہت جتنی ہوں.....“

”اچھا بس خاموش رہو اب۔ فائزہ عاجز آ گئی..... نور تم بس اوپر جانے کی تیاری کرو سرخیل بھائی  
 انتظار کر رہے ہوں گے.....“

”کوئی انتظار نہیں کر رہے ہوں گے..... اگر کبھی رہے ہیں تو کرنے دو..... انہیں ہاں کرنے کی سزا  
 ملنی چاہیے.....“

”تو ہاں تو تم نے بھی کی ہے نور؟ کیوں ہاں کی.....؟ انکار کر دیتیں..... سچل نے پھر لقمہ دیا۔  
 ”اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو کر دیتی.....“

”ویسے تو تم بہت بہادر بنتی ہو..... سچل پھر نہ رہ سکی..... اس معاملے میں ٹھس ہو گئیں.....؟  
 ”سچل تم قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں.....“

”پھر تو تم اور نہیں جاؤ گی..... سیدھی جیل جاؤ گی..... ویسے بات مزے کی ہے..... عام طور پر دلہنیں  
 کمرے میں بیٹھ کر دولہا کا انتظار کرتی ہیں..... یہ شاید دنیا کا پہلا واقعہ ہو کہ دولہا کمرے میں بیٹھ کر دلہن کا  
 انتظار کرے گا..... پھر دلہن اندر آئے گی۔ کمرے کا دروازہ لاک کرے گی اور آہستہ آہستہ جا کر دولہا کا  
 گھونگھٹ اٹھائے گی..... کیوں نور.....؟

”تم بہت ڈھیٹ ہو سچل..... عازنہ نے دانت کچکچائے..... تم کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتیں.....؟ سچل  
 نے کندھے لاپرواہی سے اچکائے..... تو عازنہ نے نور کی طرف دیکھا جو سچل کی بات پہ خاموش ہو گئی تھی..... فی  
 پٹک ڈارک اور لائٹ کے امتزاج سے بنے عروسی لباس میں ستاروں جیسی چمکتی خوبصورت آنکھیں..... جس  
 میں اس وقت ستاروں کی ٹھنڈک سے زیادہ چنگاریوں کی حدت تھی..... غصے اور غم سے کندن چہرہ.....

جانے کیوں عازرہ کو افسوس ہونے لگا..... نور کے غصے کی وجہ سے حلیمہ اُسے یہیں سے خدا حافظ کر گئی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی جا رہی تھی..... سب لوگ نور کو اوپر پہنچانے کا کام عازرہ، فائزہ اور بیکل کے سپرد کر کے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عازرہ نے کھڑکی سے باہر جھانکا..... لان میں سرخیل، نیل، شانی اور کاشی کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے..... پھر پھر سرخیل نے ان تینوں کو بھی اپنے اپنے کمروں میں بھیج دیا..... اب وہ اکیلے ہی ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔

”سرخیل بھائی بھی کم پریشان نہیں..... اُن کے لئے بھی تو یہ سب اچانک اور نیا ہے.....“ اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر نور کی طرف مڑی۔

”..... نور اس وقت سرخیل بھائی لان میں ہیں..... یہ سنہری موقع ہے..... اُن کے جانے سے پہلے تمہیں چھوڑ آتے ہیں.....“

”مجھے نہیں جانا۔ عازرہ..... وہ پہلی بار بے بسی سے بولی..... کیا میں کچھ عرصے نہیں رہ سکتی جب تک اس خیال سے اور نئی چھوٹیش سے ایڈجسٹ نہ ہو جاؤں.....“

”دیکھو نیچے رہو گی تو بھی ایڈجسٹ نہیں ہو پاؤ گی.....“ اوپر جاؤ گی تو دھیرے دھیرے آسانی پیدا ہوتی جائے گی.....“ عازرہ نے اُسے چمکارا.....

”عازرہ پلزز..... وہ مدت بھر کے لہجے میں بولی..... بس آج کی رات.....“

”نہیں نور..... تم جانتی ہو تاپا ابوا بھی تک تمہارے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے..... تم نہ گئیں تو وہ کہتے مایوس ہوں گے..... تم چاہتی ہو وہ ساری رات جاگتے رہیں.....“

”بیچارے سرخیل بھائی..... کل پھر بولی..... کس مشکل میں پڑ گئے.....؟“ نور نے غصے سے اُسے دیکھا اور پھر ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی.....

”اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے چلو..... زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا..... تخت یا تختہ.....؟ مجھے اُن سے اتنا گھبرانے کی ضرورت ہی کیا ہے..... کیا وہ مجھے جانتے نہیں؟“

”ہاں لال مرچ کو کون نہیں جانتا.....؟ بھل نے جاتے جاتے دھیرے سے کہا اور کمرے سے نکل گئی..... اب اُس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ عازرہ اور فائزہ نے بیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں طرف سے اُس کا ہنگامہ سمجھ لیا..... تاپا ابوا اوپر کے پورشن میں رہتے تھے..... جسے انہوں نے امریکہ سے واپس آنے کے بعد نئے سرے سے جدید مسائل میں بنوایا تھا..... وہ اوپر گئی تو آئینہ نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا..... ورنہ اتنی دیر سے بیٹی کی بے بسی پہ بے چین سی بیٹھی تھیں..... ہال میں دائیں طرف دوسرا کمرہ سرخیل کا تھا..... عازرہ اور فائزہ نے اُسے بیڑہ بٹھایا اور ایک پیکڈ سوٹ اُس کے پاس رکھ دیا۔

”یہ تمہارے رات کے پہننے کا لباس ہے۔ باقی سب کچھ کل دیکھ لیں گے.....“

”ٹھیک ہے..... بس اب تم جاؤ.....“

”کچھ اور تو نہیں چاہیے؟“

”نہیں..... میں نے کہا نا بس اب جاؤ..... اُس کے لہجے میں اتنی آگئی تو وہ دونوں رخصت ہو گئیں.....“

نورسرخیل کے آنے سے پہلے ہی عروسی لباس تبدیل کر لینا چاہتی تھی۔ تمام زیورات اور میک اپ اتارنا چاہتی تھی..... عازنہ فائزہ کے جاتے ہی وہ جلدی سے بیڈ سے نیچے اترتی..... ابھی اتر کر کھڑی ہوئی تھی کہ سرخیل ایکدم اندر آ گیا..... نور نے ٹھٹک کر دیکھا اور ماتھے پر تیوریاں پر گئیں..... سرخیل بھی اپنی جگہ ٹھٹک کر اُسے دیکھنے لگا۔

”آپ..... وہ حیران ہوئی..... اتنی جلدی.....؟“

رات کا ایک بج چکا ہے..... اس بار سرخیل اُسے دیکھے بغیر اپنی الماری کی طرف بڑھ گیا۔

”میں دراصل..... آپ کے آنے سے پہلے ہی لباس چھین کر نا چاہتی تھی۔“ وہ ذرا تیزی سے بولی۔

”ضرور کیجئے..... میں بھی یہی چاہتا ہوں.....“ سرخیل کے چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے۔ اور نہ ہی

اُس نے دوبارہ اُسے دیکھا۔

”کیوں..... بے اختیار ہی نور کے منہ سے نکل گیا..... آپ کیوں چاہتے تھے.....؟“

”ظاہر ہے..... یہ لباس آپ نے میرے لئے نہیں پہنا تھا..... مجھے اس کے دیکھنے کی خواہش کیوں

ہوگی.....؟“

وہ اپنے کپڑے لے کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا..... باہر آیا تو وہ اسی طرح کھڑی تھی۔ سرخیل اُس کی

طرف توجہ دینے بغیر بک کپس کی طرف بڑھا..... ایک کتاب منتخب کی اور نیچے سیدھے کر کے بیٹھ گیا.....

کتاب کھولی اور پڑھنے لگا..... نور نے حیرت سے اُسے دیکھا دل میں غصے کی لہریں شدت اختیار کرتی جا

رہی تھیں..... آج بھی وہ اُسی پچھی چیز اور پرانی شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ گندے جاگڑا زور کھلے تھے.....

کندھوں تک آتے بالوں کی پونی باندھے پھر رہا تھا۔

”..... آخر آپ کب تک ایسے کھڑی رہیں گی..... اُس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا

جائیے اور لباس تبدیل کیجئے..... رات بھینکتی جا رہی ہے.....“ کہہ کر وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا.....

نور بُری طرح بیچ و تاب کھاتے ہوئے رات کے کپڑے اٹھائے اور بڑی مشکل سے چلتی ہوئی ڈریسنگ

روم میں چلی گئی..... اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ لیکن وہ آخر کیوں روئے

.....؟ جیسے تیسے اُس نے بھاری کپڑے اتار کر کاشن کا پنک کڑھائی والا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور پاجامہ پہنا اور

زیورات انارنے کی طرف متوجہ ہو گئی..... سب کام کر کے باہر آئی۔ تو وہ اُسی طرح بیٹھا تھا..... اُسے محسوس

تو ہو گیا تھا کہ وہ آگئی ہے..... لیکن دیکھنے کی زحمت نہیں کی..... نور کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ ایسے

کر رہا تھا جیسے اُس کی کئی وقت نہ ہو۔

”اگر آپ کا خیال ہے..... آپ میرے ساتھ اس کمرے میں رہیں گے تو آپ بہت بڑی غلط فہمی کا

شکار ہیں مسٹر.....“ وہ لفظ چبا چبا کر غصے سے بولی تو سرخیل نے نظر اٹھا کر ایک لمحہ اُسے دیکھا..... اُس کا چہرہ

سپاٹ اور آنکھیں بے تاثر تھیں۔

”میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں محترمہ..... وہ بے حد سنجیدگی سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا..... لیکن یہ میرا

کمرہ ہے..... اور میرا کمرہ مجھے عزیز ہے..... میں اُسے آپ کے لئے نہیں چھوڑ سکتا.....“

”پھر میں“ وہ کچھ کہنا شروع ہوئی۔  
 ”آپ کے لئے سرخیل نے محل سے بات کاٹی..... تبادلہ کرے گا انتظام کر دیا ہے میں نے.....  
 ساتھ والا کرہ ہے..... آپ کے شایان شان ہے..... فکر نہ کریں.....“  
 ”میں غیروں کی فکر نہیں کرتی.....“ پہلی بار اپنی بے غیرتی کا حساب چکانے کا موقع ملا تھا۔  
 ”غیر.....؟ وہ مخی سے ذرا سا مسکرایا..... کہہ تو ٹھیک رہی ہیں آپ..... دیکھا جائے تو ہم غیر ہیں بھی  
 اور نہیں بھی..... اگر سمجھیں تو عزیز زیادہ ہیں.....

”اور غیر ہی رہتے تو اگر آپ کو ہاں کہنے کی جلدی نہ ہوتی.....“ وہ تڑپ کر بولی تو سرخیل نے  
 نظر اٹھا کر اجنبیت سے اُسے دیکھا..... جلدی.....؟ وہ لب پہنچ کر غصہ دبا کر بولا..... جلدی مجھے تھی یا آپ  
 کو.....؟

”میں لڑکی ہوں..... یہ میری مجبوری تھی..... لیکن آپ تو مجبور نہیں تھے..... انکار کر سکتے تھے.....  
 ”ہاں کر سکتا تھا..... بہت خوشی سے کرتا..... اگر پاپا کا مان ٹوٹ جانے کا خیال نہ ہوتا..... تو سمجھ لیں  
 میں بھی مجبور تھا..... آپ سے زیادہ مجبور.....“

وہ غصے میں کچھ کہنا چاہتی تھی..... اپنے دل کا سارا کرب ساری جہل لفظوں کے سانچے میں ڈھال  
 کر اُس کے دل میں اتارنا چاہتی تھی..... لیکن اُس سے پہلے ہی اُس کی رعب دار آواز آئی۔  
 رات بہت ہو چکی ہے..... اب آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں..... دل کا غبار گل بھی  
 نکالا جا سکتا ہے..... کہہ کر وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا..... نور نے غصے سے قدم اٹھایا تو پھر اس کی  
 آواز آئی۔

”اور جاتے ہوئے اپنے کپڑوں کا خیمہ اور زیورات بھی ساتھ لے جائیے.....“ نور کا بس نہیں چل رہا  
 تھا..... کہ گرم گرم کافی ہو اور اُس پہ انڈیل دے..... اپنے کپڑے سمیٹ کر دروازے کی طرف مڑی  
 تو سرخیل نے کتاب سے نظر ہٹا کر اُسے دیکھا۔  
 ”ایک منٹ.....“

وہ ایک لمحے کو مڑی..... اور اُسے دیکھا..... سرخیل نے سر سے پاؤں تک دھیمی مسکراہٹ اُس کے  
 سراپے پر ڈالی۔  
 ”اُسے ستم ظریفی ہی کہیں حے قسمت کی..... کہ اتنا سجا سجا یا روپ تھا آپ کا..... لیکن اس خوبصورت  
 روپ کو خراج تحسین پیش کرنے والا کوئی نہ تھا..... لیکن زیادہ پریشان نہ ہوں..... ایسا بھی ہو جاتا ہے  
 کبھی.....“

”تو آپ خراج تحسین پیش کر دیتے..... جانے کیسے اُس کے منہ سے ایکدم نکل گیا..... وہ اتنا چپچھائی  
 کر اُس سے نظر نہ ملا سکی..... سرخیل کی آنکھوں میں ایک لمحہ بے تحاشا جھک اُبھری پھر وہ استہزائیہ انداز میں  
 سنجیدگی سے بولا۔

”ضرور خراج تحسین پیش کرتا..... اگر یہ روپ کسی اور کے لئے نہ سجا ہوتا..... اور ہم تو وہ ہیں جو کسی



کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اپنا اپنا ظرف ہے نا.....“  
وہ اُسے غصے سے گھورتی اُس کے کمرے سے نکلے اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔  
لاؤنج میں بیٹھے تایا ابونے گہری ٹھنڈی سانس لی..... اور آہستہ سے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ساتھ والے کمرے میں آ کر نور نے کپڑے لا پرواہی سے صوفے پر پھینکے اور اوندھے منہ بیڈ پر لیٹ گئی..... لیکن اُسے کسی قیمت پر وہ ناخوش تھا نہ عاصم کے کیے یہ اور نہ ہی سرخیل کے لا پرواہ انداز پر..... کتنی دیر وہ بونہی لیٹی اپنے اعصاب کو قابو میں کرتی رہی جو بُری طرح چنچ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ابھی اور بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ گلابی پردے۔ گلابی کارپٹ اور گلابی ہی بیڈ شیٹ صوفے البتہ پھول دار تھے۔ لیکن گلابی اور سفید کا امتزاج اچھا لگ رہا تھا۔ لیس کے گلابی پردے سے چاند کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ سائینڈ میل یہ ایک خوبصورت گلدان میں سفید اور گلابی رنگ کے پھول مہک رہے تھے وہ آہستہ آہستہ چل کر کھڑکی کے پاس آئی اور باہر لان پر نظر ڈالی..... چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور اپنی دو دھیا چاندنی سے ہر چیز کو غسل دے رہا تھا۔ ہر چیز کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ماحول یہ سحر چھایا تھا..... وہ بھی اس طلسم میں پوری طرح جکڑی جاتی اگر آج صبح سے ہونے والے واقعات کی وجہ سے سر میں شدید درد نہ ہوتا..... اس حالت میں نیند آنے کا سوال کہاں تھا۔ اُسے اس وقت شدید ضرورت تھی ایک کپ چائے کی اور دو گولیوں کی..... کاٹنی اُن کی گھریلو ملازمہ بھی تھک ہار کر اپنی کوٹھری میں سو چکی تھی..... وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آئی..... بے آواز قدموں سے چکن کی طرف بڑھی..... رستے میں غیر ارادی طور پر سرخیل کے دروازے سے اندر دیکھا..... وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ آخر ایسی کون سی دلچسپ کتاب ہے کہ رات کے دو بجنے کو ہیں..... لیکن اُس سے چھوڑی نہیں جا رہی..... وہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے واقعات نے اُسے بھی تو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُس کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی۔ پل میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ کل تک وہ کنوارا تھا اور آج شادی شدہ..... وہ بھی اُس لڑکی سے جو کبھی اُسے خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس کا مذاق اُڑاتی تھی اُس کے برعکس اور روپے پر تشدد کرتی تھی۔ اور تو اور وہ پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اُس نے ایک آدھ بار نور کی آنکھوں میں نفرت دیکھی تھی..... اگر پایا کی عزت کا خیال نہ ہوتا..... اگر انہوں نے اتنی بے بسی کے ساتھ ساتھ اتنے مان سے اُس سے سوال نہ کیا ہوتا تو وہ بھی نور سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن پایا کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا..... پھر خیال بچا اور آمنہ چچی کے چہروں پہ پھیلا کر ب اور خوف و ہراس جو کوئی بھی والدین ایسے وقت محسوس کر سکتے ہیں جب گھر سے بیٹی کی بارات اُسے لیے بنائی لوٹ رہی ہو.....

سو کتاب تو اک بھانہ تھی۔ کتاب پر نظر ہوتے ہوئے بھی اُس نے اپنے کھلے دروازے سے پنک کپڑوں کی جھلک گزرتے دیکھ لی تھی۔  
”تو کیا اُسے بھی نیند نہیں آ رہی.....؟“

شاید وہ بھی ساری رات جاگ کر گزارے گی..... شاید وہ سو نہیں پاری اس لیے بچن میں اپنے لیے جائے بنائے گئی ہو..... شاید اُس کے سر میں درد ہو..... وہ اس گھر میں بہت دفعہ آئی تھی۔ لیکن پھر بھی ہوسکا ہے کہ بچن کی چیزوں کا صحیح طور پر اُسے اندازہ نہ ہو..... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہولے سے اٹھا اور چپل پہن کر بچن کی سمت بڑھا..... ساس پین میں پانی رکھ کر اسٹول پر بیٹھی وہ نہ جانے کن کن گہری سوچوں میں گم تھی..... قدموں کی چاپ پر چوکی اور پھر فطری ہٹ دھرمی اور بدتمیزی کا شکار ہو گئی۔

”آپ یہاں کیوں آ گئے؟“ وہ انتہائی بدتمیزی سے بولی۔ اُس کا لہجہ دیکھ کر سرخیل نے سر و نظروں سے اُسے دیکھا اور سخت لہجے میں بولا.....

”تمیز سے بات کریں آپ..... میں آپ کا غلام ہوں نہ ہی اس گھر کا نوکر ہوں جو آپ اتنی بدتمیزی کا اظہار کر رہی ہیں آئندہ خیال رکھیے گا ورنہ شاید آپ نے میرا غصہ نہیں دیکھا.....“

وہ چند لمحے حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ ایسا رعب تھا اس وقت اس کی شخصیت میں کہ وہ ایک لفظ منہ سے نہ بول سکی۔

’اگر آپ چائے بنا رہی ہیں تو ایک کپ میرے کمرے میں بھی دے جائیے گا‘ میرے سر میں شدید درد ہے وہ کہہ کر مڑا۔

سنیہ وہ ایک دم بولی..... اگر آپ کے پاس سردرد کی ٹیبلٹس ہیں تو دو مجھے بھی دے دیجیے گا‘ اس سے کہنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

ٹھمک ہے جب چائے لے کر آئیں گی تو لے لیجے گا۔ وہ سجدہ سنجیدگی سے بولا۔

ٹیبلٹس لینے اور چائے پینے کے بعد بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی آج کی رات کے متعلق اس نے کیا کیا خواب دیکھے تھے لیکن آج کی رات ایک خوفناک خواب کے علاوہ کچھ بھی نہ تھی عاصم اس کا کلاس فیلو تھا دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد عاصم کے والدین اس کا رشتہ لے کر آئے تو وہ کتنی خوش تھی اس کے بھائی نیل اور کرنز کا شادی اور شانی کے علاوہ ابو نے بھی تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد رشتہ منظور کر لیا۔ دونوں کتنے خوش تھے۔ شادی چھ ماہ بعد رکھی گئی تھی کیونکہ عاصم کے تایا ابو نے چھ ماہ بعد امریکہ سے واپس آنا تھا چھ ماہ تک جھپکنے گزر گئے سب تیاریاں مکمل تھیں۔ بات آئی تو نکاح سے پہلے عاصم کے تایا ابو کی نظر عقل چودھری پر پڑی وہ کتنی دیر غور سے اسے دیکھتے رہے اور پھر ایک دم غیض و غضب کا شکار ہو کر کھڑے ہوئے۔

’تم؟‘ وہ بہت نفرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو عقل چودھری؟‘ تایا ابو پریشان ہوئے۔

’میں نور کا تایا ہوں۔ بھتیجی ہے وہ میری.....‘

’یہ شادی نہیں ہو سکتی قاسم..... وہ عاصم کے ابو کی طرف دیکھ کر بولے۔‘

’کیوں بھائی صاحب..... کیوں نہیں ہو سکتی یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟‘ وہ ششدر تھے۔ عاصم بھی حیران تھا۔

’بہی وہ کمینہ شخص ہے جس نے میری پیاری بیٹی فرزانہ کو چھوڑ کر اس سے بے وفائی کر کے ایک گوری سے شادی کر لی..... میری فرزانہ اس کی محبت میں دیوانی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر غم سے خودکشی کر لی۔ یہ قاتل ہے میری فرزانہ کا۔ کیا تم میری بیٹی کے قاتل کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی رچاؤ گے۔ مونگ دلو گے ہمیشہ میرے سینے پر؟‘

لیکن بھائی صاحب..... میں نے تو فرزانہ سے محبت نہیں کی..... وہ صرف میری کلاس فیلو تھی اس کی محبت یکطرفہ تھی میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کبھی اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا، پھر بھی آپ بھی اپنے بھتیجے کو کیوں سزا دینا چاہتے ہیں‘

’قاسم..... انہوں نے جلال سے بھائی کی طرف دیکھا..... کیا تم میری بتائی ہوئی حقیقت کے باوجود عاصم کی شادی اس گھر میں کرو گے؟‘

’بھائی صاحب میں..... میں کیا کہوں آپ سے اب تو بارات آ چکی ہے اور عاصم کی خواہش ہے..... میں عاصم کی خوشیوں سے کسے منہ موڑ سکتا ہوں۔‘

’عاصم..... انہوں نے ٹھور کر عاصم کی طرف دیکھا۔ تم کیا کہتے ہو؟..... تم میری بات کا پاس رکھو گے یا نہیں.....؟‘

’تایا ابو آپ کیا کہہ رہے ہیں..... ایک شریف لڑکی کی بارات واپس جانے کا مطلب جانتے ہیں آپ..... نور کا اس میں کیا قصور ہے۔ برسوں پہلے ہونے والے واقعے کی وجہ سے آپ میری خوشی کیسے چھین سکتے ہیں؟‘

’میں کسی قیمت پر یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔ قاسم اور عاصم تم دونوں سن لو اگر تم نے عقیل کی بھتیجی سے شادی کی تو میرا رامنہ دیو گئے‘

’بھائی صاحب.....‘ قاسم شک زدہ تھے عاصم بھی دم بخود تھا۔

’ہمیں معاف کر دیں بھائی صاحب..... قاسم نے جیل چوہدری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے لیکن میں اپنے بھائی کی لاش پر اپنے بیٹوں کی خوشیوں کا محل تعمیر نہیں کر سکتا۔‘

جیل اور عقیل دونوں دیکھتے رہ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ قوت گویائی سے محروم ہو گئے ہیں

لیکن ابو..... آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ عاصم نے احتجاج کیا۔ مگر وہ دونوں اسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے گئے۔ لان میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ سب گونگے ہو گئے تھے۔

اندرون رنک خبر پہنچی تو وہ کہتے میں آگئی یہ کیا ہو گیا۔ ابھی تو ڈی دیر پہلے کیا تھا اور اب کیا ہو گیا..... یہ سب کچھ کیسے بدل گیا۔

عقیل چوہدری نے معذرت خواہانہ نظروں سے جیل کی طرف دیکھا، مجھے معاف کر دو جیل، میں نے تو خواب میں ایسا نہیں سوچا تھا کتنے کم ظرف لوگ ہیں میری وجہ سے نور کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ بارات کا لونڈا اچھا شگون نہیں ہے۔ سارا مطلب لڑکی پر ہی گرتا ہے۔ میری وجہ سے اس پر یہ قیامت ٹوٹی ہے اس لیے میں ہی اس کا ازالہ کروں گا۔ میں نور کے لیے سرخیل کو پیش کرتا ہوں۔ کیا تمہیں قبول ہے میرا بیٹا؟‘

جبل نے جلدی سے خبر اندر پہنچائی تو نور تڑپ اٹھی۔  
 نہیں..... نہیں..... سرخیل نہیں کوئی بھی اور ہو جائے لیکن سرخیل نہیں..... پلیز عازہ جا کر امی تک میرا

پیغام پہنچا دو ورنہ میں مر جاؤں گی

لیکن اتنے بڑے حادثے کے بعد آمنہ اس کی بات کیسے ناستیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کسی اور نے اپنی خدمات پیش ہی نہ کی تھیں..... یوں بھی شانی اور کاشی تو پہلے سے بک ہو چکے تھے اور عدیل ابھی چھوٹا تھا..... سرخیل کو بلا کر پاپانے پوچھا تو وہ ایک دم دھکی ہو گیا۔ وہ ساری عمر اس لڑکی کے ساتھ کیسے گزارے گا جو ہمیشہ اس پر آواز سے کستی رہی ہے تنقید کا نشانہ بناتی رہی ہے لیکن پاپانے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ ان کا مان نہ توڑ سکا۔ مان تو نور بھی اپنے باب کا نہ توڑ سکی اور مولوی صاحب کے پوچھنے پر قبول ہے کہنا پڑا..... برندوں کی چھپا ہٹ اور کچن میں برتنوں کی آوازیں کے ساتھ بجلی منزل سے انسانی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

ابھی کوئی اوپر آ جائے گا.....

عازہ فائزہ اُسے چھیڑنے اور جبل اُسے ستانے آگئی تو.....؟ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ وہ اُنکے شرارت بھرے

جملے.....

وہ شوخ سرگوشیاں.....

لیکن وہ اُسے اس عرصہ کمرے میں دیکھ کر کیا سوچیں گی.....؟ اُس کی عزت نفس پر حرف آ رہا تھا..... وہ جلدی سے اُٹھی صوفے پر جھینگی ہوئی چیزیں اٹھائیں اور تیزی سے کوریڈر سے ہوئی..... سرخیل کے کمرے میں داخل ہوئی اور چھٹی نگار کپڑے کا پرچہ پھینک دیئے۔ پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا سو چاہ سورہا ہوگا..... لیکن وہ عجب حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا..... وہ شرمندہ ہو گئی..... نظریں جھکا لیں۔

”کیا ہوا.....؟“ وہ شہیدہ تھا..... ڈر گئیں کیا.....؟؟

”وہ..... وہ..... آ..... آپ سوئے کیوں نہیں.....؟“

”آپ کیوں نہیں سوئیں.....؟“ سرخیل نے اُس کا سوال اُسی پر پلٹ دیا.....

”..... ان حالات میں کس کا فرکونینڈ آ سکتی ہے.....؟ وہ جی سے بولی..... تو وہ چند لمحوں اُس کی کیفیت

پر ملحوظ سا ہو کر اُسے دیکھتا رہا..... لیکن چونکہ نور کی نظریں احساس شرمندگی سے جھکی تھیں..... اس لیے وہ دیکھ نہ سکی۔

”اگر آپ کو اپنی عزت نفس کا مسئلہ درپیش ہے..... تو یہ کافی بڑا بیڈ ہے..... اُس کنارے پر لگ کر لیٹ

جائیے..... کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا..... ورنہ وہ صوفہ تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں.....“

نور نے مے مے مے قدموں سے کپڑوں اور زور کو اٹھایا..... کہ بھراؤ اور پھیلا زدہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی..... وہ حد سے زیادہ نفاست پسند تھی..... چیزوں کو الماری میں ہی جگہ بنا کر رکھا اور دھیرے سے آ کر بیڈ کے دوسرے سائیڈ پہ منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گئی..... کبل اور بیسنے تک سمجھ لی..... لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد اُس کی آنکھیں بند ہونا شروع ہو گئی..... لیکن وہ بار بار انہیں کھول کر اُسے دیکھتی رہی.....



لیکن چوبیس گھنٹوں کی اعصابی جنگ نے اُسے اتنا بے حال کر دیا کہ وہ خود سے زیادہ دیر تک نہ لڑ سکی اور کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ پتہ نہ چلا۔

”مجھ پہ اعتبار کرنے کا شکریہ۔“ سرخیل دل ہی دل میں بولا..... کتاب بند کی اور اتنی آہستگی سے لیٹا کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو..... پھر کچھ دیر بعد نیند نے اُسے بھی اپنی آغوش میں لے لیا.....

.....

ابھی چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ کتنی خوش تھی۔ ہر فکر سے آزاد۔ محبت کے رنگوں میں بھیگی آسانوں پہ اُڑ رہی تھی۔ انہی چند روز پہلے اُس کی منگنی ہوئی تھی۔ عاصم سے اُس کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی۔ دوستی پسندیدگی میں بدلی۔ اور پسندیدگی کب محبت میں بدل گئی دونوں کو پتہ ہی نہ چلا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد عاصم کے والدین رشتہ لے کر آئے تو تحقیق کے بعد نور العین کے والد اور والدہ نے ہر قسم کی تسلی کرنے کے بعد ان کو منگنی کے بندھن میں باندھنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ جیل چودھری نے اپنے دونوں بھائیوں سے بھی مشورہ کیا وہ بھی ان کی خوشی میں خوش تھے۔

چوہدری محمد خلیل اور ان کی بیگم عزیزہ کو خدا تعالیٰ نے چار اولادوں سے نوازا تھا عقیل، جلیل اور کلیل بیٹے تھے اور اکلوتی بیٹی عائشہ۔ دونوں ہی با اصول اور اچھے نظریات کے انسان تھے اس لیے اولاد کی پرورش بھی انہی خطوط پر کرنے کی کوشش کی انہیں سچ اور جھوٹ اور اچھائی برائی میں تمیز کرنا سکھایا نماز روزہ کے علاوہ ان مذہبی اصولوں کی روشنی بھی عطا کی جنہیں لوگ عام طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں..... وہ دونوں پرانے زمانے کے لوگ ہونے کے باوجود روشن خیال تھے اور اسلام کو بھی روشن خیال سیدھا اور آسان مذہب سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود جہالت سے بہت دور ہوتے ہیں..... اس کے بغیر بھی عقل و شعور کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ گاؤں میں اسی وجہ سے ان کی بہت عزت تھی لوگ ہر معاملے میں مشورہ کرنے ان کے پاس آتے تھے۔ کافی زیادہ زمینوں کا مالک ہونے کی وجہ سے کھیتی باڑی کرتے تھے اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔

بچے بڑے ہونے لگے تو چوہدری خلیل اور عزیزہ کو ان کی تعلیم کی فکر ستانے لگی یہاں گاؤں میں تو کیا قریبی گاؤں میں بھی اسکول نہیں تھا اور بچوں کو خود سے دور شہر بھیج کر بورڈنگ اسکول میں ڈالنا ان کے اصولوں کے خلاف تھا بچوں کو نظروں سے دور کرنا تو ان کی محبت کی وجہ سے گوارا نہ تھا اور دور رکھ کر وہ ان کی تربیت بھی نہیں کر سکتے تھے یہ خدشہ کہ بچے دور جا کر بگڑ نہ جائیں اپنے نظریات اور روایات بھول نہ جائیں انہیں ایک بہت بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کر گیا انہوں نے اپنی ساری زمینیں بیچ ڈالیں اور اسلام آباد کا رخ کیا جب اسلام آباد میں پلاسٹک کی کمپنیاں آسانوں کو نہیں چھوٹی تھیں انہوں نے اچھے علاقے میں ہزار گز کا پلاٹ خرید کر اس پر بڑا سا گھر بنوایا بچوں کو اسکول میں داخل کروادیا اور ایک بڑی رقم ڈپازٹ کر اسٹور خریدنے میں صرف کردی۔ دن رات کی محنت کا پھل کامیابی کی صورت میں ملا جہاں بڑس ترقی کرتا گیا بچے تعلیم حاصل کر کے آگے بڑھتے رہے اور ایک دن آیا کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے عقیل چوہدری نے باہر کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی فرمائش کر دی ان کے لیے یہ فرمائش پوری کرنا مشکل نہیں تھا لیکن

عقل کی عمر ایسی تھی کہ لاتعداد خدشات انہیں اس فرمائش کے خلاف جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ باہر کے آزاد ماحول میں جا کر لڑے کیا کیا گل کھلاتے ہیں وہاں کی چکا چوند سے کیسے اپنی آنکھیں اندھی کر بیٹھتے ہیں وہ سب جانتے تھے لیکن عقل کی ضد بہت زیادہ بڑھی تو انہیں اپنی تربیت اور دعاؤں پر بھروسہ کر کے اس کی بات ماننی پڑی..... یوں وہ بیس سال کی عمر میں ملک سے چلے گئے بانی کسی بچے نے ایسی ضد نہیں کی بلکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد باپ کے بزنس میں شامل ہو کر اس کو مزید توسیع دینے کے طریقے سوچنے لگے۔ چوہدری خلیل نے کاروبار ان کے حوالے کیا جمیل اور خلیل دونوں ٹھہر گئے تھے اس لیے انہیں کوئی فکر نہ تھی فکر تھی تو صرف عقل کی جو ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہ دیکھا باپ نے واپس آنے کو کہا۔ ماں نے محبت کے واسطے دیے لیکن انہوں نے نہ آنے کی شاید قسم کھا رکھی تھی ماں باپ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کی تربیت میں ضرور کوئی کمی رہ گئی ہوگی ورنہ ایسا کبھی نہ کرتے وہ لیکن ان کی خاطر باقی بچوں کی زندگی آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتے تھے چنانچہ سب سے پہلے عقل نے چھوٹے خلیل کی شادی بہت اچھی لڑکی آمنہ سے کر دی آمنہ پڑوس میں رہتی تھی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی بچپن کی دیکھی بھالی بہت اچھی لڑکی تھی۔

عائشہ سب سے چھوٹی تھی لیکن عزیزہ کا خیال تھا کہ پہلے اس کی شادی کرنی چاہیے چونکہ اس کا رشتہ بھی بچپن سے اپنے ماموں کے بیٹے ساجد سے طے ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے اس فرض سے سبکدوش ہونے میں دیر نہ لگائی۔

سب سے آخر میں جمیل کی شادی ہوئی حلیمہ عزیزہ کی بچپن کی سہیلی کی اکلوتی بیٹی تھی وہ ان کے سامنے ہی شادی کر کے لاہور میں جا بسی لیکن دونوں نے رابطہ رکھا تھا ملے جلتے بھی تھے..... چھٹیوں میں ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا اور عزیزہ کو حلیمہ اپنے جمیل کے لیے بہت پسند تھی کوئی رکاوٹ نہ تھیا اس لیے شادی آرام سے ہو گئی۔

چوہدری خلیل جیسے مضبوط درخت کی شاخوں کو خدانے خوب پھل پھول سے نوازا خلیل اور آمنہ کو ذی شان کا شان اور آخر میں سب سے نوازا توان کی فیملی مکمل ہو گئی۔

عائشہ اور ساجد کو عازرہ فائزہ اور عدیل عطا کیے..... جمیل اور حلیمہ کو نبیل اور نور العین سے نوازا۔

سب ایک ہی گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے..... سب مطمئن تھے بچوں میں دوستی اور محبت کی مثال دی جاسکتی تھی لیکن چوہدری خلیل بے چین اور پریشان رہتے انہیں عقل کی فکر تھی وہ سوا التجاؤں کے بعد بھی واپس نہ آئے۔

باقی بچوں کی خوشیوں سے سبیر زندگی کے باوجود ان کو چین کیسے آتا؟ ان کی سب سے پہلی اولاد ان کے جگر کاٹھڑا ان سے دور تھا وہاں جا کر اسے دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کس حال میں ہے؟ اگر وہ خود ہی وہاں شادی کر لیتا اور خوش ہوا تو پھر انہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ وہ نظروں سے دور ہے تو کیا ہوا خوش تو ہے نا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ تعلیم مکمل کر کے وہ کہاں منتقل ہو گیا ہے کہاں جا چھا ہے پھر ایک بار انہوں نے اڑنی اڑتی خبر سنی کہ اس نے وہاں کسی گوری سیم سے شادی کر لی ہے لیکن اس خبر کی تصدیق نہ ہو سکی۔

پھر انہیں ایک اور دکھ سے دوچار ہونا پڑا عائشہ کے بچے ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ساجد کو اچانک ہارٹ

ایک ہوا اور وہ آنا فانا چل بسا..... ممانی تو ساجد کے بچپن میں داغ مفارقت دے چکی تھیں ماموں نے ساجد کی خاطر شادی نہیں کی اور اسے ماں اور باپ بن کر پالا تھا۔ اور جب ساجد کی شادی ہوئی تو وہ بھی ہمت ہار بیٹھے اور اپنی بیوی کے نقش قدم پر چلتے چلتے اس سے جا ملے۔ اب عائشہ کا کوئی نہ تھا اس لیے چوہدری خلیل اسے بچوں سمیت اپنے گھر لے آئے..... یوں عازہ فائزہ اور عدیل بھی ذیشان کا شان بگل نور العین اور نبیل کے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی اسی عرصے میں کسی موٹر پر چوہدری خلیل عقیل کو دیکھنے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو گئے اور دوسرے موٹر پر عزیزہ شوہر کی جدائی اور عقیل کی واپسی کی راہ دیکھتے دیکھتے ہمت ہار بیٹھیں۔

زندگی کا قافلہ یونہی رواں دواں تھا کہ وقت کبھی کسی کے لیے نہیں رکتا۔ خلیل کے بچے ذیشان اور کا شان تعلیم مکمل کر کے بابا اور چاچا کے بزنس میں آئے تو آمنہ نے جلدی سے دونوں کے رشتے طے کر دیئے..... اسے اپنے میکے سے رابطہ قائم رکھنے کی خواہش تھی۔ ذیشان کی منگنی اپنے بھائی کی بیٹی حنا سے اور کا شان کی منگنی اپنی بہن کی بیٹی عالیہ سے کر دی یوں وہ ہر فکر سے آزاد ہو گئی عائشہ اور حلیمہ کو اچھا تو نہ لگا اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی بھلا وہ اپنی بیٹی زبردستی تو ان کے بیٹوں کے سر نہیں منڈھنا چاہتی تھیں لیکن فطرتاً صلح جو تھیں یوں بھی بات کہنے والی نہیں تھی عاصم سے منگنی کے بعد حلیمہ کے دل و دماغ سے تو فکریں ہی ختم ہو گئی تھیں عائشہ ابھی بھی پریشان تھی دو بیٹیاں تھیں باپ کا سایہ سر پر نہ تھا حلیمہ اسے تسلی دیتی

تم کیوں فکر کرتی ہو عائشہ خدا کا رسا ہے اس نے سب کے لیے جوڑوں کا بندوبست کر رکھا ہے یوں بھی ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ ابھی عازہ اور فائزہ کو ن ساتی بڑی ہو گئی ہیں میری نور سے تو دونوں چھوٹی ہیں مانا کہ تمہاری شادی پہلے ہوئی تھی لیکن شادی کے پانچ سال بعد تک اولاد نہیں ہوئی تھی تمہارے ہاں فکر نہ کرو خدا جو کرتا ہے اچھے کے لیے کرتا ہے۔

یوں بھی حلیمہ کا ارادہ تھا کہ عائشہ سے نبیل کے لیے عازہ کو مانگ لے اسے بھولی بھالی عازہ بہت پسند تھی لیکن پہلے نبیل سے بات کرنا ضروری تھا اس لیے خاموش تھی۔

☆.....

شانی اور کاشی زیادہ باتونی نہیں تھے اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے لیکن جل باتونی بھی تھی اور شوخ و شریر بھی شانی اور کاشی سے کافی دیر کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لیے سب کی لاڈلی تھی۔ دودھ جیسی رنگت اور لائٹ براؤن بالوں کے ساتھ بہت دلکش لکڑی تھی اپنی دلکشی کا اسے احساس بھی تھا۔

نبیل سمجھ دار اور بخیدہ تھا اسے اپنے خاندان کے ہر فرد سے محبت تھی اور وہ سب کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا خاص طور پر نور العین سے بہت محبت کرتا تھا۔

نور العین اس گھر میں سب سے مختلف تھی مزاج کی ذرا تیز تھی ہر بات کا جواب زبان کی نوک پر لیے پھرتی تھی وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی رنگ بھی کھل کی طرح اتنا صاف نہ تھا اس کی شخصیت کی سب سے زیادہ قابل توجہ چیز اس کی آنکھیں تھیں بڑی بڑی سیاہ مقناطیسی آنکھیں جن میں یوں لگتا تھا لاکھوں ستارے اتر آئے ہوں۔ ایک بار جو اس کے چہرے پر نظر پڑی تو دوسری بار دیکھنا ضروری ہو جاتا تھی Expressive اور چمکدار آنکھیں گھر میں کسی اور کی

نہیں سب اسے پیار سے نور کہتے تھے اس کی شخصیت میں ایک اور بات تھی جس سے کبھی تو گھر والے تنگ آ جاتے۔ وہ اس کی حد سے زیادہ نفاست پسندی تھی صفائی سحرائی کا اسے جنون تھا۔ دن میں دو بار نہا کر لباس تبدیل کرنا اس کی روش تھی۔ اسی طرح گھر کو ہر وقت صاف سحرار کھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا اس کا بس چلتا تو گھر ہر وقت آئینے کی طرح چمکتا رہتا لیکن ہر وقت کی نیکی زبان اور غصے کے اظہار کے باوجود ایسا ممکن نہ تھا۔ باقی کزنز جان بوجھ کر اس کی عادت کو جانتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتے جس سے اسے غصہ آ جاتا اور پھر لال مرچ نیکی چھری اور نہ جانے کیا کیا القابات سننے پڑتے لیکن اسے پرواہ نہ تھی اس کا کرہ اس کے مزاج اور فطرت کی عین عکاسی کرتا تھا صاف شفاف آئینے کی طرح چمکتا ہوا ہر چیز اپنی مخصوص جگہ پر کپڑوں کی الماری کی ترتیب بھی خراب نہ ہونے دیتی بیڈ کور پر کوئی سلوٹ نہ پڑنے دیتی حواریں رضیہ بی بی کی ہر وقت شامت آتی رہتی اپنی منگی کے دنوں میں بھی اس نے اپنے کمرے کو بے ترتیب نہیں ہونے دیا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے بار بار کارپٹ صاف کرنا پڑتا۔ مہمانوں کی آمد کی وجہ سے آمنتائی نے ڈیشیاں بھائی کی منگیترنا کو اس کے ساتھ ٹھہرانا چاہا لیکن اس نے معذرت کر لی وہ حنا کو جانتی تھی سلیقہ نام کی کوئی چیز اس میں نہیں تھی تائی جان آپ حنا اور عالیہ دونوں کو بھل کے پاس ٹھہرا دیں دلہن کو پرائیوٹ کیسی چاہیے ہوتی ہے۔

’لو جی کیسا زمانہ آ گیا ہے ہمارے زمانے میں تو کوئی ایسی بات کہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔‘

’تائی جان اب وہ زمانہ تو گزر گیا نا اور میں نے غلط تو نہیں کہا‘ وہ ضرورت سے زیادہ عاجزی سے بولی تو تائی اماں حیران ہو گئیں۔۔۔۔۔۔ یہ نیکی چھری اور یہ لہجہ۔۔۔۔۔۔ انہیں خاموش ہونا پڑا

نور العین اپنے کمرے میں عازنہ اور فائزہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔۔۔۔۔۔ تینوں باتیں کر رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ نور العین کسی ڈرامے پر تبصرہ کرنا چاہتی تھی جبکہ عازنہ اس کے عروسی لباس کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ عازنہ کیا بات لے نہیں تم۔۔۔۔۔۔ نور چڑ گئی کر لیں گے نا ابھی تو چھ ماہ پڑے ہیں ’وقت گزرنے کا کوئی پتہ چلتا ہے یوں گزر جاتا ہے عازنہ نے چنگلی بھائی۔

ہاں نور۔۔۔۔۔۔ تمہیں کچھ تو سوچنا ہو گا وقت گزرنے میں دیر نہیں لگتی۔۔۔۔۔۔ پھر ڈریسز تیار کرنے والوں کے خعرے تو تم جانتی ہو۔

’ہو جائے گا سب تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔۔ ابھی بڑا وقت ہے۔ وہ شاہانہ انداز میں بولی کم از کم کلر اسکیم کے بارے میں تو سوچ لو کام اور اسٹائل بعد میں دیکھ لیں گے‘

کلر تو تم جانتی ہو۔۔۔۔۔۔ پنک میرا پسندیدہ رنگ ہے اس کے ارد گرد دیکھنا ہو گا چاہے ٹی پنک ہو جائے یا لائٹ ڈارک پنک کا کبھی نیشن۔۔۔۔۔۔

لیکن نور تمہارے چہرے کے رنگ کے مطابق ڈارک کلر زیادہ سوٹ کرے گا۔ عازنہ ڈرتے ڈرتے بولی۔۔۔۔۔۔ تو وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور اسے گھورنے لگی۔

’تمہارا مطلب کیا ہے؟‘ تم کہنا چاہتی ہو میں کالی ہوں‘



’تو یہ کرو میں نے ایسا کب کہا ہے‘ عازرہ جلدی سے بولی ’تمہارا رنگ تو بہت خوبصورت گندمی ہے..... اور پھر تمہارے چہرے کو کسی اور چیز کی ضرورت ہی کیا ہے‘ تمہاری آنکھیں ہی ہر کی پوری کر دیتی ہیں۔

’ہر کی.....؟ اس کی وہی آنکھیں غصے سے بھر گئیں کون سی کی ہے مجھ میں ذرا مجھے بھی تو ہوتا چلے.....؟ عازرہ ڈر کر چپ ہو گئی۔

’اور میرے چہرے پر صرف تمہیں آنکھیں ہی نظر آتی ہیں تم نے مجھے ایلین سمجھ رکھا ہے۔ کیا کی ہے میری ناک۔ کان اور ہونٹوں میں؟

’تمہاری یہی بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ بس ذرا سی بات ہوئی اور تم لال مرچ کی طرح سرخ ہو گئیں تم سے کوئی بات بھی نہیں کر سکتا..... عازرہ شاکی انداز میں بولی..... نور نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

’اور میرے بالوں کے متعلق کیا خیال ہے‘ کتنے چمکدار لمبے اور سیاہ ہیں۔ وہ نظر نہیں آتے تمہیں یہ تو ہے تمہارے بال اور تمہاری آنکھیں دونوں چیزیں لاکھوں میں ایک ہیں..... یہی

دو چیزیں تو تمہاری شخصیت کو خوبصورت بناتی ہیں۔‘ عازرہ اپنے دھیان میں بولی

’ورنہ تو میں دنیا کی بد صورت ترین لڑکی ہوتی ہے نا؟‘ اس نے انتہائی ناگوار سی سے عازرہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم حراساں ہو گئی۔

’اور میرے مزاج کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس کی تیزی تو میری بد صورتی کو چار چاند لگا دیتی ہوگی..... کیوں عازرہ؟‘

’اچھا اب بس کرو ہر وقت چلتے تو بے پریشی رہتی ہو کبھی تو مزاج میں نرمی آنے دیا کرو..... تم تو جانتی ہو تم کچھ بھی کہہ لو..... تم خوبصورت ہو۔ بس اب غصہ ختم کرو اور رنگ کا فیصلہ کرو۔

رنگ دے دی رہے گا۔ یہ میرا اہل فیصلہ ہے۔ وہ خدی لہجہ میں بولی

’دیکھو نو رشا دی پڑا رک کھرا چھا لگتا ہے لائٹ کرو لیسے پر پہنتے ہیں..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... اور یار یہ کیا بات ہوئی میں اپنی ہی شادی پہ پسند کے کپڑے نہیں پہن سکتی۔

تبھی دروازہ زور سے کھلا۔ تینوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ بکل بھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور ایکسا محط سے سلیڈ رنگ گلابی ہو رہا تھا۔

’تم کیا آندھی کی طرح نازل ہو جاتی ہو.....؟ اور یہ اتنے گندے جوگز میرے کارپٹ پر پھل تمہیں آخر کب عقل آئے گی اچھا یہ بتاؤ آندھی کی طرح کیوں نازل ہوئی ہو؟

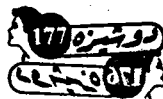
’ارے طوفان جو آنے والا ہے..... آندھی کے بعد طوفان ہی تو آتا ہے.....

’کیسے طوفان.....؟‘ تینوں یک زبان ہو کر بولیں۔

’ایسی خبر لائی ہوں کہ سنو گی تو آندھی آئے نہ آئے طوفان تو آئے گا ہی.....‘

’کچھ پھوٹو بھی منہ سے.....‘ نور سے نمبر نہ ہو سکا۔

(باقی آئندہ ماہ دوشیزہ میں ملاحظہ فرمائیے)



افسانہ

خالد فاروق آسی

# آتشِ عشق

اس کو بھی کسی سے عشق ہو گیا تھا..... یہی نظر کی محبت ہوتی ہی  
ایسی ہے کہ انسان کو روگ لگ جاتا ہے.....



شہر کے اس فیشن ایبل علاقے میں دو کنال پر بنی ہوئی وسیع کوٹھی میں رہتے تھے اور میرے باپ کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی بہن کے سر پر ہاتھ رکھنا کبھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور نہ کبھی یہ پوچھا تھا کہ وہ کس طرح گزارہ کرتی ہیں اور نہ کبھی اپنے گھر میں ہونے والی تقریبات میں ہماری شمولیت کو ضروری سمجھا تھا۔ البتہ میری ماں کبھی کبھی بھائی کی محبت کے جوش میں بس اور ویکن پر دھکے کھاتی چلی جاتی تھیں۔ ایسے ہی دو ایک موقع پر میں نے اجالا کو دیکھا تھا۔

"یہ سویرا ہے ذوہیب"

ماں ہر بار بڑی حسرت سے اسے دیکھتی تھیں۔  
"جب چھوٹی سی تھی تو میری گود سے نکلتی ہی نہیں تھی ہر وقت چھپو کہتی میرے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔"

"اچھا! میں سرسری نظر سے اسے دیکھتا۔"

"یاد ہے ناں۔ بچپن میں تم اس کی انگلی پکڑ لیتی تھی، تو پھر بھابھی تمہیں کتنا ہی لالچ دیتیں، کتنی ہی منتیں کرتیں، تمہاری ایک ہی ضد ہوتی۔ نہیں میں آپ کے ساتھ نہیں، زہبی کے ساتھ جاؤں گی۔"

امی، سویرا کو یاد دلاتیں اور متوقع نظر سے مجھے دیکھتیں۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی خوبصورت یاد موجود نہیں تھی۔ شاید ماں جی کبھی ہو۔ لیکن وقت نے مجھ سے ہر خوبصورت یاد جھین لی تھی۔ مجھے یاد تھا تو صرف یہ کہ مجھے بڑھنا ہے، محنت کرنا ہے اور ماں کے ہاتھوں سے سوئی دھاگہ جھین کے پھینک دینا ہے اور اپنے ان رشتے داروں کے مقابل کھڑا ہونا ہے، جو آج آکھ چراگر گزار جاتے ہیں۔

اماں کو حیرت ہوتی تھی کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ جب کہ بچپن میں سویرا کا دیوانہ تھا اور ہر روز

جنوری کی شدید جان لیوا سردی میں میرے من کے اندر لگی آگ کو کوئی محسوس نہیں کر سکتا اور پچھلے کئی سالوں سے میں اندر ہی اندر یونہی جل رہا ہوں، تب رہا ہوں اور یہ آگ ٹھنڈی ہونے میں نہیں آتی۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ گریبان چاک کر کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں۔ شاید اس طرح میرے اندر جلتی آگ مدہم پڑ جائے۔ مجنوں کو بھی کوئی ایسی ہی آگ جلا رہی تھی کہ وہ جنگلوں کی خاک چھانٹتا پھر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ آگ جو نیچے ہر وقت جلائے رکھتی ہے۔ کیسی آگ ہے؟ کبھی کبھی تو یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے، شعلے اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ مجھے خوف آنے لگتا ہے کہ کہیں یہ شعلے میرے ساتھ کسی اور کو بھی راکھ نہ کر دیں۔ تب میں گھبرا کر اس پر پانی انڈیلنے لگتا ہوں۔ انڈیلتا جاتا ہوں، انڈیلتا جاتا ہوں اور پھر ہولے ہولے یہ آگ مدہم پڑ جاتی ہے، پر بجھتی نہیں۔ یہ آگ برسوں پہلے اچانک ہی میرے اندر جاگ اٹھی تھی۔

وہ میرے ماموں کی لڑکی تھی۔ دلکش اور خوبصورت، جھیل سی سیاہ آنکھوں اور گھنے چکیلے بالوں والی۔ گلابی رنگت پر شفق کی سرخی کا گمان ہوتا۔ وہ ہر طرح سے ہر زاویے سے دلکش لگتی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار نہیں دیکھا تھا مگر اس روز مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ اس روز میں اماں کے بے حد اصرار پر ماموں کے ہاں آیا تھا۔ حالانکہ میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ ہمارے اور ماموں کے ایشیئس میں فرق تھا۔ میں شہر کے ایک پرانے محلے میں چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ جس میں صرف دو کمرے تھے اور میری غریب اور خوددار ماں میرے باپ کے مرنے کے بعد کپڑے سی سی کر زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی۔ چچا

تھا انہوں نے اور ضروری تو نہیں تھا کہ اس دعوت نامے پر ہم بھاگے ہی چلے آتے۔ لیکن میں اماں کو کیسے سمجھاتا؟ جن کا دل یہ دعوت نامہ پا کر کھل اٹھا تھا اور جنہوں نے نہ جانے کس مقصد کیلئے رکھے ہوئے سو روپے نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ذوہیب! یہ ممانی کے ہاتھ میں دینا سلائی کے۔"

میں اماں کے اصرار پر مجبور ہو کر چلا تو آیا تھا، لیکن اب اندر ہی اندر نادام ہو رہا تھا اور سر جھکائے بیٹھا تھا کہ وہ اچانک میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"ذوہیب! آپ کچھ ڈربک لیں ناں؟" "جی!" میں نے حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی اور پھر اس نے میرے کو اشارے سے بلایا اور کوک کا گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے خواب کے سے عالم میں گلاس پکڑ لیا۔

اس نے سیاہ ستاروں والا بڑا سادو پٹا اوڑھ رکھا تھا اور سیاہ لباس میں بہت دلکش لگ رہی تھی۔ "تھینکس" میں نے نظریں جھکا لیں۔

ذوہیب! "یہ نہیں اس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں نے چونک کر نظریں اٹھا لیں اور اب کے ساری خوبصورت یادیں میرے دل کے دروازے پر دستک دیے لگیں۔

مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب کبھی وہ ہمارے گھر آتی تھی تو میں بہت خوش ہوتا تھا اور جب وہ چلی جاتی تھی تو بہت روتا تھا اور ضد کرتا تھا کہ "اماں سویرا کو ادھر ہی کیوں نہیں لے آتیں" اور اماں مسکرا کر کہتیں۔

"ہاں، ہاں۔ لے آؤں گی سویرا کو ہمیشہ

ضد کرتا تھا کہ سویرا کو گھر لے آئیں۔ مگر مجھے واقعی کچھ یاد نہیں تھا اور شاید سویرا کو کبھی کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ بڑی اجنبی نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور پھر لا پرواہی سے اپنے بالوں کو جھٹکتی، ادھر ادھر منظر سے ہٹ جاتی تھی۔ شاید دولت کے انبار میں دب کر ساری یادیں مٹ گئی تھیں۔ مگر مجھے ابالا سے کوئی شکوہ نہیں تھا، کیونکہ مجھے خود بھی کچھ یاد نہیں تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ماموں نے اپنے گھر میں ہونے والی تقریبات میں ہماری شمولیت کو کبھی ضروری نہ سمجھا تھا، مگر اس روز نہ جانے ماموں کے دل میں کیا خیال آیا تھا، شاید لا شعور میں دہی ہوئی بہن کی محبت نے اسکا یا تھا یا چھوٹے اور بڑی خالہ کے خیال سے انہوں نے ہمیں اپنے دلی عہد یا سر کی منگنی کی تقریب میں بلا بھیجا تھا۔ اماں کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، اس لئے انہوں نے مجھے ماموں کے گھر بھیج دیا۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا، لیکن اماں کے اصرار نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس شاندار محفل میں میری کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ ماموں بھی شاید میری طرف دیکھنا گوارا نہ کریں اور میرے پاس تو ڈھنگ کا کوئی لباس بھی نہیں تھا۔ میں نے وہی بدرنگ گھسی ہوئی جینز پہنی ہوئی تھی، جو اکثر میری غربت کا پردہ رکھ لیتی تھی، لیکن میری شرٹ کی بوسیدگی صاف نظر آرہی تھی۔

اس رنگ دبوکی محفل میں جا کر یکا یک میں احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا اور ایک کونے میں سب کر بیٹھ گیا تھا۔ کسی نے مجھ پر توجہ نہ دی تھی۔ ماموں نے بھی ایک اجنبی نظر مجھ پر ڈال کر رخ بدل لیا تھا۔ یقیناً وہ سوچ رہے ہوں گے کہ میرے پاس ڈھنگ کا کوئی لباس نہیں تھا تو میں آیا ہی کیوں تھا۔ آخر ایک رکی ساد دعوت نامہ ہی تو بھیجا



کیلے۔ پر تم بڑے تو ہو جاؤ۔

اسے اپنے اندر جھانک کر دیکھتا اور اب جب وہ دکھائی دی تھی تو۔۔۔!

کیا میں بہت زیادہ حقیقت پسند تھا اور مجھے اس بات کی آگہی تھی کہ وہ میری نہیں ہو سکتی اور جو اماں میرے بچپن میں ایک خواب دیکھا کرتی تھیں، وہ کبھی تعبیر نہیں پاسکتا۔ اس لئے کہ میرے اور اس کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

دو کنال پر بنی ہوئی کوٹھی میں رہنے والی چار مرلے کے بوسیدہ مکان میں کیسے رہ سکتی تھی۔ شاید اسی حقیقت پسندی نے اس کی محبت کی راگنی میرے اندر روشن کرنے کی بجائے اس کے ہجر کی آگ جلا دی تھی۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں دبا ہوا سو روپے کا نوٹ پسینے میں بھگ گیا تھا۔ میں جانتا تھا اس سو روپے کی یہاں اس گھر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پھر بھی میں اماں کی امانت ممانی کے سپرد کر کے ہی جانا چاہتا تھا۔ لیکن ممانی نجانے کہاں تھیں۔

میں ممانی کو ڈھونڈتے ہوئے ایک بار بھر سویرا تک جا پہنچا۔ میں نے سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اماں نے بھیجا ہے تمہارے بھائی کی مگتیر کیلے۔"

"ارے تو کیا آپ ہمارے ساتھ لڑکی داؤں کے گھر نہیں چلیں گے؟"

اس کی پہیلی نے کہا۔ وہ بہت شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں وہ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں"

"ذوہیب!"

میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

اور میرا دل دھک دھک تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی جگنو سے چمک رہے تھے۔ شاید اس کے دل میں بھی کوئی سوئی ہوئی یاد جاگ اٹھی تھی۔ اسکے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔

"ذوہیب آپ!" سویرا تم کہاں ہو بھی مسز ندیم بڑی دیر سے تمہارا پوچھ رہی ہیں۔" ممانی اسے پکارتی ہوئی آئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں اور وہ بات مکمل کئے بغیر ممانی کے ساتھ چلی گئی۔

ممانی نے شاید مجھے دیکھا نہیں تھا اور اگر دیکھا تھا تو شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ میری نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ پھر وہ خواتین کی ایک ٹولی میں شامل ہو کر میری نگاہوں کے حصار سے نکل گئی اور ایک دم ہی میرے اندر آگ جل اٹھی۔ جیسے میرا سارا وجود اس میں جلنے لگا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ مگر اندر آگ جوں کی توں جل رہی تھی۔

"یہ کیسی آگ ہے؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "جو یکا یک ہی میرے اندر جل اٹھی ہے"

"فراق کی، جبر کی، جدائی کی آگ"

مگر ابھی تو میں نے اسے جاہا ہی نہیں، ابھی تو ہم دونوں نے کوئی عہد و پیمان بھی نہیں کئے، ابھی تو میں نے اچھی طرح سے اسے دیکھا بھی نہیں۔ اسے پانے کے خواب حاصل کرنے کی خواہش اور تنہا کچھ بھی تو میرے اندر پیدا نہیں ہوا اور جدائی کی آگ جھڑک اٹھی تھی۔ ابھی ابھی تو میرے دل کو ادراک ہوا تھا کہ وہ کسی خوبصورت یاد کی صورت میں میرے دل میں موجود ہے، لیکن مجھے ہی یہ فرصت نہیں تھی کہ

"سوریا"

ممائی نے شاید دور سے مجھے اس کے قریب کھڑے دیکھ لیا اس لئے پکارا اور اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

اس نے نوٹ میرے ہاتھوں سے لے لیا اور مڑ کر ممائی کی طرف دیکھنے لگی اور میں دل میں بھڑکتی آگ لے کر وہاں سے چلا آیا۔ تب سے ہی یہ آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے اور ٹھنڈی ہونے میں ہی نہیں آتی۔ ٹھٹھری سردیوں میں، میں نے کتنی راتیں کھلے آسمان کے تلے ٹپٹے ہوئے گزار دیں اور کتنی ہی محسوس جلتے جلتے رہا۔ مگر پیش کم نہیں ہوئی۔ کئی بار دل چاہا اس کے پاس جاؤں اور کہوں سوریا میں ہار گیا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم تک میری رسائی نہیں ہو سکتی۔ تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور تمہارے ہجر کی آگ مجھے جلا رہی ہے۔ یہ جلتی آگ کیسے ٹھنڈی ہوگی؟ اجالا تم ہی کوئی راہ بتاؤ۔ مگر میری ہمت ہی نہ پڑی۔ میں کہاں اور وہ کہاں؟ ایک زمین کا ذرہ دوسرا آسمان کا چاند۔ چکور بھلا کہ۔ چاند کو چھو سکا ہے۔

کتنی میں سوچتا یہ آگ بس ایک ہی طرح ٹھنڈی ہو سکتی ہے کہ سوریا کے دل میں بھی میری محبت کی آگ جل رہی ہو۔ اس کا ایک جملہ، ایک محبت بھرا جملہ، ایک دلکش اعتراف کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس آگ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ بھلے وہ مجھے نہ ملے اور پھر بھلا میں اسے پانے کی تمنا کروں ہی کیوں؟ میں اسے کہاں وہ آسائش دے سکتا ہوں؟ جن کی وہ عادی ہے۔ بس وہ ایک بار ایک بار آکر کہہ دے۔ "ذوہیب!" میں بھی تمہیں چاہتی ہوں۔

تو میرے اندر جلتی آگ مانند پڑ جائے اور میں

ساری زندگی اس جلتی کی ٹھنڈک سے اپنی آگ کو ٹھنڈا کرتا رہوں گا۔ مگر یہ کیسی انہونی خواہش تھی؟ وہ بھلا کیوں کہتی؟ مجھ سے محبت کیوں کرتی؟ میری شخصیت میں تو کوئی چارم نہیں تھا۔ نہ بے تحاشا دولت کا، نہ حسن کا۔

میں تو بس عام سی شکل و صورت کا لڑکا تھا اور بے شمار لوگوں کے، ہجوم میں میری انگ سے کوئی پہچان نہیں تھی اور صرف اس لئے کہ بچپن میں ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا تھا۔ وہ بھلا مجھے کیوں چاہتی؟ لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا۔ جس میں وہ ایک دم ہی اتر آئی تھی۔ وہ سیاہ ستاروں بھرے دوپٹے کے بالے میں چھپا اس کا چاند سا چہرہ، وہ اس کے چھوٹے چھوٹے خم کھاتے ہوئے ہونٹوں کی دلکش مسکان اور وہ اس کی لائنی سیاہ گرتی اور اٹھتی ہوئی پلکیں۔ میں دنوں، ہفتوں، مہینوں اسے سوچتا رہا اور اس کے ہجر کی آگ مجھے جلاتی رہی۔

اس روز میں یونیورسٹی سے کچھ جلد ہی نکل آیا تھا کیونکہ موسم بہت خطرناک ہو رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ بارش برسنے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ میری جیب میں رکھے یاغیسی کا ٹکڑا یہ نہیں تھا۔ سو میں بس اسٹاپ پر کھڑا بس کا منتظر تھا کہ یکا یک پہلے بڑی بڑی بوندیں گریں اور پھر موسلا دھار بارش۔ میں شید کے نیچے ہونے کے باوجود بیگ راتھا اور بس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ تب ہی بالکل اچانک برسی بارش میں ایک گاڑی میرے قریب آکر رکی۔

"ذوہیب! آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

"نہیں سوریا! آپ کو تکلیف ہوگی، ابھی بس آ جائے گی۔"

میں اس سے پوچھوں گا۔

”سوریا کیا اب بھی تم۔۔۔؟“

مگر ایسا کچھ کچھ نہ ہوا۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی۔ حتیٰ کہ اس نے گاڑی روک دی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ بارش برس رہی تھی میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

”ظہر ہے! آپ بھیک جائیں گے۔“

”مگر گاڑی اندر لگی میں نہیں جا سکے گی۔ کوشش کرتی ہوں۔“

”نہیں پلیز تم تکلیف نہ کرو سوریا۔“

میں باہر آ گیا اور پھر مجھے خیال آیا کہ وہ تو اماں سے ملنے کو کہہ رہی تھی۔

”گھر چلو گی اماں سے ملنے“ میرے لہجے میں خود بخود بے تکلفی سے آگئی تھی۔ جس پر اس کی آنکھوں میں حیرت سی اتر آئی اور میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو گیا۔ کیا سوچتی ہوگی وہ کہ ذرا سی لفٹ کیا دے دی ہے۔ مذمت سے میری پلکیں جھک گئی تھیں۔

”نہیں پھر کبھی آؤں گی۔ آپ پھپھو سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔“

”اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ، بہت تکلیف ہوئی آپ کو۔“ میں نے آہستگی سے کہتے ہوئے سر اٹھایا تو ہلکی سی مسکراہٹ مجھے اس کے ہونٹوں پر محسوس ہوئی نظر آئی اور پھر وہ تیزی سے آگے نکلتی چلی گئی۔ میں اس وقت تک کھڑا رہا، جب تک اس کی گاڑی نظر آتی رہی اور بجکتا رہا، لیکن اندر وہی سی آگ بھڑک رہی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی، اس اچانک ملاقات کے بعد بجائے اس کے کہ یہ آگ کچھ کم ہوتی اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔ جوں جوں یہ

”کوئی بات نہیں پھپھو سے بھی مل لوں گی، بہت دنوں سے انہیں دیکھا نہیں ہے۔“

لیکن گاڑی آگے گئی تک نہیں جا سکتی، میں ہچکچایا۔ آپ آئیں تو۔ وہ سیدھی ہو کر سامنے دیکھنے لگی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا چاہا وہ لاگ تھا۔ میرا ہاتھ پچھلے دروازے پر تھا۔ جب اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ لمحہ بھر کیلئے مجھے یوں لگا، جیسے اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی ہو اور پھر اسی حیرت میں ملال سا اتر آیا۔ میں یونہی ہاتھ دھرے اسے دیکھ رہا تھا اور میرے کان اس کے ایک جملے کے منتظر تھے۔

”آپ فرنٹ سیٹ پر آ جائیں ناں“

مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ یوں ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے پیچھے مڑ کر لاگ کھولا اور سیدھی ہو گئی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سر جھکا دیا۔ میرے اندر جلتی آگ اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔ کبھی کبھی سراٹھا کر میں اس کی پشت دیکھ لیتا اور بس۔ کئی دفعہ میں نے لب کھولے اور میرا دل چاہا اس سے پوچھوں۔

”سوریا! کیا تمہیں اپنے بچپن کی کوئی بات یاد نہیں“ اور جب وہ کہے نہیں۔ تو میں اس سے کہوں۔ ”سوریا“ مجھے تو اپنے بچپن کی ہر بات یاد آگئی ہے۔ خاص طور پر تو میں وہ دن بھی نہیں بھولتا۔ جب ابو نے تم سے پوچھا تھا۔ ”سوریا تم بڑی ہو کر کیا بنو گی؟“

تو تم نے کہا تھا کہ ”میں بڑی ہو کر مہی کی دہن بنوں گی۔“

جب تمہاری اس بات پر سب ہنس دیئے تھے تو تم شرم کر اماں کی گود میں چھپ گئی تھی اور جب میں اسے یہ بات بتاؤں گا تو اس کے چہرے پر رنگ بکھر جائیں گے اور اس کی پلکیں جھک جائیں گی۔ تب

نہیں رہوں گا۔ اس کے حصول کی خواہش کو دل میں جگہ دیتے ہوئے بھی خوفزدہ ہو جاؤں۔ اب میرے اندر جلتی آگ میں امید کا پھول کھل سکتا تھا، مگر وہ پتہ نہیں کہاں تھی اور میں شاید کل یا برسوں چلا جاؤں گا اور پھر جانے کب ملاقات ہو۔ ہو یا نہ ہو۔ جب ممانی بے چینی سے پہلو بٹولنے لگیں اور ماموں بار بار گھڑی دیکھنے لگے تو میں کھڑا ہو گیا۔

”اچھا خدا حافظ“

جب ہی وہ چوٹ کھاتی اور کندھوں پر رکھے پرس کو ہلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”اما آج“۔۔۔ اور پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں چمک اٹھی ہوں اور ان میں ننھے ننھے تارے دمک رہے ہوں۔

”مبارک ہو اتنی شاندار کامیابی پر“

”شکریہ“

تو کیا وہ میرے متعلق خبر رکھتی ہے؟ میرا دل خوش سے دھڑکنے لگا۔

”آب جار ہے ہیں کیا؟ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں اب کھڑا ہو چکا تھا، ماموں کو خدا حافظ کہہ چکا تھا، اس لئے دوبارہ بیٹھنا مجھے اچھا نہ لگا۔

”جی“

”بیٹے“

”تمہیں اب چلوں گا۔“

میں نے ایک نظر اس کے چمکتے ہوئے گھائی چہرے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا وہ میرے ساتھ ہی باہر نکلے۔

”ذہیب“

میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں

بھڑکتی میں اس کے تصور سے بچنے کیلئے خود کو کتابوں میں گم کر دیتا۔ پتہ نہیں یہ آگ کبھی بجھے گی بھی یا نہیں۔ کبھی کبھی میں کتاب کھولے سوچوں میں کھو جاتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں وقت ہر خرم کو مندل کر دیتا ہے۔ شاید گزرتے وقت کے ساتھ یہ آگ مدہم پڑ جائے، بجھ جائے، مگر جانے اس میں کتنا وقت لگے، ابھی تو ہر گزرتا ہل اسے تیز کر رہا ہے، بھڑکا رہا ہے۔ میں نے مقابلے کے امتحان میں پوزیشن لی تھی

اور بہت جلد ریڈنگ کیلئے جانے والا تھا۔ اماں بہت ہی خوش تھیں اور شاید خوش تو میں بھی تھا۔ لیکن یہ خوشی انجانے ملال میں بھگی ہوئی تھی۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے بازار سے مٹھائی کا ڈیہ خرید اور ماموں کے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ چونکا تو میں اس وقت جب میں بڑے سے سرکے گیٹ کے سامنے کھرا ہوا تھا۔

”ارے تو کیا میں عالم بے خودی میں یہاں تک آ گیا تھا یا پھر لاشعور میں موجود کسی خواہش نے یہاں تک میری رہنمائی کی تھی“۔۔۔ لہجہ بھر کیلئے میں حیرت زدہ سا کھڑا رہا۔ پھر نوکر کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم تک آ گیا۔ آج ماموں نے مجھے گلے لگا لیا اور مبارکباد دی تھی۔ ممانی کی پیشانی پر موجود رہنے والی شکلیں بھی غائب تھیں اور انہوں نے مجھے دس کیا تھا۔ نوکر کو ٹھنڈا لانے کا کہہ کر وہ بیٹھ گئی تھیں اور اماں کی صحت کا پوچھنے لگی تھیں۔ میری نگاہوں نے چاروں طرف۔ اسے کھوجا تھا۔

اور جب کوک بی کر میں جانے کیلئے اٹھنے لگا تو میرے اندر مایوسی کی دھند پھیلی جارہی تھی۔ شاید میں آج اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی کامیابی کی خبر سنا کر اس کے چہرے کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ یقیناً کچھ عرصہ بعد میں تیری دامن



ابھی تارے چمک رہے تھے۔  
 "ذو سبب میں۔۔۔۔۔" اس نے نچلے ہونٹ کو  
 دانتوں میں دبایا اور مسکرائی۔  
 اندرون کی تیل ہو رہی تھی اور میں سوالیہ نظروں  
 سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 "میں۔۔۔۔۔"  
 "سویرا بیٹے فون ہے تمہارا۔"

پوچھا اور پھر کوئی جواب نہ پا کر پانی کے چھینٹے  
 ڈالنے لگا اور کبھی کبھی جب اس آگ کی تپش بڑھ  
 جاتی، میں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتا اور اس آگ کو  
 بجھانے کے جتن کرنے لگتا۔ ایسے میں نالکہ بہت  
 حیران ہوتی۔

"پتہ نہیں تمہیں کبھی کیا ہو جاتا ہے  
 ذو سبب، بیٹھے بیٹھے تمہاری آنکھوں سے آگ سی  
 نکلتی ہے۔"

"یوں ہی تھک جاتا ہوں۔"  
 "تھکتے نہیں ہو اجنبی بھی کتنے لگتے ہو۔"  
 وہ شکوہ کرتی۔ ہاں شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کیونکہ  
 میں نہیں چاہتا تھا کہ اس آگ کے شعلے نالکہ تک  
 پہنچیں اور میرا گھر برباد ہو، اس لئے میں اسے ٹال  
 دیتا۔

"تمہارا وہم ہے نالکہ۔"

میں اسے کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ ایک دلکش  
 سراسیمہ والی لڑکی جو میری ناموس زار ہوتی  
 تھی۔ تھوڑی دیر کیلئے مجھے تم سے اجنبی بنا دیتی  
 ہے۔ وہ جس سے ٹریننگ پر جانے کے بعد میں پھر  
 کبھی نہیں ملا۔ وہ جسے دیکھ کر اسے پانے کی خواہش  
 میرے اندر نہیں مچلی تھی۔ بلکہ اس کے جگر کی آگ  
 بھڑک اٹھی تھی۔ ایک لمحے کیلئے بھی اس کو حاصل  
 کرنے کی خواہش میرے اندر پیدا نہیں ہوتی تھی۔

ماموں نے ڈانگ روم کے دروازے سے باہر  
 جھانکتے ہوئے پکارا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر اندر  
 چلی گئی۔ میں عجیب سی تشنگی کا احساس لئے گھر چلا  
 آیا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ شاید یہ کہ میں تم  
 سے محبت کرتی ہوں یا پھر یہ کہ میں نے تمہاری  
 کامیابی کی خبر اخبار میں دیکھی تھی یا یہ کہ میں بھی  
 تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ پتہ نہ ہو سے ملنے یا کوئی اور  
 بات۔

میں خود ہی سوچتا اور خود ہی رد کر دیتا۔ لیکن  
 جب تک میں لاہور میں رہا غیر ارادی طور پر اس کا  
 منتظر رہا کہ شاید وہ آئے۔ مسکراتی ہوئی، ہنستی ہوئی  
 آتے ہی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال  
 دے۔ انہیں مبارکباد دے۔ شرارت سے میری  
 طرف دیکھے اور میں اماں کی نظر بچا کر چپکے سے اس  
 سے پوچھ لوں۔

"اجی بڑے ہو کر کیا بنو گی؟"  
 وہ شرمناک سر ہنکا لے اور میں ہنکھڑا کر غصے  
 پڑوں، ہنستا ہوں۔ اتنا کہ میرے چاروں طرف  
 پھولوں کے باغ کھل اٹھیں، لیکن وہ نہ آنی اور جب  
 میں ٹرین میں بیٹھ رہا تو میرے اندر آنسوؤں کی  
 برسات ہو رہی تھی۔ مگر پتہ نہیں کیا بات تھی کہ یہ آنسو  
 آگ بجھانے کی بجائے اسے تیز کر رہے تھے اور  
 آنسوؤں کی برکھا مزید آگ لگا رہی تھی۔

میں ابھی اکیڈمی میں ہی تھا اور میری ٹریننگ ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اماں کا خط آیا۔

"سوریا کی شادی ہوگئی ہے اور وہ اپنے میاں کے ساتھ امریکہ چلی گئی ہے۔ بھائی صاحب نے مجھے بلایا تھا مگر میں نہ جاسکی، کیونکہ میری طبیعت خراب تھی۔"

میں جانتا تھا کہ ان کی طبیعت کیوں خراب ہوئی ہوگی۔ لیکن اماں نے خط میں کسی دکھ کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی مزید کوئی بات سوریا کے حوالے سے لکھی تھی۔ بس اطلاع دی تھی اور اس اطلاع نے جیسے

میرے دل میں تیر چھوڑا تھا۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں میں کئی دن تک بکھرا بکھرا رہا۔ جیسے کوئی بہت عزیز، ہستی بچھڑ گئی ہو۔ جیسے کوئی قیمتی ستارہ

کسی نے چھین لی ہو اور جو اماںوں جان تھوڑا انتظار کر لیتے تو شاید میں ان کی بیٹی کو اچھے مستقبل کی توبہ دے سکتا۔ اتنی آسائشیں نہ بھی مگر ایک اچھا گھر لے سکتا

لیکن یہ تو ازل سے لکھا گیا تھا۔ یہ بجز توبہ و مقدر تھا۔ سو میں نے اماں کی اس اطلاع پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور

نالکہ سے مل کر اس کی دلچسپ باتوں میں کھوکھو کر چا پا کہ وہ آگ کم ہو جائے، بجھ جائے، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ نالکہ دہن بن کر میرے گھر آ گئی۔ میرے تین

بچوں کی ماں بن گئی اور میرے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی۔ مگر یہ آگ ایسی ہی تھی، یوں ہی بھڑکنی ہوئی، جلاتی ہوئی۔ کبھی کسی میرا بیٹی سوریا کو

دیکھتا اور سوچتا، پتہ نہیں وہ کہاں ہوگی اور کبھی اس نے میرے بارے میں سوچا ہوگا۔ کبھی اسے خیال آتا ہوگا کہ کبھی بچپن میں وہ میری دہن بننا چاہتی تھی اور پھر

میرے اندر جلتی آگ کی تپش بڑھ جاتی۔ پتہ نہیں کیوں ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے اندر یہ خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی کہ کبھی تو وہ بھی مجھے

سوچے۔ کاش میں کبھی جان پاتا کہ

وہ۔۔۔۔۔ اس نے بھی میرے بارے میں سوچا ہے۔ اس روز میں اپنی بیٹی سوریا کے ضد کرنے پر اس

کے ساتھ شاہنگ کیلئے آیا تھا۔ سوریا میری بیٹی بڑی ہی ضدی تھی۔ حالانکہ میں بہت تھکا ہوا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی کھیلی کی ساگرہ کیلئے گفت خریدنا

چاہتی تھی اور نالکہ مگر نہ تھی اور جب گفت پیک کر دیا کے مڑا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ دھڑ دھڑ میرے اندر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہی آگ!

ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ "سوریا تم؟"

"ذوہیب آپ کیسے ہیں؟" چند لمحوں بعد اس کے یوں سے نکلا۔ "فائن" میں نے مسکرائے کی کوشش کی۔

"تم کیسی ہو؟" "فائن"

"پاپا" سوریا میری بیٹی نے مجھے پکارا اور پھر مجھے کسی کی طرف متوجہ دیکھ کر خود ایک شوٹیں پر جھک گئی۔

"یہ میری بیٹی ہے سوریا۔" میں نے مڑ کر سوریا کی طرف دیکھا جواب سیز من سے کچھ دکھانے کو کہہ رہی تھی۔

"اور وہ میرا بیٹا ہے ذوہیب۔" اس نے اپنے پیچھے کھڑے دبلے پتلے بے سے لڑکے کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس کی پلکیں جھک گئیں ہلڑنے لگیں، کئی لمحے گزر گئے۔ شاید

ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک لفظ میں ہم نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ میں نے بھی اور اس نے بھی کئی سالوں کی داستان سنا دی تھی۔

"تم نے۔۔۔۔۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ

## غزل

ظفر محمد خان ظفر

عروس صبح وطن کا سنگھار بن کے رہو  
گلے گلے میں تمہیت کا ہار بن کے رہو  
ربخ حیات کے آئینہ دار بن کے رہو  
شم اپنے دور کا اک شاہکار بن کے رہو  
یقین بن کے رہو، اعتبار بن کے رہو  
نظر نظر میں برنگ بہار بن کے رہو  
عراق، شام، سعودی عرب، یمن، ایران  
رہو جہاں بھی وطن کا وقار بن کے رہو  
مُعاشرے میں ہمارے ہیں خامیاں بھی مگر  
شم اس کی شان کے آئینہ دار بن کے رہو  
دل و نگاہ میں آشفہ حال دُنیا کے  
سرور بن کے رہو شم حُمار بن کے رہو  
قدم قدم پہ حوادث کی حکمرانی ہے  
قدم قدم پہ خود اپنا ہِصار بن کے رہو  
چلو تو ایسے سبک رو کہ جیسے نور کی موج  
رُکو تو اَرْض پہ شم کو ہِسا بن کے رہو  
غُور کرلو فرِزِ فلک بھی چاہے شم  
زمین پر اپنی مگر خاکسار بن کے رہو  
یہ کیا! کہ راز رہو شم صدف کے سینے میں  
جو ہو غم تو دُر شاہوار بن کے رہو  
ظفر کی آنکھ کے گلدستے میں شگفتہ! شم  
تمام عمر گلِ نو بہار بن کے رہو

بتایا تھا کہ تم۔۔۔۔۔ تم بھی۔۔۔۔۔؟  
میں نے ایک گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔  
”موقع ہی نہیں ملا، کئی بار میں نے چاہا  
مگر۔۔۔۔۔“

”اور میں سمجھتا رہا کہ تم بھی ماموں جان کی  
طرح دولت کو سب کچھ بھتی ہو۔“  
”آپ نے بھی تو بھی کچھ نہیں کہا تھا  
ذوہیب۔“

”میں تو کبھی اس خوف سے کچھ نہ کہہ سکا کہ  
ہمارے درمیان ایشیاس کا فرق تھا۔ اتنا زیادہ کہ منایا  
نہیں جاسکتا تھا۔“  
”اور میں۔۔۔۔۔“

اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔ اس کی  
آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پھر وہ ایک دم مڑی۔  
”خدا حافظ ذوہیب۔ باہر گاڑی میں فیصل  
انتظار کر رہے ہوں گے۔ آپ آئیے کسی دن۔ ہم  
ادھر می کے گھر میں ہی ہیں۔“  
میں نے اپنے حلق میں اٹکے ہوئے آنسوؤں کو  
نیچے اتار لیا اور اپنی بیٹی سو را کو آواز دی۔

”بھئی اب چلو بھی۔ کیا ابھی مزید شاپنگ باقی  
ہے؟“

وہ پلٹ سنبھلتے ہوئے میرے پیچھے لگی اور  
اسٹیرنگ گھماتے ہوئے اچانک مجھے لگا، جیسے  
میرے پورے وجود میں ایک خنکی کی لہر دوڑ رہی  
ہو۔ عجیب سی ٹھنڈک رگ و پے میں دوڑنے لگی  
تھی۔ وہ آگ جو برسوں سے مجھے جلائے جارہی  
تھی، ایک دم ہی بجڑ کر بجھ گئی تھی۔ میں بے اختیار  
ہنس دیا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ میرے اندر خنکی اور سکون  
و طمانیت اتر رہی تھی اور میری بیٹی سو را حیرت سے  
مجھے دیکھ رہی تھی۔

# پپی نیو ایر...

بعض دفعہ قسمت آپ کے ساتھ بڑا دلفریب کھیل کھیل جاتی ہے..... ردا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا.....!





سہیل پلیز آپ ایک بار میری بات غور سے  
سن تو لیں۔

سمیل نے گہری سانس لیتے ہوئے جیب سے والٹ نکالا، پانچ ہزار روپے نکالتے ہوئے روا کی طرف بڑھائے،

اچھا سنو اب یہ تو بتا دو کس چیز کے فارم  
ہیں۔؟ کیا کرنا ہے۔؟۔ کہاں سے لینے ہیں۔  
۔۔۔۔۔؟۔۔

ردا کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا،

وہی تو، اتنی دیر سے بتا رہی ہوں اور آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں، وہ بحریہ ٹاؤن میں پلاسٹک کے فارم ہیں، آج فارم حاصل کرنے کی آخری تاریخ ہے، فارم کی قیمت پانچ سو ہے، سنا ہے چند دنوں میں ہی ان کی قیمت دس سے بیس ہزار تک ہو جائے گی، آپ خود سوچیں دس فارم پانچ ہزار کے لوں، اور اگر دس ہزار فی فارم سیل کروں تو ایک لاکھ، بیس ہزار کے حساب سے ہو تو دولاکھ، ہو گئے نا ہمارے تو مزے۔۔۔ روا کا چہرہ جوش سے غمگین رہا تھا،

سہیل کو بے اختیار داپر پیارا گیا،

اچھا ٹھک ہے اگر ایسا ہو گیا تو سارے پیسے تمہارے، لیکن اگر ایسا کچھ ناہو تو تم مجھے میرے پانچ ہزار لوٹا دینا، سہیل نے تھوڑا شرارتی لہجے میں کہا تو رد الیک دم ہنس پڑی،

او کے منظور ہے، لیکن آپ اچھا بھی تو سوچ سکتے ہیں نا، دعا کیجیے ایسا ہو جائے، میں خوب شایگ کروں گی، نیا سال شروع ہونے والا ہے اپنی فریڈم کی دعوت بھی کروں گی، روانے بچوں کی سی مصروفیت سے کہا تو سہیل پوری جان سے فریڈم ہو گیا۔

ردا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس کرتے ہوئے پیار سے بولا،

ٹھیک ہے جانم، اللہ ایسا ہی کرے، تب تم نئے

ردائے دو تین بار پکارنے پر بھی جب کوئی ردِ عمل نہ دیکھا تو روہائی آواز میں سمیل کو پکارا جو مسلسل اپنے لپ ٹاپ میں سر دیئے اللہ جانے کون سی گتھاں سلجھا رہے تھے۔

ہاں ہاں میں سن رہا ہوں، سہیل نے ہنوز مصروف انداز میں کہا تو اب ردا کو غصہ آگیا، ہاتھ بڑھا کر لپ ٹاپ بند کرنا چاہا تو سہیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، یار کیا کرتی ہو، آفس کا کام کر رہا ہوں، ابھی تم نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دینا تھا۔۔۔ کہو کیا بات ہے۔؟ آنکھوں سے چشمہ اتار کر سایڈ پر رکھتے ہوئے سہیل نے پوچھا۔

تب روا بڑے جوش میں بولی،

وہ نامرہ بھابی (جیٹھائی) پورے چھ فارم لائی  
ہیں پانچ پانچ سو والے، سب کہہ رہے ہیں ایک دو  
دن میں ان کی قیمت دس سے بیس ہزار تک ہو  
جائے گی، مجھے بھی دیں آپ پانچ ہزار وہ چھ لائی  
ہیں میں دس لاکھ کی۔

آہ۔ سہیل کراہ کر رہ گیا، یہ خواتین کی مقابلہ بازی، ہمارا دیوالیہ کر دیتی ہے، بیگم مجھے یہ بتاؤ بھابی نے تو قسم کھائی ہے، جیل بھائی کا پیسہ دنوں ہاتھوں سے اڑانے کی، یا تم تو عقل کرو کچھ، نکتہ محنت سے پیسہ کمایا جاتا ہے۔؟ کچھ اندازہ رہے نہیں،

کیا ہے سہیل، میں کون سا کوئی ضائع کرنے کو کہہ رہی ہوں۔؟۔۔۔ آپ بھی ٹائیس، جمیل بھائی اچھے ہیں بنا چوں چرا کیئے بھائی کو پمپے پکڑا دیتے ہیں، ایک آپ ہیں، دس بار مانگنے پر دیتے ہیں وہ ہزار نعمتوں کے ساتھ،

اب روانے باقاعدہ منہ پھلا لیا تھا،

سال کی خوشی میں ڈھیر سی شاپنگ کرنا میں بالکل منع نہیں کروں گا،

سمیل نے ردا پر چمکتے ہوئے کہا تو ردا نے شرما کر خود کو سمیل کے سپرد کر دیا،

☆.....☆

سمیل اور جمیل دونوں بھائی اس بڑے سے بچے میں رہائش پذیر تھے جو ان کے والد دونوں بھائیوں کے لیے ترکے میں چھوڑ گئے تھے، دونوں بھائی امپورٹ، ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے، اللہ کا کرم تھا جس نے ان کے کاروبار میں برکت ڈال رکھی تھی، جمیل اور نمرہ کے تین بچے تھے سب سے بڑی اقصیٰ جس نے اسی سال کالج جو ان کیا تھا، پھر شاہ زیب اور شاد جو بالترتیب ساتویں اور اٹھویں کے طالب علم تھے، جبکہ سمیل اور ردا کے دو بچے مونا اور موحّد شاہ زیب اور شاہ دیز کے کلاس فیلو تھے،

جہاں دونوں بھائیوں میں بہت پیار تھا وہیں بچے بھی ایک جان دو قالب کی مثال پر پورا اترتے تھے، مل کر کھانا پینا، بننا بولنا، کوئی تفرقہ نہیں تھا، اور ایسا دونوں کی ماؤں کی اپنی محبت اور تعلق تھا جو ایک جیٹھانی دیورانی سے زیادہ بہنوں کی مانند رہتی تھیں، نمرہ کے بھائی صفدر کا ایک دوست احسن پراپنی کا کام کرتا تھا جو بحریہ ٹاؤن کے پلاسٹک کی خرید و فروخت سے مکمل واقفیت بھی رکھتا تھا، اس نے کہیں صفدر سے ذکر کر دیا کہ آج کل بحریہ ٹاؤن میں پلاسٹک کے فارم سیل ہو رہے ہیں جن کی قیمت پانچ سو ہے لیکن آخری تاریخ کے دوسرے دن سے ان کی قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، اس لیے لوگ دھڑا دھڑا خرید رہے ہیں، صفدر نے تو بہن سے سرسری سا ذکر کیا تھا لیکن نمرہ کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جن کا دماغ ایک بات پراڑ جائے تو بس اڑ

جائے، اس نے بھائی سے کہا۔

صفدر یہ رکھو تین ہزار مجھے بھی چھ فارم لا دو۔

صفدر: ارے آپا کوئی بھروسہ تھوڑی ہے، سب جھوٹ ہوتا ہے، ایسا کچھ نہیں ہونے والا آپ نے یہ تین ہزار ضائع ہی کرنے ہیں، چلو ٹھیک ہے ضائع ہی کبھی، تمہارا تو کوئی نقصان نہیں ہو رہا نا۔ نمرہ نے لا پرواہی سے کہا تو صفدر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

آپا یا قسم سے یہ لمبی لائن میں لگنا پڑے گا، آپ کو پیسہ میں ایسی خرافات میں نہیں پڑتا، صفدر بچا رگی سے بولا تو نمرہ نے لاڈ سے کہا، لو اپنی اپا کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟۔ جاؤ میں نہیں بولتی، اچھا آپا کیا یاد کریں گی لاڈوں کا کل، ابھی دو دن ہیں مل جائیں گے آپ کو، لیکن یاد رکھیے گا آپ یہ پیسے ضائع کر رہی ہیں، اتنے ہی فالٹو ہیں تو مجھے دے دیں، صفدر نے نمرہ کا موڈ خوشگوار کرنے کو کہا تو نمرہ مسکرا دی۔

میں صدقے اپنے بھائی کے، پیسے تم سے اچھے ہیں کیا، صفدر بھی خوش دلی سے ہنس دیا، یوں صفدر نے اپنی آپا کو چھ فارم لا دیے اور واپس اپنے شہر لوٹ گیا کہ وہ چند دن کے لیے آفس کے کام سے کراچی آیا تھا تو اپنی آپا کے پاس ہی شہر تھا.....

اب باری تھی ردا کی کہ وہ بھی یہ فارم جلد از جلد خرید ڈالے، آج آخری تاریخ تھی فارم حاصل کرنے کی اور ردا بے چین ہوئی جا رہی تھی، اس نے مکمل چھان بین کروائی کہاں سے مل رہے؟۔ کب تک مل رہے وغیرہ وغیرہ، کہ ایسے کسی کام میں یہ امید رکھنا کہ سہی سمیل اس کی ہیلپ کریں گے عبت تھا، سمیل پیسے دے کر بری الذمہ ہو گئے اور دی گئی رقم پراپنی طرف سے فاتحہ بھی پڑھ ڈالی،

بعد دونوں کا جوش کافی حد تک ختم ہو چکا تھا،  
نمرہ نے صفدر سے کال پر رابطہ کیا تو کہا تھا،  
صفدر مجھے کہیں سے پتا کر کے بناؤ فارمز کا کیا  
کرنا ہے۔؟۔۔۔  
صفدر نے کہا،

آپا میں بہت بڑی ہوں، جیسے ہی ٹائم ملتا ہے  
احسن سے رابطہ کر کے آکو بتاتا ہوں، وہ کراچی کے  
فارمز ہیں یہاں لاہور میں تو کسی سے نہیں پوچھ سکتا

تا میں  ٹھیک ہے، نمرہ نے ششدری سانس لے کر  
کال بند کر دی،

صفدر بھی بھول گیا شاید اس نے بھی کال نہ کی،  
اور روا، نمرہ نے بھی سوچ لیا کہ شاید فراڈ ہی تھا، لیکن  
اس موضوع پر سہیل یا جمیل سے بات کرنے کا  
مطلب اپنی عزت افزائی کروانا ہوتا، سو دونوں چپکی  
بیٹھ رہیں اور اپنے روٹین کے کاموں میں مگن  
ہو گئیں،

سمیل عینک لگائے ڈھیر سی فائلز ارد گرد  
بکھرائے لیپ ٹاپ پر بڑی تندہی سے اپنے آفس  
کا کام کر رہا تھا کہ آج اتنی دسبر تھا خوش نشینی سے  
سمیل کے آفس میں ہفتے کو چھٹی ہوتی تھی، کام  
زیادہ ہونے کی وجہ سے سہیل کافی کام گھر اٹھالایا تھا  
کہ ہفتے والے دن بیٹھ کر ضروری کام پنپالایا جائے  
پھر یکم جنوری کیونکہ اتوار کی تھی تو اس دن بچوں کے  
ساتھ نیوا ایر بھر پورا نچوانے کرنے کا ارادہ تھا، جمیل  
بھائی بیوی بچوں کے ساتھ سرال گئے ہوئے تھے  
کہ وہاں نیوا ایر نائٹ تھی، مونا اور موحد بھی تایا تائی  
اور کرنز کے ساتھ ہی چلے گئے تھے کہ شاہ ویز نے  
بہت اصرار کیا تھا انہیں ساتھ لے جانے پر،  
دو پہر کوئی دو بجے کا وقت تھا جب گھر کے

شام پانچ بجے تک لمبی لائن میں لگ کر، پسینے  
سے شرابور ہوتے، پیاس سے غڑھال ردا آخر کا  
فارم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی،  
کہ یہ کام خود اسے ہی انجام دینا تھا، اور وہ یہ  
دیکھ کر حیران تھی کہ فارم حاصل کرنے والوں کی  
طویل قطاریں تھیں، ایک طرف لیڈیز اور ایک  
طرف جینٹس۔۔۔ لگتا تھا کوئی فری میں کچھ بانٹ  
رہا جو سب حاصل کرنا چاہ رہے،

قصہ المختصر ردا جھکن سے نڈھال لیکن بڑے  
خوشگوار موڈ میں گھر پہنچی اتنی تھکاوٹ میں بھی کہیں  
یہ احساس اسے خوش کر رہا تھا کہ نمرہ بھابی نے  
صرف چھ فارم لیے اور اس نے دس فارم لے لیے،  
گھر آکر بڑے تفاخر سے بھابی کو اپنا کارنامہ دکھایا  
تو بھابی نے مسکرا کر کہا  
چلو جی دیکھتے ہیں اب ہم دونوں کی رقم ڈھنسی  
ہے یا ڈھیل ہو جاتی ہے،

ہائے اللہ بھابی ٹھہر ٹھہر بولیں، اتنی مشکل  
سے تو سہیل نے پیسے دیئے ہیں، اب اگر یہ ڈوب  
گئے تو وہ کبھی میری ایسی کسی بات پر یقین نہیں کرنے  
والے، ردا منہ لٹکا کر بولی، تو نمرہ بھابی ہنس دیں،  
ردا، اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے  
کاموں میں، چلو دعا کرتے ہیں کہ ہم بھی انے  
شوہروں پر یہ دھاک بٹھا سکیں کہ ہمارے کیئے گئے  
فیصلے بھی پائیدار اور منافعت سے بھرپور ہوتے ہیں  
، دونوں دیورانی، جیٹھانی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس  
پڑیں،

☆.....☆

ایک ہفتہ گزر گیا، فارمز کے بارے میں کہیں  
سے کوئی خبر نہ ملی، اور دونوں کے فارم الماری کی  
زینت بنے ان کا منہ بڑا تاتے رہے، اور مزید دو دن

عامر نے بتایا اور ساتھ کب افسوس مل رہے تھے کہ کاش کوئی انہیں بھی بتا دیتا تو آج ہماری بھی لاٹری نکل آتی، تب میں نے بتایا کہ میری دوست نے بھی لیے ہیں، تو کہتے کال کر کے پوچھوان کے فارمز سیل ہوئے۔؟۔۔

سیمانے رساں سے ساری بات ردا کے گوش گزار کی تو ردا کے تو مارے خوشی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے،

سچ کہو سیمانے مجھے یقین نہیں آ رہا، مجھے تو پتہ ہی نہیں یار، ایک منٹ رکو میں تمہارے بھائی کو بتاتی ہوں، ردا نے یہ کہہ کر کال کالی اور جوش سے سہیل کی طرف بڑھی، ان کا شانہ ہلاتے ہوئے بڑے جوش میں بولی،

سہیل آپ کو پتہ میرا خریدا گیا پانچ سو والا فارم بیس ہزار میں بک رہا ہے۔۔۔

خوشی سے تھمتاتے چہرے کو سہیل نے خشکیں نگاہوں سے دیکھا اور دوبارہ سے لیپ ٹاپ پر نظریں جمادیں،

ردا کو سخت غصہ آیا،

سنیں نا۔۔۔

میں آپ کو کچھ بتا رہی ہوں۔

دیکھو یار ردا، یہ بنگلانہ باتیں نا کرو، میرا بہت سا کام پینڈنگ ہے مجھے کر لینے دو،

میں سچ کہہ رہی ہوں سہیل، آپ میری بات تو سنیں، ابھی بات ردا کے منہ میں ہی تھی کہ اس کے سیل پر سیمانے کی لائٹ آن ہو گئی، اس نے جھپٹ کر فون اٹھایا ابھی کان کو لگایا ہی تھا کہ سیمانے کی لرزنی آواز سنائی دی،

ردا تم نے بتایا بھائی کو،۔؟۔۔ فارم کی قیمت پچیس ہزار سے تیس ہزار ہو گئی ہے۔۔۔۔

کاموں سے فراغت پا کر ردا سخت بور ہو رہی تھی کہ سہیل جب کام میں لگے ہوں تو انہیں ڈسٹرب کرنا بہت رکھی ہوتا تھا،

تب ہی ردا کا موبائل بج اٹھا،

ردا نے بے دلی سے اٹھا کر دیکھا تو ایک دم خوش ہو گئی اس کی بیسٹ فرینڈ سیمانے کی کال تھی،

ہیلو، السلام علیکم، کیسی ہو ردا۔؟۔

وعلیکم السلام، ٹھیک ہوں یار، سخت بور ہو رہی تھی، اچھا ردا تم نے کال کر لی۔ ردا نے چہکتے ہوئے کہا،

تو سیمانے بولی، سنو تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے بحریہ ناؤں کے فارمز خریدے تھے کچھ۔؟۔

ہاں، خریدا ہے تھے سیمانے، لیکن یار پیسے ضائع گئے، ردا نے سیمانے کو کہتے کہتے کن اکھپوں سے سہیل کو دیکھا، پھر سکون کی سانس لی کہ وہ مکمل اپنے کام میں لگے تھے،

ارے یار وہی تو تمہیں بتاتا ہے، تمہارے پیسے ضائع نہیں گئے، سمجھو تمہاری تو لاٹری لگ گئی یار، سیمانے کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔۔

ردا کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے، ساتھ ہی ردا خود بھی بے اختیار کھڑی ہو گئی،

سچ کہو سیمانے؟۔۔۔ تمہیں کیسے پتا۔۔۔؟۔ کیا واقعی میرے خریدے گئے فارم ضائع نہیں گئے۔؟۔ ردا ایک نئی سانس میں سوال کرتی گئی۔

دھیر رج رکھو یار میں تمہیں بتاتی ہوں، ابھی تمہارے بھائی اپنے دوست سے کال پر بات کر رہے تھے تو بہت ایکسائٹڈ تھے، ان کے کسی دوست نے بھی یہ فارمز لیے تھے، پانچ فارم تھے جو پانچ پانچ سو کے لیے تھے، ابھی ابھی وہ فارمز بیس بیس ہزار میں بک گئے۔ بہت خوش تھا ان کا دوست



کیا،؟۔ روا زوردار آواز میں چیخی تو سہیل نے ناگواری سے اُسے دیکھا اور لپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئے،

ردا کال آف کرتے ہوئے دوبارہ ہمت بجاتے ہوئے سہیل سے پیار بھرے لہجے میں بولی، پلیز سہیل آپ ایک بار سیما کے سہیل عامر سے بات کر کے گنہگار کر لیں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔

جب ہی سہیل کا موبائل بج اٹھا۔۔۔ سہیل نے ایک نظر ردا کو دیکھتے ہوئے موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔۔۔

ہیلو، ہاں جی ٹھیک ہوں الطاف بھائی، آپ کیسے کیسے یاد کیا۔؟۔ دوسری طرف کی بات سن کر سہیل نے قدرے چوکتے ہوئے ردا کو دیکھا پھر بڑے بے یقینی انداز میں گویا ہوئے۔

ارے کیوں مذاق کر رہے الطاف بھائی۔۔۔ ارے میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، تم ابھی کے ابھی اپنے فارم لے کر اتحاد اسٹیٹ ایجنسی پہنچو، ریٹ بڑھتے جا رہے ہیں، سہیل نے کال آف کر کے چشمہ اتار کر کمیشن کے دامن سے صاف کیا، اور سر پر نکاتے ہوئے گہری نظروں سے ردا کو دیکھتے ہوئے بڑے پراسرار انداز میں بولے،

ردا اگر سچ میں ایسا ہے تو ہماری تو سمجھو لائری لگ گئی، ان کی آواز بڑبڑاہٹ سے مشابہت تھی، مطلب۔؟۔ ردا الجھ کر بولی،

مطلب یہ کہ میرا دوست ہے الطاف، اس کا آج کل کسی بروکر کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، اس سے گپ شپ ہوئی تھی تو میں نے ذکر کر دیا تھا

تمہارے پاگل پن کا کہ میری بیوی بھی مالا مال ہونے کے خواب دیکھتی ہے، فارم لے لیے ہیں کہ دو گنی قیمت پر بک جائیں گے، اس وقت بات آئی گئی ہو گئی، ابھی اس کا فون تھا کہ ان فارم کی قیمت کافی زیادہ بڑھ گئی ہے۔۔۔ سہیل نے تفصیل سے بتایا تو ردا جیسے خوشی سے اُچھل ہی تو پڑی، دیکھا، میں بھی تو آپ سے اتنی دیر سے یہی کہہ رہی ہوں، پر آپ میری بات سنتے ہی کہاں ہیں۔؟۔

سہیل نے چشمہ اتار کر سائیڈ پر رکھا، لپ ٹاپ آف کیا، اٹھ کر ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا، ہاتھوں سے بال ستواتے ہوئے بولا، لاؤ دکھاؤ کہاں ہیں فارمز، آج تمہاری بھی من ہی لیتا ہوں،

ردا نے خوش خوشی الماری کھولی اس میں سے فارمز برآمد کئے اور سہیل کو تھما دیے، یہ لیں پکڑیں، دس تھے آٹھ رہ گئے ہیں، اور ایک دو دن گزرتے تو میں نے کچرے میں ڈال دیئے تھے، ردا نے ہنستے ہوئے کہا تو سہیل نے اچنبھے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا، کیوں، آٹھ کیسے رہ گئے۔؟۔ 2 کہاں گئے۔؟۔

وہ مجھے لگا کہ میں نے کہیں سچ میں پیسے ضائع نہ کر دیئے ہوں تو اپنی ایک جاننے والی کو دو سچ دیئے تھے ہزار کے دو تھے میں نے پندرہ سو میں دے دیئے تھے، ردا نے جھپٹتے ہوئے کہا تو سہیل بس اُسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا،

میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔؟۔ ردا نے لاؤ سے سہیل کے کاندھے پر ہاتھ دھرا تو سہیل نے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا،

کا موڈ تھا کہ سہیل کی پسند کے مطابق قیمر مڑا اور  
چکن پلاؤ بنا ڈالے، وہ مگن سی گنگنائے ہوئے کام  
میں مصروف ہو گئی،

☆.....☆

سہیل اتحاد اسٹیٹ ایجنسی پہنچا تو وہاں رونق  
میلہ لگا ہوا تھا، الطاف بہت سے لوگوں میں گھرا ہوا  
تھا، ساتھ اس کا بروکر دوست اور بہت سے اسٹیٹ  
ایجنسیوں والے بیٹھے تھے، عجب گہما گہمی کا عالم تھا،  
الطاف، سہیل کو دیکھتے ہی اس کی جانب بڑھا،  
ہاں یار لے آئے فارم؟۔۔۔ چھوٹے ہی  
الطاف نے پوچھا تو سہیل نے جیب سے فارم نکال  
کر دکھائے،

الطاف نے اسے سائیڈ میں لے جاتے  
ہوئے کہا،

یار دس ہزار سے بولی شروع ہوتی تھی، بیس تک  
پہنچی اور اب دیکھتے ہی دیکھتے ایک فارم کی قیمت  
ایک لاکھ روپے ہو گئی ہے، یقین مانو میں بہت بچھتا  
رہا ہوں، کاش میں نے بھی چند ایک تو لے لیے  
ہوتے۔

الطاف نے کھف انسوس ملتے ہوئے کہا تو  
سہیل کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا،  
کیا؟۔۔۔ ایک لاکھ؟۔۔۔

اس نے بے یقینی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے  
فارمز کو دیکھا اور ایک نظر الطاف کو، ایک لمحے کو اسے  
الطاف کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔۔۔

تب ہی الطاف نے اس کے ہاتھ سے فارمز  
لے کر گنتے ہوئے کہا،

ارے یار آٹھ؟۔۔۔

تمہاری توجہ میں لائری لگ گئی میرے دوست  
!.....

جان سن ابھی تو مجھے بھی نہیں پتا کہ جانا کہاں  
ہے، ایک اسٹیٹ ایجنسی پر الطاف نے بلایا ہے،  
پتہ نہیں وہاں سے کہاں جانا ہے، تمہیں کہاں لیے  
لیے گھوموں گا۔۔۔؟۔۔۔

اچھا ٹھیک ہے میں تب تک کچھ زبردست سا  
کھانے کو بناتی ہوں، ردا نے فوراً بات مانتے  
ہوئے کہا تو سہیل اوکے کہتا گیٹ کی جانب چل دیا

☆.....☆

سہیل کے جاتے ہی ردا سر خوشی کے عالم میں  
گنگنائے لگی،

ایسا لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں  
آج اتنی خوشی ملی ہے

ردا راج میں بہت خوش تھی کہ اسے نام صرف  
سہیل کے سامنے سرخ رو ہونے کا موقع مل رہا تھا  
بلکہ اس کا نیو ایر شاہنگ کا پلان بھی پایہ تکمیل کو پہنچنے  
والا تھا کہ انہی فارمز کی وجہ سے اس کی ہمت تازہ  
تھی کہ سہیل سے ایسا کوئی تقاضا کر پاتی،

اس نے بیڈروم سیٹ کرنا شروع کیا، بیڈ سے  
لیپ ٹاپ اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا، چادر جھاڑ کر

دوبارہ بچھائی، ٹکیے سیٹ کیے، ڈریسنگ ٹیبل کی  
ڈسٹنگ کرتے ہوئے تمام سامان نئے سرے سے

سیٹ کیا، فالتو کپڑے اٹھا کر پیگ کیے، بکھری  
بکھری ساری چیزیں اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر ایک

طائرانہ نگاہ بیڈروم پر ڈالی تو اسے اپنا بیڈروم بہت  
پیارا لگا، پردے برابر کر کے دروازہ بند کر لی ہوئی

چکن کی سمت بڑھ گئی،

فریق سے قیمر نکال کر میٹ ہونے کے لیے  
رکھا اور مڑ چھینے کے لیے برتن میں نکالے، ساتھ

ہی چاول پر ات میں نکال کر خننے کے لیے رکھے اور  
چکن کا ایک پیکٹ بھی نکال کر سنک میں رکھ دیا، اس

اکبر نے جھٹ سے فارمز اپنے قبضے میں کیئے اور چیک لکھ کر الطاف کی طرف بڑھا دیا، الطاف نے وہ چیک سہیل کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ جیسے ایک دم گہری نیند سے جاگا ہو، بغور چیک کو دیکھا، اکبر اور الطاف کو دیکھا، اس کے چہرے سے ابھی تک بے یقینی مترشح تھی،

پورے آٹھ لاکھ۔۔۔  
سہیل نے تعجب سے الطاف کو دیکھا،  
ابھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ ایک بندہ ان کی طرف بڑھا،  
ایکسکوزی سر۔۔۔  
جی۔۔۔؟۔۔۔ الطاف نے بغور اس بندے کو

دیکھا۔۔۔  
الطاف اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اسے کھڑے ہونے کا اشارہ کرنے لگا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا، اکبر سے ہاتھ ملاتے ہوئے دونوں نے آفس سے باہر کا رخ کیا، پیچھے سے اکبر کی آواز آئی،

سروہ آپ فارم بیچنا چاہتے ہیں۔؟  
ہاں ہمیں یہ فارمز بیچنا ہیں۔  
الطاف نے سہیل کے فارمز دکھاتے ہوئے کہا

تو وہ بندہ بولا،  
ٹھیک ہے سر آپ دونوں میرے ساتھ میرے آفس چلے، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں، وہ سامنے میرا آفس، اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنا آفس دکھایا تو سہیل اور الطاف نے ایک دوسرے کو دیکھا، اور اس کے سرگ ہو گئے، آفس پہنچ کر اس بندے نے اپنا تعارف کروایا۔

سرا بھی پانچ بیجنے میں ٹائم ہے آپ بینک چلے جائیں، چیک کیش کروالیں کوئی ایٹو ہو تو آپ مجھے کال کر سکتے ہیں، یہ میرا کارڈ،  
الطاف نے مڑ کر اکبر سے اس کا کارڈ لیا اور سہیل کے ساتھ بینک کی جانب روانہ ہو گیا، وہاں جب کیشیئر نے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سہیل کے سامنے رکھنا شروع کیں تو سہیل کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی،

کیشیئر نے تعجب سے اسے دیکھا تو سہیل نے کہا،  
معذرت سر، مجھے ہنسی اس بات پر آ رہی ہے کہ پانچ پانچ سو کا فارم خریدا تھا چند دن پہلے اور آج چند ہی دنوں میں، میں لکھ پتی ہو گیا، ساری تفصیل کیشیئر کو بتائی تو کیشیئر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، سر نصیب کی بات ہے ہم یہاں پورا مہینہ بیٹھ کر پچاس ہزار سے زیادہ نہیں کماتے،

میرا نام اکبر ہے، میں بحریہ ٹاؤن کے پلاسٹک کی خرید و فروخت کرتا ہوں، میں آپ کوئی فارم ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینے کو تیار ہوں، یقین کیجیے ابھی تک ایک لاکھ پچاس ہزار ہے ان کی قیمت لیکن میں آپ کو مارکیٹ سے دس ہزار زیادہ دے رہا ہوں،  
سہیل کو تو بانوٹھی آ گئی،

پچاس ہزار سے زیادہ نہیں کماتے،  
سہیل نے رقم سمیٹتے ہوئے الطاف کا بھی شکریہ ادا کیا تو الطاف فوراً بولا،  
یار خالی شکریہ نہیں، ایک بروکر کی سنگت رنگ لائی ہے کہ میں نے بے شک فارم نہیں خریدا

پانچ سو والا ایک فارم ایک لاکھ ساٹھ ہزار کا۔۔۔ یعنی کہ،  
بارہ لاکھ اسی ہزار کے آٹھ فارمز۔۔۔  
الطاف نے کہا، ٹھیک ہے آپ ہمیں مینوف دے دیں، یہ فارمز آپ کے ہوں،



لیکن کمایا میں نے بھی ہے، اپنا کمیشن وصول کیا ہے  
 بہت سے دوستوں سے، تم سے بھی وصولوں گا۔  
 سہیل نے خوشدلی سے ہنستے ہوئے کہا، بالکل  
 ہارتھاراق بنتا ہے، چلو اب گھر چلیں تمہاری بھابی  
 بچھنی سے انتظار کر رہی ہوگی، اسے بھی خوشخبری  
 سنا دوں، اسی کی بدولت تو آج میں نئے سرے سے  
 لکھ چکی ہوں،

☆.....☆

سہیل گھر پہنچا، گھر بھر کھانوں کی خوشبو سے  
 مہک رہا تھا، الطاف کو ڈرائنگ روم بٹھا کر جب  
 ردا کو ساری کھانا سناتے ہوئے رقم اس کے سامنے  
 رکھی تو ردا کی مانو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس  
 کی سوچ کا محور محض بیس ہزار بی فارم کے حساب  
 سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم تھی، اتنی زیادہ رقم  
 دیکھ کر وہ جیسے گنگ سی رہ گئی، سہیل پیار سے اس کا  
 سر سہلاتے ہوئے اسے ہوش کی دنیا میں لایا تو خوشی  
 سے ردا کی آنکھوں میں آنسو اگئے، سہیل  
 یہ۔۔۔؟۔۔۔ رقم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ  
 بے حد جذباتی ہو گئی، آپ میری بات نہیں سن رہے  
 تے ہیں۔۔۔ آپ کے دوست آپ کو بتاتے تو  
 اس وقت ہم اس خوشی سے محروم رہ جاتے، سہیل  
 آپ کتنے خراب ہیں، ابھی میری بات دھیان سے  
 نہیں سنتے۔ بات کرتے کرتے ردا روپا ہسی ہو گئی تو  
 سہیل نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا۔

سوری جان، میں وعدہ کرتا ہوں آج سے  
 تمہاری ہر بات بغور سنتوں گا، اب تم پریشان نا ہو،  
 جتنی دل چاہے کل کے لیے شاؤنک کرو، اپنے  
 وعدے کے مطابق میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گا،  
 ردا نے سہیل کی باتوں سے نلکتے ہوئے کہا،  
 جی بالکل کل نیا سال شروع ہو رہا ہے اور اللہ

نے ہم پر اپنا کرم کرتے ہوئے ہمیں نوازا ہے،  
 شاؤنک تو میں ضرور کروں گی، کل اپنی فرینڈز کو  
 پارٹی بھی دوں گی، لیکن آپ سب سے پہلے  
 غریبوں اور یتیموں کے لیے آج رات دیگوں کا  
 انتظام کیجئے، اور دعا کریں کے آنے والا نیا سال  
 ہمارے حق میں یونہی جھولی بھر بھر خوشیاں لاتا رہے،  
 آئین دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا تو سہیل کو

ایک دم خیال آیا،

وہ بھابھی نے بھی تو چھ فارم منگوائے تھے، ان کو  
 بتا دوں کال کر کے، ابھی ان کے بھی بک سکتے ہیں،  
 کوئی فائدہ نہیں سہیل، الٹا بھابی کو بے تحاشہ دکھ  
 ہوگا، کیونکہ بھابی اپنے فارمز کسی کو دے چکی  
 ہیں۔ اب بتر ہے ان کے سامنے ذکر نا ہی کیا جائے  
 اف ف ف ف نف سہیل جیسے کراہ کر رہ گیا  
 اور تم۔۔۔ ردا کی طرف انگ اٹھاتے ہوئے بولا،  
 تم نے بھی تو نقصان کیا نا، پورے تین لاکھ میں  
 ہزار کا، دو فارم بیچ کر۔۔۔

تب ردا ہنستے ہوئے بولی،

بہت بچپن میں ایک چڑیا والی کہانی پڑھی تھی جو  
 ایک شکاری کے چنگل سے آزاد ہو کر شکاری کو سبق  
 سکھاتے ہوئے نصیحت کرتی ہے۔

"آتا ہو تو ہاتھ سے ناکھینچو جاتا ہو تو اس کا غم نا کھینچو"  
 سو آپ بھی جانے والے دو فارمز کا غم بھولی کر  
 آنے والی اس خوشی کا سوا گت کیجئے، شونی سے کہتے  
 کہتے ردا نے دونوں ہاتھوں میں نوٹ اٹھائے  
 ہوئے سہیل کی طرف اچھال دیئے اور زور سے بولی  
 اب رات بارہ بجے کا انتظار کون کرے،  
 "میری طرف سے پکٹی نوا میر"

دونوں کی مدھم مدھم سی گھر خوشیوں بھری چھکار  
 سے گونج اٹھا۔۔۔ ☆☆





افسانہ

طاہرہ مختیار

# ”سال نور کی بارشیں“

~~~~~

وہ حسین تھی اور جانتی تھی کہ کوئی بھی اس کے حسن کے
آگے نہیں ٹھہر سکتا مگر نصیب سے کون جیتا ہے یہ بات وہ سمجھ
نہ سکی تھی.....

~~~~~



گوشت پک کر تیار ہو گیا تھا۔ رفعت بڑے سلیقے سے دسترخوان پر رکھا ناخن چٹکی تھی۔ دھوپ سمٹ کر طاقتوں اور جھروکوں تک آپہنچی تھی۔

مگر ماما جی اور ماں کے درمیان ہونے والی بحث پتلی لمی کی طرح بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس گرمی سردی سے بلیس تنگ پڑنے لگی، تو خیلے بہانے سے ماں کو اٹھا کر باہر لے آئی۔

"دیکھ اماں" آخر تیرے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ ہاں کیوں نہیں کر دیتی ماما جی کو، اور تو اچھی طرح سے جانتی ہے، کہ ماما جی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں "جو اپنی ضد چھوڑ دیتے ہیں۔ بہتر ہے، کہ تو ہی اپنی ضد چھوڑ دے، اور ہاں کر دے رفعت اور شیر و کے رشتے کے لیے" اس نے اپنی بات مکمل کی اور ایک نظر رفعت کی طرف دیکھا، جو اس وقت چپ چاپ گھٹنوں میں سر دیے بسرونی چلی جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی، بلیس کا ہر فیصلہ حرف آخر کی طرح سے ہوتا ہے۔

"تیرا تو دماغ چل گیا ہے" بنا سوچے سمجھے ہی بولے چلی جا رہی ہو، جسٹ بی بی کو بلیس کا ایسا مشورہ نہایت احمقانہ لگا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں، کہ آپنے مفاد کے لیے بلیس کس حد تک جاسکتی تھی، پھر بھی اس سے رفعت کے لیے اتنے کنصور پن پر حیران تھیں۔

"مجھے کیا لگتا ہے، کوئی شہزادہ آئے گا تیری اس کلو پری کو بیاہنے کے واسطے؟ سہاری زندگی نہیں پڑی رہے گی" تیرے سینے پر ایک سہل کی طرح، اچھا ہے کہ تیری خیالی میں ہی اپنے گھر کی ہو جائے۔ بلیس ابھی بھی اسی نقطے پر ڈٹی ہوئی تھی۔ "اور ویسے بھی اپنا گھر بار ہے اس کا مجھے اور کیا چاہیے۔ ہم دونوں بہنوں نے بیاہ کے ایک ہی

"تل سے بہتا ہوا پانی شاید میرے چہرے کے ساتھ ساتھ میرے نصیب کی سیاہی بھی دھو ڈالے، وہ چہرے پر زور زور سے پانی کے چھپا کے مار رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رب سے شکوہ کناں بھی تھی، جب بلیس نے اسے "مجھے سے آدھو جا۔" دیکھ رفعت "آخر تیرے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیا رکھا ہے ان نکلے لوگوں میں"

چھوڑ دے اس بو نکلے کی جان تجھے میں آخری بار کہہ رہی ہوں؟

"اور چل کچہری میرے ساتھ" بات اگر پیار سے تیری سمجھ میں آجائے تو اچھا ہے "ورنہ تو اچھی طرح سے جانتی ہے، کہ بلیس کس بلا کا نام ہے؟ اس نے آنکھیں دیکھانے کے ساتھ ساتھ ایک ہاتھ سے رفعت کی گردن بھی دبائی تھی۔

"دیکھ بلیس" اب چاہیے تو میرا گلہ دبا دے یا زہر دے دے مجھے "پر شیر و کو نہیں چھوڑوں گی میں" اس کلمے نے تو روٹی بھی کھائی ہو تو میرے ہی ہاتھوں کی طرف دیکھتا ہے "عادی ہو گیا ہے وہ میرا" تیرے اور سراج کے جھگڑے سے میرا اور شیر و کا کیا لینا دینا؟

نا جانے آج کیسے اس میں اتنی ہمت آگئی تھی؟ جو بلیس جیسی بلا کے آگے ڈٹ گئی تھی۔

"بلیس اور رفعت دونوں سنگی بہنیں تھیں۔" بلیس کا خسن ایسا تھا کہ چودھویں کے چاند کو بھی شر دے۔ جبکہ رفعت اس کے مقابلے میں گہری سانولی رنگت رکھتی تھی۔ اسی ایک بات کا فائدہ بلیس ہمیشہ سے اٹھاتی آئی تھی۔

وہ خود کو نام صرف شہزادی سمجھتی بلکہ کہلاتی بھی تھی۔ گھر کے سارے کام کا ج رفعت کی ذمہ داری تھی۔ جو وہ بہت خوش اسلوبی سے نبھاتی بھی تھی۔



بہو کتنی حسین ہے اس بات سے نسرین بانو کو  
بھلا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ مطلب تو اس بات سے  
تھا کہ اُن کا گھبر و جوان سپوت اب اپنی کمائی کا آدھا

حصہ دینے لگا تھا ماں کو۔ اور یہ کوئی چھوٹا سا مسئلہ نہ  
تھا جسے وہ چپ چاپ سہہ جاتی۔ ماں کے گھر کی  
رانی نے جب نسرین بانو پر حکومت کرنے کی کوشش  
کی تو اُسے منہ کی کھائی پڑی۔ نسرین بانو جیسی  
گھٹکتی عورت نے شطرنج کی اس بساط پر کیسے تمام

مہروں کا رخ پھرا اُسے کانوں کا خبر نہ ہو  
سکتی۔ حسن کا خدار اترا تو سراج کو بلیس میں کپڑے  
نظر آنے لگے جو لب بلیس کے کانوں میں شرابی  
گھولا کرتے تھے۔ اب انکارے برسانے لگے  
تھے۔ تب بلیس نے بھی کھل کر ان ماں بیٹوں کا  
مقابلہ کیا۔ اور وہ تو پہلے ہی سیر کو سوا سیر تھی۔ لحاظ  
رکھنے کی وہ عادی نہ تھی اور سراج بھی اپنی ماں کی  
ایسی بے عزتی سہہ ناسکا۔ اُس کے پھپھروں لاتوں  
اور گھونٹوں نے بلیس کو ادھ موا کر دیا تھا، وہ ایک  
زنجی ناگن کی طرح پھنکار رہی، تو نسرین بیگم نے  
اس کے حصے کا دانہ ڈنکا سمیٹا اور پھر آج واحد میں  
اُس چڑیا کو سریالی منڈیرے اُڑا دیا گیا۔

اسے دُکھ کر سہا ل آنے ہوئے چار مہینے گزر  
چکے تھے اور ان چار مہینوں میں سراج نے ایک دفعہ  
بھی اُس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں تھی۔ محبت کا  
وہ بخار جو شادی سے پہلے سر چڑھ کر بولتا تھا، چند  
مہینوں میں ہی اتر چکا تھا۔

"مجھے نہیں رہنا، اب سراج جیسے ناقد رے کے  
ساتھ، اُس نے اچانک جنت بی بی کے سامنے  
دھماکہ کیا، بس میں نے اُس سے طلاق لینے کا پکا  
فیصلہ کر لیا ہے اور وہ ذرا سی دیر کوڑی تھی"

"اور جنت بی بی ایک کمزور سی آواز میں

گھر جاتا ہے، میں اس کا بہت خیال رکھوں گی" تو  
اپنے دل سے سارے وہم نکال دے اور ماما جی کو  
ہاں کر دے۔

"جنت بی بی نے شاکی نظروں سے بلیس کی  
طرف دیکھا" پر وہ نما تا تو جھلا ہے، اللہ لوک ہے  
بیچارہ، اسے کیا پتہ اس شادی بیاہ کا۔ جنت بی بی کا  
دکھ اب اُس کی آنکھوں سے پھٹکے لگا تھا، مگر آواز  
کی چٹکی ابھی برقرار تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے" میں بھی اس رفعت کی وجہ  
سے اپنا بچپن کا سنگ نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر جی نہیں سکتی  
اُس کے ساتھ تو مر تو سکتی ہوں نا؟ وہ چٹانوں جیسے  
لہجے میں ماں سے ٹکرانی تھی۔ تو رکھ اس کلمہ ہی کو اپنے  
پاس سنہال کر۔ میں سراج کے بغیر مر تو سکتی ہوں پر  
جی نہیں سکتی؟ وہ غصے سے پھنکار رہی ہوئی اندر کی  
طرف پھکی، اور پڑیا میں بندھی ہوئی کندم کی گولی  
اُٹھلائی تھی۔ جنت بی بی اور رفعت کے پاؤں تلے  
سے زمین نکل گئی۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں  
کہ ایسا کر گزرتا بلیس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔  
جنت بی بی نے ایک نظر رفعت کی طرف دیکھا، کتنی  
بے بسی تھی اُس کی آنکھوں میں، کہ دونوں ماں  
بیٹیاں گلے لگتے کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

بات مٹوانے کے لیے بلیس نے اچھی طرح  
سے واقف تھی۔ اور جنت بی بی کی کب چلتی تھی اُس  
کے آگے۔

"لو کھا لو نا" سراج کی آنکھوں میں محبت کی  
چاشنی اور ہاتھوں میں شرابی تھی، وہ تازہ گوشت کی ڈلی  
ماں کی نظروں سے بچا کر اوڑب میں چھپا کر لایا  
تھا۔ شروع کے کچھ مہینے پیار کی اس لگن بچپن میں  
کیسے گزروے اُسے پتہ ہی نہ چلا، منصوبہ تو تب  
ٹوٹی جب یہ لگن بچپن غریلو شطرنج کی غدر ہوئی۔

منبتاں تھیں۔ اور کیا چاہتی ہے تو؟ اور یہ کہ رفعت کو بھی نہیں رہنے دوں گی، ان کیلئے لوگوں کی ہانڈیاں پکانے کے لیے "جنت بی بی ایک بار پھر سے حیرت کا بت بنی بلیس کا منہ تکتے گئی۔

"ایسا کبھی سوچنا بھی مت کہ میں تیری خاطر شیر کو چھوڑ دوں گی۔ اور یہ ہانڈیاں پکانے کی بات تو صرف اس لیے کی ہے تو نے "کیونکہ تجھے اس بات کی فکر ہیکہ میں اگر شیر وکے پاس چلی گی تو ماں کے گھر کے سارے کام پھر تجھے کرنے پڑیں گے۔ رفعت دروازے کی اوٹ میں سے نکل کر اب بلیس کے سامنے سی کھڑی تھی۔ اچھی طرح سے سن لے میری بات

تو مجھے اپنے ساتھ زبردستی واپس تو لے آئی ہے "گمر زبردستی طلاق نہیں دلا سکتی، میں اور شیر و خوش ہیں اپنی زندگی سے۔

تو خوش ہے "اُس ملنگ کے ساتھ۔" بلیس کا ایک بلند آواز قہقہہ فضا میں گونجا تھا۔ تو نے میری خوشی کے لیے اُس ملنگ سے شادی کی تھی نا، تو اب میں ہی خوش نہیں ہوں تو تو بھی ماں جا میری بات، اور چپ چاپ اس کا غر پر دستخط کر دے۔ وہ آج صبح ہی پچھری سے طلاق ناے بنوالا تھی۔

اب سوچ کیا رہی ہے۔ کہ دستخط ان کا غزوں پر اس نے رفعت کے ہاتھوں میں زبردستی قلم پکڑاتے ہوئے ہلکی سی اُس کی انگلیاں بی مڑوڑی تو کیا سمجھتی ہے میرے بغیر تو اُس گھر میں بس جائے گی۔ یا میں تجھے وہاں بسنے دوں گی۔ وہ رعونت بھرے لہجے میں پھنکاری تھی۔ اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بلیس کے منہ سے نکلی ہوئی بات پوری نا ہو سکے۔ دونوں اطراف سے رہائی سے پیروانے پر دستخط کر دیے گئے تھے۔ آخری ملاقات میں سراج

اور بلیس چہرے پر سکون تھے۔ اس بات سے بے خبر کے شیر وکی معصوم آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں نے مہینوں تک رفعت کو ٹر پائے رکھا تھا۔

"عورتوں کے ڈھیر میں بیٹھا ہوا وہ اکیلا مرد بڑی دلچسپی سے کسی کے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھوں کی طرف متوجہ تھا۔ اُس کی سانولی کلائی میں ٹھکنے والی چوڑیاں کسی مدھر گیت کی طرح سے کسی کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اُس کی مردانہ وجاہت سے بے خبر رفعت دھرا دھڑ عورتوں کو چوڑیاں پہنانے میں مصروف تھی۔ البتہ پہلو میں بیٹھی ہوئی بلیس نا جانے کب سے اصغر کو تاڑے جا رہی تھی اصغر کی مردانہ وجاہت بار بار کسی ہتھوڑے کی طرح سے اُس کے دل پر دستک دیے جا رہی تھی۔ کاش یہ مہیوال میری تھو لی میں آگرے وہ دل ہی دل میں رب سے اُسے مانگنے لگی تھی۔

"کیا بات ہے صاحب؟" دونوں ماں پتر کب سے دوکان میں ڈیرہ جمائے بیٹھے ہو۔ نا چوڑیاں لے رہے ہو اور نا اٹھ کر جا رہے ہو۔ عورتوں کی دوکان ہے بابو یہاں تمہارا زیادہ دیر بیٹھنا اچھا نہیں ہے۔ رفعت اُس کے مردانہ حسن کے رعب کو خاطر میں نا لاتے ہوئے بولی تھی۔ بلیس کو اس کا یوں اصغر کو مخاطب کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

"تجھے کیا تکلیف ہے؟ تو اپنے کام سے کام رکھ۔ اُس نے اصغر اور اس کی ماں کے سامنے ہی اسے بڑی طرح سے جھڑکا تھا۔

"پتر تو کیا سارا دن اکیلی ڈکان پر کام کرتی ہے بڑھیا نے بڑی نرمی سے بلیس سے پوچھا تھا؟

"ارے اماں میں کیوں کروں کام؟ رب سوچنے نے جی بھر کر حسن سے اس لیے تو نہیں دیا نا



جہاں جنت بی بی لکڑیوں کی ٹھنڈی میٹھی آگ پر اس کے لیے گرم گرم پراٹھے تلے جا رہی تھی۔ اصغر کی ماں جنت بی بی کی دور کی رشتہ دار تھیں۔ وہ پاس جا کر بیٹھا تو اس کی ماں کلثوم اور جنت بی بی نے اسے اس کا رشتہ پکا ہونے کی خوش خبری سنائی۔ جسے سن کر اسے کوئی خاص خوشی محسوس نہ ہوئی اور چند پل کے لیے بس چپ سا ہو گیا۔

"اماں مجھے تجھ سے ضروری بات کرنی ہے؟ وہ ماں کو جنت بی بی کے پہلو میں سے اٹھا لایا تھا۔  
"یہ کیا بول رہا ہے تو؟ بلیس کو چھوڑ کر تو اس سانولی سی رفعت سے شادی کرے گا، کیا ہو گیا تیری عقل کو؟ بھلا میرے ہیرے جیسے بچے کے ساتھ رفعت کیسے بچے گئی۔ بلیس مارے تجسس کے دروازے کی اوٹ پیچھے کھڑی یہ ساری کہانی سن چکی تھی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں مارے حیرت کے لمحہ بھر کو بھٹی تھیں۔ اور پھر اگلے چند پلوں میں وہ جسے ساری رات جھولی پھیلائے رب سے مانگتی رہی تھی، وہ جنت بی بی کے سامنے رفعت کے لیے جھولی پھیلائے بیٹھا جنت بی بی کو حیران کر گیا تھا۔ انہیں بھلا کیا اعراض ہو سکتا تھا؟ اور پھر مدتوں کے بعد جنت بی بی نے کوئی اہم فیصلہ بلیس کی مرضی کے خلاف کیا تھا۔ اس بار وہ رفعت کے لیے بلیس جیسی بلا سے ٹکرائی تھیں۔

حنانی ہاتھوں کی مہک اسے سرور کے جاری تھی۔ وہ اس کی نرم گزار پھٹیلی پر پھیلی ہوئی حنا کی خوشبو کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا شاید؟ جب رفعت کی مدھر آواز نے اس کے اس تسلسل کو توڑا دیا تھا۔

"سنئے، ایک بات پوچھوں آپ سے؟ اس کے سوال میں گھبراہٹ کا عنصر واضح تھا۔

کہ میں سارا دن عورتوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں چڑھاتی رہوں؟

یہ پہلو پری کام کرنے کے لیے، بس میں تو کبھی کبھار اس کی مدد کروا دیتی ہوں۔ بلیس نے بات تو رفعت کو لگائی تھی مگر وہ دیکھ اصغر کو رہی تھی اس کی طواف کرتی ہوئی نظریں اصغر کے چہرے پر سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔

"بہن! ہم نے تمہاری ماں سے ملنا ہے۔ ہمیں اپنے گھر لے چلو، وہ کیسے ہے؟ ماں اسی نے مجھا ہے ہمیں۔ اصغر کی ماں بلیس کی گوری پھٹیلی کو اپنی ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی۔

"اچھا تو ماسی کیسے نے بجا ہے تم دونوں کو؟ تو یوں کہو نا میرے رشتے کے واسطے آئے ہو؟ وہ کن انکھوں سے اصغر کی طرف دیکھتی ہوئی بڑی بے باکی سے بولی تھی۔

"گلی لکڑیوں کو پھونکیں مار مار کر رفعت کی آنکھیں کسی لال انٹارے کی طرح سے دھنکے گئی تھیں۔ زردے کو رنگ چڑھاتی ہوئی وہ آپ زردہ ہو رہی تھی۔ اصغر کے لیے رفعت اس گھر کی وہ واحد چیز تھی جسے وہ کافی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا نمکس سا سنسن دھیرے دھیرے اصغر کی دھڑکنوں کو گرمانے لگا تھا۔

"محسن کے ایک طرف ڈربے میں بند مرغوں نے منہ اندھیرے ہی بانگ دینا شروع کی تو رفعت نے انہیں کھول دیا، اور خود نمازا ادا کرنے کے لیے تخت کی طرف بڑھ گئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ نمازا ادا کرنے کے بعد وہ جنت بی بی اور اپنی ماں کے پاس آ بیٹھا تھا۔ محسن کے ایک کونے میں بیٹے ہوئے چولہے کو ایک چھوٹی سی مچھی دیوار کے ساتھ باز پچی خانہ کی شکل دے دی گئی تھی

## ”انسانی جسم اور اس کی ضرورتیں“

فرانسیسی مصور ہوگ باف اپنے فن میں ایسا مستغرق ہوتا تھا کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا ایک دفعہ وہ تین دن تک شب روز ایک تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ اس کی بیوی دن میں تین مرتبہ اسٹوڈیو کے دروازے پر تازہ کھانا رکھ آئی اور گزشتہ والا اٹھلائی تین دن کے بعد اس نے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا تو اس کی بیوی نے ہوگ سے کہا تمہیں کچھ ہوش ہے تین دن ہو گئے تم نے کچھ کھایا پیا نہیں مصور نے جواب دیا میں جسم اور اس کی ضرورتیں اسٹوڈیو کی دہلیز پر چھوڑ آتا ہوں جیسے مسلمان مسجد میں داخل ہوتے وقت کرتے ہیں۔

”ہوں“ پوچھو جو پوچھنا ہے؟ میں اس وقت بہت موڈ میں ہوں۔ رفعت کی نرم ہتھیلی ابھی بھی اُس کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔  
”آپ نے بلقیس جیسی حسین عورت کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کیوں کی؟“ بالآخر اُس نے اس آخری گرہ کو بھی کھولنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔  
”اہا ہا۔ اصغر کا جائدار تہقہ چند لمحوں کے لیے کمرے میں گونجا تھا۔ وہ حیرت بھری آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی تھی۔

میں سرگوشی کی تھی۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میری نظر سب سے پہلے تمہاری ان کلائیوں پر پڑی۔ اور پھر میں دور سے ہی ان کی زناہٹ کو محسوس کرنے لگا۔ اور پھر۔۔۔ وہ چند لمحوں کوڑ کا تھا؟  
اور پھر کیا؟ وہ پھر سے کروٹ بدل کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بیتابی سے پوچھ بیٹھی۔  
”اور پھر! میں تمہاری ان آنکھوں میں ڈوب گیا۔ تو بلقیس کو کیسے دیکھتا؟

وہ دھیرے سے اس کے بالوں کو سہلاتا ہوا اُس کے دل میں پڑی ہوئی اُس آخری گرہ کو بھی کھول گیا تھا۔  
رفعت نے ایک بھر پور نظر سے اصغر کے چہرے کی طرف دیکھا جو صرف باہر سے نہیں بلکہ اندر سے بھی حسین تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کیا۔ اور پرسکون ہو کر اصغر کے کاندھے پر سر ٹکا دیا۔۔۔ کہ اُس کو بھی کوئی بھر پور چاہئے والا لگ گیا تھا۔۔۔ باہر ہلکی ہلکی بو نڈا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اب کی بار سال نو کی یہ بارشیں اس کی زندگی محبت کا پیغام بن کر آئی تھیں۔

”او، تو تم یہ بات دل میں دباؤ بیٹھی تھیں“ جو اتنے دنوں سے یوں پُپ پُپ کی تھیں۔ اور میں یہ سمجھتا رہا کہ شاید تم خوش نہیں ہو؟ وہ آنکھوں میں شرارت بھرے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے جواب کی منتظر رہی پھر خاموشی سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ لالین کی پہلی روشنی سامنے کی کچی کچی دیوار پر پڑ رہی تھی، بادل بہت زور سے گر جا تو اُس نے اپنے اوپر اوڑھے ہوئے لحاف کو کچھ اور کندھوں تک کھینچا تو اُسی وقت سامنے کی دیوار پر اصغر کا عکس ابھرتا ہوا نظر آیا، اب ایک بار پھر سے رفعت کی نرم گنداز ہتھیلی اصغر کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔

”سنو! اُس نے دھیرے سے رفعت کے کان

## انجان ہمسفر

قسط 5



اس کی چھوٹی سی غلطی نے بہت سے لوگوں کی زندگی بدل دی تھی جس میں اس کی اپنی زندگی بھی شامل تھی۔



”مطلب آپ کافی کمزور ذہن کے مالک ہیں مسٹر خرم۔“ وہ نہایت اعتماد سے بولی۔  
”پہلے تو نہیں تھا مگر جس دن سے آپ کو پہلی بار دیکھا اس دن سے ذہن میں صرف ایک ہی چہرہ اور نام گونج رہا ہے جس کی وجہ سے باقی سارے کام مٹ گئے ہیں۔“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔  
”اوہ.....“ صحنی نے زیر لب کہا اور ارد گرد دیکھنے لگی وہ کوشش کر رہی تھی کہ خرم پر اس کی نظر کم سے کم پڑے۔  
”پتہ ہے صحنی..... میں بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں دوستیاں بھی کی ہیں مگر آپ میں کچھ الگ ہے۔ آپ کی پرسنالٹی میں کچھ عجیب سا سحر ہے جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔“ وہ جذب سے بولا۔ صحنی نے اس کے چہرے پر نظر دوڑائی۔

”شاید آپ کی سب سے دلکش چیز آپ کی یہ کالی آنکھیں ہیں جو دیکھنے والوں کو مقید کر لیتی ہیں۔“ اس نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تو خرم سے خود بخود پلکوں کی چلکن نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔

”آپ کافی تیز لگتے ہیں مسٹر خرم شاید اپنی باتوں کے جال میں پھنسا کر لوگوں کو شیشوں میں اتارنے کا ہنر جانتے ہیں آپ۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ تو مجھے پتہ نہیں۔“ وہ کانڈھے اچکا کر بولا۔ ”البتہ ایک بات تو طے ہے۔ میں نے صحنی کو اپنے دل میں اتار لیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ صحنی بھی مسکرا دی۔

”آپ کی مسکراہٹ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کو بھی یہ ناچیز پسند آ گیا ہے۔“ وہ سر کو خم دیتے ہوئے

بولا۔





”ہوں.....“ مٹھی نے سر کو جنبش دی اور مسکرا دی۔

☆.....☆

اس دن کے بعد تو مٹھی جیسے خرم کے سحر میں رہتی تھی۔ وہ گھنٹوں فون پر باتیں کرتے تھے۔ البتہ اس کے بعد وہ صرف ایک بار خرم سے مل پائی تھی وہ بھی زارا کے ساتھ اس کے گھر جا کر۔ زارا کو مریم سے نوٹس لینے تھے تو وہ بھی چل دی۔ اتفاق سے خرم گھر پر ہی تھا مٹھی کو یوں اچانک دیکھ کر تو وہ نہال ہی ہو گیا تھا۔ اتفاق سے خرم کی انہی گھر پر نہیں تھیں اس لیے وہ مل نہیں پائی تھی۔ محض ایک مہینے میں دونوں نے بہت سے عہد و پیمان کر لیے تھے۔ مٹھی نے اسے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ اپنے تایا ابو کے گھر میں رہتی ہے اور اس کے والد باہر ہوتے ہیں۔ خرم اور مریم دوسری بہن بھائی تھے اور خرم نے حال ہی میں ملک کی سب سے بہترین یونیورسٹی سے بزنس میں ڈگری لی تھی اور اب اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کی آخر ہوئی تھی۔ جسے اس نے قبول کر لیا تھا۔ وقت تیزی سے سرگرم رہا تھا۔ مٹھی کا اگلا سسٹم بھی ختم ہو گیا تھا اب محض دو اور سسٹم باقی تھے اور پھر اس کا ماسٹر بھی مکمل ہو جاتا تھا۔

سہیل کو گئے ہوئے سال ہونے کو آیا تھا۔ وہ کبھی کبھی فون کر لیتا تھا اور سب گھر والوں سے بات کرتا تھا سوائے مٹھی کے۔ مٹھی اور اس کے درمیان صرف ایک بار بات ہوئی تھی وہ بھی تب فون مٹھی نے اٹھا لیا تھا۔ ”ہیلو۔“ مٹھی نے چند ہی لمحے پہلے خرم سے بات کی تھی جس کی وجہ سے اس کی آواز میں عجب سی کھنک تھی۔ ”سہیل بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف آواز پہچانتے ہی لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

”اوہ سہیل بھائی کیسے ہیں آپ؟“ وہ خوش دلی سے بولی۔ وہ شاید وہ واقعہ بھلا چکی تھی مگر اپنی بے عزتی کبھی نہیں بھولا تھا۔

”انہی جی سے بات کراؤ۔“ کاٹ دار لہجے میں کہا گیا جیسے اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”جی۔“ اس نے کہا اور تائی امی کو بلانے چل دی تھی۔ اس کے بعد اس نے دانستہ اور غیر دانستہ بھی ریسیور اٹھانے کی غلطی نہیں کی تھی مبادا وہ بارہ سہیل کا فون ہی ہو اور وہ اس کی پھر سے بے عزتی کر دیں۔ سہیل کے جانے کے بعد گھر والوں کا رویہ جو اس کے ساتھ ہو گیا تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ اب گھر والے اس سے بات کر لیتے تھے مگر پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔

☆.....☆

آج وہ اپنا پیڑ ٹیک کر کے خرم کے ساتھ آئی تھی۔ ”خرم تمہارا کیا ارادہ ہے آگے کا؟“ وہ گھونٹ گھونٹ سوٹ ڈرنک پیتے ہوئے بولی۔

”آگے جسے تم سے محبت کا ہی ارادہ ہے اور یقیناً یہ بہت نیک ارادہ ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”پاں ارادہ تو نیک ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی نیکیوں میں اضافہ کرو اور مجھ سے شادی بھی کر لو۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔ ”ہوں۔ ارادہ تو یہ بھی اچھا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”تو میں تایا ابو سے بات کروں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے بات کرتے ہوئے بولی۔

”ہوں۔ کر لو بات۔ میں بھی بات کرتا ہوں امی سے۔“ وہ مسکرایا۔ جواب مٹھی بھی مسکرا دی۔

”صوفی تم نے نوٹ کیا ہے پچھلے کچھ مہینوں سے ایسا ایسی لمبی باتیں کرتی ہے فون پر۔“ زار نے سرگوشی کی صوفی کے کان میں کیونکہ مٹی سیل فون پر میچ پڑھ کر مسکرا رہی تھی۔

”ہوں۔“ صوفی نے زارا کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

”میں چائے بنانے جا رہی ہوں کوئی پیئے گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو دونوں چونک گئیں۔

”آپ بنا میں گی؟“ صوفی کو حیرت ہوئی۔

”کیوں بھی اس میں حیرت والی کیا بات ہے؟“ مٹی نے صوفی کو منہ کھولے دیکھا تو بولی۔

”نہیں وہ آپ کو کام کرنے سے الگ جی ہے ناں“..... وہ مصحفیت سے بولی۔

”اور وہ بھی بچکن کے کام“ زارا نے جملہ بڑھایا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے جب موڈ ہو تو کر لیتی ہوں۔ آج موڈ بتا تو میں جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر بچکن میں چلی گئی۔ زارا اور صوفی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگی تھیں۔

”کچھ تو گزر بڑے صوفی“..... زارا دوبارہ بولی۔

”ہاں بالکل ایسا کافی بدلی بدلی لگ رہی ہے صوفی کہیں ایسا کا انجیر تو نہیں چل رہا۔“ صوفی قیاس آرائی کرتے ہوئے بولی۔

”غلط بات نہ کرو تم دونوں۔“ صبا نے جانے کب سے ان کے سروں پر کھڑی تھی۔

”باجی آپ.....“ صوفی بوکھلا گئی۔

”ہاں۔ تم دوسروں کے بارے میں بات کرنے سے باز نہ آنا۔“ وہ اس کے سر پر چپٹ لگا کر بچکن کی طرف بڑھ گئی۔

”مٹی نے سب کے لیے چائے بنائی اور لے آئی۔ دادی بھی عصر پڑھ کر آئی تھیں اور روبینہ بیگم بھی سو کر اٹھ گئی تھیں۔“

وہ سب لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ساتھ ہی T.V پر چلنے والے پروگرام میں گم تھے کہ دروازہ کھلا.....

”السلام علیکم۔“ اس نے زور سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ”تمہارے لیے چائے لاؤں۔“ مٹی مسکرا کر بولی۔

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا اور دادی کے کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا۔

”آگیا میرا بچہ۔“ دادی نے بڑھ کر ماتھا چوم لیا۔ سہیل کے جانے کے بعد دادی عبد الرحیم سے اور زیادہ قریب ہو گئی تھیں۔

”جی دادی آگیا میں۔“ وہ ان کے ہاتھ چوم کر بولا۔

”چائے؟“ مٹی نے کپ بڑھایا۔

”ایسا“..... وہ بیٹنے لگی مٹی کہ عبد الرحیم بولا پڑا۔

”ہاں“..... وہ پتی۔

”وہ لڑکا کون تھا جس کے ساتھ آج آپ تھیں۔“ لہجہ سخت اور نفیث کرتا ہوا تھا۔

سب یک دم متوجہ ہوئے۔

”وہ.....“ وہ اچانک افتاد پر گہمراگئی اور لاشعوری طور پر ہاتھ مروڑنے لگی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے؟“ وہ روبرو کھڑا ہو گیا۔

”کون لڑکا.....“ روینہ بیگم نے عبدالرحیم سے سوال کیا۔

”یہ ہی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جس سے یہ سر عام ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں ہماری عزت کی پرواہ کئے بغیر۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”خیر انہیں اس گھر کی عزت کی پرواہ تو کبھی رہی ہی نہیں.....“ روینہ بیگم نے منہ پر چوٹ کی۔

وہ سب کو بتانا چاہتی تھی مگر ایسے نہیں پہلے وہ تایا ابو سے بات کر لینا چاہتی تھی مگر حالات اس کی سوچ سے بالکل متضاد تھے۔

”وہ خرم ہے۔“ آخر کار وہ اپنی ہمت جمع کر کے بولی۔

”کون خرم؟“ عبدالرحیم نے ٹیکھے ابرو سے دیکھا۔

”زارا کی دوست مریم کا بھائی.....“ اس نے بمشکل کہا۔ زارا کو کرنٹ لگا۔ ”کیا خرم بھائی؟“ اسے

لگا کہ اس نے کچھ غلط سن لیا ہو۔ بات اتنی آگے بڑھ گئی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

”وہ..... میں آج تایا ابو سے بات کرنے والی تھی۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی خود اعتمادی ہوا ہو گئی تھی۔

”کس بارے میں بی بی؟“ دادی کو طیش آ گیا۔

”دادی.....“ وہ میں اور خرم شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے دادی کو دیکھا اور شرمندگی سے بولی۔ ان

کے ماتھے پر شکنیں واضح تھیں۔

”جو کرنا ہے کرو بی بی یہاں ہے ہی کون جس کی تم پرواہ کرو گی۔ کرو گی تو وہی جو تمہارا دل کرے گا۔ میرے

بیٹے سے بھی پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس بیچارے کے پاس ہاں کہنے کے علاوہ تو کچھ ہے ہی نہیں۔“ دادی

نے بغیر لحاظ کے اس کو سنا دیں۔

”صحیح کہہ رہی ہیں دادی آپ انہیں کسی کی اجازت کی ضرورت بھلا کب سے ہونے لگی خیر سے بالغ ہیں

یہ اپنے فیصلے کی خود مختار ابو جی سے بات کرنے کی تو صرف فارسیٹی ہی ہے۔“ عبدالرحیم نے بھی چوٹ کی

اور چل دیا جبکہ اڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ ایسا کافر چل رہا ہے۔“ صوفی نے صبا سے کہا۔

”تو اور کیا! صبا باجی تو کچھ زیادہ ہی پوزیشن سوچتی ہے۔“ زارا نے بھی حصہ لیا۔

جبکہ صبا صرف چپ چاپ سر جھکائے کھڑی مٹی کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

وہ کب سے کمرے میں ٹہل رہی تھی ابھی کچھ دیر پہلے واقعے کو سوچ سوچ کر اس کے پسینے جھوٹ رہے تھے

”اف اللہ..... مجھے کتنی شرمندگی ہو رہی تھی۔“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔

کمرے کا دروازہ کھلا صبا سے یوں ٹھٹھا دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ چپ چاپ آئی اور الماری سے ضرورت کی

208

چیزیں نکالنے لگی۔

”صبا“..... صحنی نے صبا کو الماری میں سے سر دیئے دیکھا تو بول پڑی۔

”ہوں۔“ صبا نے پلٹ کر دیکھا۔

”وہ..... میں.....“ وہ بار بار ہاتھ مسل رہی تھی عجیب شش و پنج میں گھری ہوئی تھی کہ بات کس طرح کرے۔ صبا اب اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر وہ مختصر رہی اور پھر بولی۔

”کچھ کہنا ہے ایسا تمہیں؟“

”وہ..... میں سب کو بتانا چاہتی تھی خرم کے بارے میں بس ٹھیک وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ بخدا میں چھپانا نہیں چاہتی تھی۔“ وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”پر یہ بات مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“ صبا نے کانٹھے اچکائے۔ ”میں نے تو وضاحت طلب نہیں کی ہے۔“ ”مجھے کسی سے تو بات کرنی ہی ہے ناں اور تم جانتی ہو کہ میں اپنی باتیں تم ہی سے شیئر کرنی آئی ہوں۔“ وہ بڑھ کر اس کے مقابل آگئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”دیکھو ایسا یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے اور تم اپنے آپ کو اس کا کل مختار گردانتی ہو تو مجھے بتانے کا کیا فائدہ تمہارا جو جی چاہے وہ کرو۔“ اس نے نرمی سے صحنی کا ہاتھ دبا یا اور باہر نکل گئی۔

صحنی اس کی پس پردہ باتوں کا مطلب سمجھ گئی تھی اس لیے اور پریشان ہو گئی۔

آخر رات کو اپنا سارا حوصلہ جمع کر کے وہ تایا ابو کے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تایا ابو کو سارے واقعات کا علم ہو چکا ہو گا اب بات کرتے ہی بنی تھی لہذا وہ کمرے کے باہر موجودگی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور دروازے پر ٹاک کیا۔ چند لمحے بعد اسے اندر آنے کی اجازت مل گئی۔

”تایا ابو میں آ جاؤں۔“ وہ مدھم آواز میں بولی۔

”ہاں بیٹا آ جاؤ۔“ ان کی شفقت بھری آواز آئی۔ صحنی نے آہستگی سے قدم رکھا۔ ملک صاحب کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے جبکہ کمرے کے ایک کونے میں روبینہ بیگم نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ چلتی ہوئی بیڈ کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ایک نظر نماز پڑھتی ہوئی روبینہ بیگم پر ڈالی اور پھر ملک صاحب کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تایا ابو مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ زمین کو گھورتے ہوئے بولی۔ اس کے اندر ان سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔

”مجھے اندازہ ہے۔“ ملک صاحب نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور متوجہ ہوئے۔

اس پر شرمندگی کا غلبہ اور بڑھ گیا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔“ وہ نرمی سے بولے۔

وہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹیک گئی۔

”کہو بیٹا۔“ وہ اس کے ہتھکے سر کو بغور دیکھ کر بولے۔

”وہ تایا ابو..... اس نے تم کو ٹھوک لگا۔“ ”مجھے آپ سے خرم کے متعلق کچھ بات کرنی تھی۔ آپ کو پتہ تو چل چکا ہو گا۔“ اس نے پہلی بار سراٹھا کر انہیں دیکھا۔



”ہاں مجھے لٹاں نے بتایا تھا۔ مگر میں تم سے جاننا چاہوں گا۔“ وہ مختصر ہوئے۔

اس نے ایک نظر تائی امی پر ڈالی جو دعائیں مصروف تھیں پھر تایا بولے۔

”خرم زارا کی دوست مریم کا بھائی ہے۔ ہمارے ہی ایریا میں رہتے ہیں وہ دو بلاک چھوڑ کر۔ ہماری ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔“ وہ ہٹانے لگی۔

اتنے میں روبینہ بیگم نے جائے نماز طے کی اور کمرے سے نکل گئیں جیسے انہیں چنداں پروا نہ ہو۔ مٹی نے مختصر ساری بات بتا دی۔

”تو اب؟“ ملک صاحب سوالیہ نظروں سے بولے۔

”وہ..... تایا ابو ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے بڑی ہمت کر کے کہا۔“ جتنی بھی بولڈ اور کانفیڈنٹ سہی مگر تایا ابوی وہ واقعی عزت کرتی تھی۔ لہذا ان کے سامنے وہ یہ باتیں کرتے ہوئے سبکی محسوس کر رہی تھی۔

”ہوں۔“ ٹھیک ہے اگر یہ تمہاری خوشی ہے کہ تو ہم تمہاری خوشی کو محترم جانتے ہیں تم بلاو خرم کے والدین کو۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ کھل اٹھی۔ ”واقعی تایا ابو؟“

”ہوں۔ تم ہماری بیٹی ہو اور بیٹیوں کی خواہشات کا احترام کرنا چاہیے۔“

”ٹھیک یو تایا ابو۔“ وہ بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

”جیتی رہو بیٹا۔“ انہوں نے اس کے سر پر پیار دیا۔

کمرے میں آ کر وہ اچھل بی پڑی۔ صبا جو بستر ٹھیک کر رہی تھی چونک پڑی۔

”صبا.....“ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھ پکڑ کر گول گول گھومنے لگی وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ صبا بھی اس افتاد پر حیران تھی۔

”ارے چھوڑو اپنا میں گر جاؤں گی۔“ صبا کا سر چکرانے لگا۔

”صبا..... صبا..... میں بہت خوش ہوں تمہیں پتہ ہے۔“ وہ اسے چھوڑ کر بولی۔

”وہ تو لگ رہی ہو تم۔“ صبا بھی مسکرا دی۔ ”پھر ہوا کیا ہے؟“ وہ فرط اشتیاق سے بولی۔

”تایا ابو مان گئے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ میں خرم کی فیملی کو بلاؤں۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”مبارک ہوا پیا۔“ صبا نے مبارکباد دی۔

”میں ابھی بتاتی ہوں خرم کو۔“ وہ سیل فون تلاش کرنے لگی جبکہ صبا مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

”تم لوگ سوئے تو نہیں۔“ وہ زارا اور صوفی کے کمرے میں آ گئی۔ ”نہیں باجی آؤ۔“ زارا جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی صبا سے بولی جبکہ صوفی نے بھی کتاب منہ سے نکالی۔

”خوش خوش لگ رہی ہو تم باجی کیا بات ہے۔“ صوفی نے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بولی۔

”ہاں خوش ہیں یہ پتہ ہے ابو جی خرم کے رشتے کے لیے مان گئے ہیں اپنا بہت خوش ہے۔“ صبا بیک وقت دونوں کی طرف متوجہ تھی۔

”تو..... اس میں کون سی خوشی والی بات ہے یہ تو ہونا ہی تھا۔“ صوفی نے سر دھری سے کہا۔

”تو کیا ابو جی نے آج تک اپنا کی بات مانی ہے جواب مائل جاتے تو تم لوگوں کو کہیں سے یہ لگتا ہے کہ

ایپا اور کسی دوسرے کی پرواہ کرے۔ کرنا تو اس نے وہی ہوتا ہے جو اس کا دل کرتا ہے۔“ زارا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”بچی صبا جی جب کبھی وہ واقعہ یاد کرتی ہوں نا تو دل نہیں کرتا کہ ایپا کو دیکھوں کبھی۔ سہیل بھائی کا وہ اثر اہوا چہرہ نہ شہر مندگی وہ سب کے سامنے بے عزتی نہ جانے کیا کیا یاد آ جاتا ہے۔“ صوفی نے تاسف سے کہا۔ ”نہیں صوفی“ میں اس میں ایپا کی اتنی غلطی نہیں مانتی“ کچھ غلطی ہم سے بھی ہوئی ہے۔ ہم سب ہی اس کی نیچر سے اچھی طرح واقف تھے کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف بات برداشت نہیں کرتی اور میں نے کتنی دفعہ کہا تھا کہ ایپا سے بات کر لیں مگر اس وقت سب کو سر پرانز کی پڑی ہوئی تھی۔“ صبا نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے مانا غلطی ہماری بھی تھی مگر وہ اس وقت خاموش ہو جاتیں اور بعد میں آرام سے انکار کر دیتیں“ تو کم از کم اتنے لوگوں کے سامنے بے عزت ہونے سے توجہ جاتے ناں۔“ صوفی اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔ ”دیکھو صوفی ہم جانتے ہیں کہ وہ غصے کی تیز ہیں اور غصے میں وہ بالکل اپنا آپ کھودتی ہیں انہیں خود بھی نہیں پتہ ہوتا کہ وہ کس سے اور کیسے بول رہی ہیں اس وقت بھی انہیں غصہ آ گیا تھا تو وہ بے لحاظ بول پڑیں۔“ صبا نے تائید کی تھی۔

”چلو چھوڑو یہ بحث۔“ زارا بول رہی تھی۔

”ہاں بھئی ٹھیک کہہ رہی ہے یہ چھوٹی بھی۔“ صبا نے ہنس کر زارا کے سر پر چپٹ لگائی۔ ”ماضی کو بھلا لیں گے تب ہی مستقبل کو خوش آمدید کہہ سکیں گے اور حال میں جی پائیں گے۔“ صبا نے جذب سے کہا۔ ”باجی کبھی کبھی تو پوری فلاسفی لگتی ہو تم۔“ زارا نے صوفی کو آنکھ ماری۔ ”اچھا جی.....“ صبا ہنس دی اور زارا اور صوفی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔



”اچھا تو بتاؤ کہ پڑھائی کسی جا رہی ہے آج کان نہیں گئیں؟“

”بھابھی پیپر زہونے والے ہیں تو سوچا تیاری ہی کر لوں آج ویسے بھی ہفتے کا دن ہے اس دن پڑھائی نہ ہونے کے برابر ہی ہے۔“

”ہوں۔“ وہ مسکرا کر صحن میں لگے بیسن پر منہ دھونے کے بعد وہ کچن میں گئی اور گلاس میں پانی لا کر صحن میں موڑھے پر بیٹھ کر پیٹنے لگی۔ تب ہی زین آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔

”ارے تم اٹھ گئے ہو چلو اچھا ہے سارے مل کر ناشتہ کر لیتے ہیں ایک ہی بار۔“ بقیس بی بی ٹرے لینے آئیں۔

”لنناں آپ اتنا کام نہ کیا کریں۔ بلکہ اپنی جیتی بہو سے بھی کچھ کرا لیا کریں۔“ زین نے لنناں کے ہاتھ میں ٹرے دیکھی تو وہ مٹی کو چوٹ کر گیا۔ اس نے کاٹ داں نظروں سے گھورا۔ مگر زین نظر انداز کر گیا۔

”ارے بھائی یہ آپ کا لیٹر آیا ہے۔ زین نے دوپٹہ جو کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا وہ کھولتے ہوئے لیٹر زین کو تھما دیا

”میرا لیٹر.....“ زین نے حیرت سے لیٹر الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کھول لیا۔ لیٹر پڑھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”لٹاں یہ دیکھیں.....“ وہ خوشی سے ان کی طرف بڑھا..... ”کیا ہے زین بڑا خوش لگ رہا ہے۔“ بلقیس بی بی نے حیرت سے پوچھا زین اور منی کا حال بھی جہاں تھا۔

”لٹاں یہ میرا پائمنٹ لیٹر ہے۔“ وہ چلا یا۔ مجھے نوکری مل گئی لٹاں اور وہ بھی وہاں جہاں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ زین سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

”کیا واقعی.....“ بلقیس بی بی کی آواز میں حیرت تھی۔

”ہاں لٹاں اب ہمارے بڑے وقت ختم ہو گئے ہیں لٹاں اب ساری مصیبتیں ختم ہونے والی ہیں۔“ وہ خوش تھا۔

”یہ سب میری بہو کے نیک قدموں کی بدولت ہے۔ میں نے کہا تھا ناں زین تو پریشان نہ ہو ہر عورت اپنا رزق لے کر شوہر کی زندگی میں آتی ہے اور تم نے دیکھا کہ میری بہو کے آتے ہی تمہیں نوکری بھی مل گئی۔“ وہ منی کی طرف پلٹیں اور بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا جبکہ وہ ہونٹیں پیچھی تھی۔ میں سب سے پہلے شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔“ وہ کہہ کر آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اندر کو بڑھیں۔

”بھائی مبارک ہو۔“ زین بھی پر جوش تھی۔

”ہاں زین.....“ وہ خوشی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر زور سے گھما ڈالا۔

”ارے بھائی رکو۔ میں گر جاؤں گی۔“ زین چلائی۔

”زین میں بہت بہت خوش ہوں اللہ نے میری سلی اب تم دیکھنا تمہیں ٹیوشن نہیں پڑھانی پڑے گی اور نہ تمہیں اور اماں کو اب میں مشین پر بچھنے نہیں بھی نہیں دوں گا۔“

”ہوں.....“ وہ مسکرائی اور آنکھیں پونچھ لیں۔

”اری پگلی ابھی تو خوش ہونے کے دن آئے ہیں اور ابھی تم رورہی ہو؟“ زین نے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

”ہاں بھائی ہمارے گھر میں نہ جانے کتنے عرصے بعد خوشی آئی ہے بس یہ جان کر دل بھرا آیا ہے۔“

وہ دوبارہ نمی صاف کرتے ہوئے بولی۔

”چلو اب چپ کرو میں زیشان کو بتا دوں“ وہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھا۔

منی زین کو دیکھ رہی تھی مگر اس کا چہرہ ایک دم سیاہ تھا۔

”تھیک یو بھائی“ زین بڑھی اور منی کے گلے لگ گئی ”آپ ہمارے لیے بہت لگی ہیں بھائی آپ جانتی ہیں کہ بھائی کم و بیش ایک سال سے نوکری کے لیے در بدر پھر رہے تھے اور آپ کے آنے کے چند دنوں بعد ہی بھائی کو نوکری مل گئی۔ تھیک یو بس اگلیں۔“

وہ مسکرائی ”جو خدا اپنے لیے ان لگی ہو وہ دوسروں کے لیے لگی کیسے ہو سکتی ہے“ منی نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

☆.....☆

شام کو زیشان اور اس کی بیوی ایک لے کر آئے تھے۔

”بڑی بڑی مبارک ہو آئی آپ کو۔ اللہ کے کرم سے زین بھائی کو بہت اچھی نوکری مل گئی ہے آج صبح آئے تھے تو انہوں نے بتایا تھا“ شمسہ بولی۔

”ہاں بیٹا اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہماری سبلی۔“ بلقیس بی بی نے کہا۔  
 ”آنٹی یہ ہے کہاں؟ ذیشان نے زین کو نہ پا کر پوچھا۔ ہاں وہ مغرب پڑھنے گیا تھا آتا ہی ہوگا۔ انہوں  
 نے بتایا۔

”ہاں ٹھیک ہے“ ذیشان نے کہا اور موبائل پر مصروف ہو گیا۔  
 ”زرین اگر نماز سے فرغ ہوگئی تو ذیشان اور شمسہ کے لیے کچھ لاؤ بیٹی“ اماں نے کہا۔  
 ضحیٰ ابھی سوکر اٹھی تھی وہ بھی نیچے آگئی تھی۔  
 ”آنٹی مجھے بھابھی سے تو ملا دیں میں ابھی تک ملی نہیں ہوں“ شمسہ بیقراری لگ رہی تھی۔  
 ”ہاں بھئی کہاں تھیں تم اتنے دنوں بعد آئی ہو تم بھلا تمہیں تو نکاح کے اگلے دن ہی آ جانا چاہیے تھا۔“  
 ”بس آنٹی مجھے اندازہ ہی نہیں تھا اور ذیشان نے بھی نہیں بتایا تھا کہ زین بھائی کی شادی ہے۔ ایک دم  
 اچانک ہی اس نے خبر دی پہلے تو میں حیران رہ گئی بھلا ایک دم اچانک کیسے.....“ وہ حیرانی سے بولی۔  
 بلقیس بی بی نے گہرا سانس لیا اور بولیں ”ہاں بیٹا بس حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔“  
 آنٹی ایسا بھی کیا ہو گیا تھا میں نے ذیشان سے فون پر پوچھا تھا میں دراصل ملتان گئی ہوئی تھی ناں۔ وہ  
 تفصیل سے بولی۔

”تو ذیشان نے کہا کہ اس کے تایا ابو کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی بس اس لیے جلدی جلدی نکاح کرنا  
 پڑا۔“ شمسہ نے بتایا

اور ایک دم بلقیس بی بی نے مشکور نظروں سے ذیشان کو دیکھا تو وہ دھیسے سے مسکرا دیا۔  
 ”ہاں بیٹا حالات ہی ایسے تھے۔“ وہ بولیں۔  
 ”چلو بھئی اب بس بھی کرو اب آگئے ہیں ناں تو تم بھابی سے مل لینا“ ذیشان نے شمسہ کو روکا۔  
 ”ہاں آنٹی کہاں ہیں وہ ملائیں ناں“ وہ ایک دم بولی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں وہ ہمیں ہے میں بلاتی ہوں“ وہ خوشدلی سے بولیں۔  
 ضحیٰ کچن میں چلی آئی تھی وہاں زین چائے کپوں میں ڈال رہی تھی کیک بھی اس نے کاٹ کر پلیٹ میں  
 رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی دوسرے لوازمات بھی تھے۔

”ہاں وہ ذیشان بھائی اور شمسہ بھابھی آئی ہیں۔ اندر اماں کے ساتھ ہیں۔“ وہ مصروف انداز میں بولی۔  
 ”آپ بھی آئیں نا“ وہ بڑے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”میں..... میں آکر کیا کروں گی؟“ وہ گلاس منہ کو لگاتے ہوئے بولی۔  
 ”لو بھلا آ کر کوآپ کے سپاں کوٹو کری ملی ہے کوئی ٹول ہے۔“ وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ ضحیٰ کچھ بولتی زین بھی آ گیا۔  
 ”ہاں بھئی تیاری شیری ہوگئی ہے۔ ذیشان کا فون آیا تھا وہ آنے والا ہوگا۔“ وہ ٹوٹی اتار کر بولا۔

”وہ آگئے ہوئے ہیں کب کے اندر ہیں آپ چلیں میں لا رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی اور بڑے لے کر چل  
 دی۔

”آپ بھی آئیں بھابھی آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔“





زین صحنی سے مخاطب ہوا "اور پلیز یہ چائے کی ٹرے بھی لے آئیے گا" زین دوسرے لوازمات تو لے گئی ہے۔ "وہ پانی پی کر صحنی سے کہہ کر نکل آیا۔

جاؤں کہ نہ جاؤں ابھی وہ اسی کشمکش میں تھی کہ زین چائے لینے آ گئی۔

"ارے بھابھی ابھی تک یہاں کیا کر رہی ہیں چلیں۔" وہ اسے کندھے سے دھکیلتے ہوئے چائے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جب اندر داخل ہوئی تو سارے قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔

"آؤ بیٹا تم کہاں رہ گئی تھیں" بلقیس بی بی نے مسکرا کر کہا۔

"ارے بھابھی السلام علیکم!" ذیشان ادباً کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام" وہ سپاٹ چہرے سے بولی۔

"میں زین کا اکلوتا دوست ہوں اور یہ میری زوجہ ہیں۔" وہ شمسہ کی طرف دیکھ کر شرارت سے بولا

"اہوں..... بھئی یہ مشکل اردو نہ بولا کریں۔" وہ چڑ گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ آگے بڑھی اور صحنی کے گلے لگ گئی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں" وہ مسکرائی۔

"آہیں نا آپ..... میں کب سے آپ کی منتظر تھی ایک تو اتنی جلدی جلدی زین بھائی نے شادی کر لی میں اس شہر میں نہیں تھی ورنہ اچھی طرح خبر لیتی۔" اس نے زین کی طرف دیکھا اور صحنی کو پکڑ کر زین کے ہمراہ بٹھادیا بیٹھے ہوئے صحنی کا کانڈھا زین سے مس ہوا تو وہ محسوس طریقے سے پرے کھسکی جبکہ زین بھی سر کا تھا۔

"آنے والے یقیناً سب بے تکلف تھے۔" اس نے سوچا۔

"بھائی بھائی اگر آپ مجھے ایک دن پہلے بتا دیتے ناں تو میں یقیناً آپ کا نکاح اٹینڈ کر کے ہی ملتاں جاتی" وہ شکایت کرتے ہوئے بولی۔

"بھائی میں آپ کو بتاتا تو تب ناں جب مجھے خود کو بھی اندازہ ہوتا کہ اگلے دن میری زندگی بدلنے والی ہے اور مجھے اگلے دن کسی کا غلام بنایا جا رہا ہے" وہ مظلومیت سے بولا۔ سب نے قہقہہ لگایا البتہ صحنی نے پہلو بدلا۔

اس نے نیکی نظروں سے زین کو دیکھا وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

بھئی بس کر دو بیگم اب چائے پی لو ورنہ زین کو دوبارہ بنانی پڑ جائے گی" ذیشان نے اس کے گلے شکوں کو بریک لگایا۔

"کوئی بات نہیں بھائی میں دوبارہ بنا دوں گی بھابھی آپ کل نہ کریں اور ٹھیک طرح سے زین بھائی کی کلاس لیں۔" زین نے کہا۔

"جیتی رہو میری نند" وہ اس کی کمر تھپتا کر بولی "اللہ تمہیں زبردست سا باندہ دے شادی کے لیے" وہ مسکرائی جبکہ زین کے چہرے پر ایک سایہ سالہرا گیا۔

جس کو بلقیس بی بی زین اور صحنی تینوں نے محسوس کیا۔

"آمین" زین نے زیر لب کہا۔

☆.....☆

"اماں اللہ کے کرم سے صحنی تو اپنے گھر کی ہو گئی اب ہمیں صبا کے لیے بھی کوئی رشتہ دیکھنا چاہیے دونوں

دوسرے 214

تقریباً ہم عمر ہی تو ہیں۔“ سبزی کاٹتے ہوئے روبینہ بیگم نے اپنی ساس سے کہا۔  
 ”ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو اللہ کا کرم ہے جی کے معاملے میں اس نے عزت رکھ لی ورنہ اُس لڑکی نے تو  
 کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی عزت نیلام کرنے میں۔“ وہ بھی ان کی مدد کرتے ہوئے بولیں۔  
 ”ہاں اماں پہلے مجھے زین کو لے کر دھڑکا لگا ہوا تھا مگر اب جتنا شکر ادا کریں کم ہے بڑا ہی سلجھا ہوا اور  
 شریف لڑکا ہے اور رہی بات اس کی وہ غلطی تو آج کل جو ملک کے حالات جارہے ہیں تو اس میں تو لڑکے  
 بڑے سے بڑا قدم اٹھا لیتے ہیں وہ بیچارہ نہ جانے کتنا بھوکا ہوگا جو اس وقت اس گھر میں گھسنے کی غلطی ہو گئی تھی۔“  
 روبینہ بیگم نے انفسوس سے کہا۔

”چھوڑو بیٹا رہنے دو مجھے تو لگتا ہے کہ اللہ نے ہی اس سے وہ قدم اٹھوایا تھا کہ ہماری بچی ان لالچی  
 لوگوں کے ہاتھ سے بچ گئی۔ چلو چھوڑو بس۔ میں ان دنوں کے بارے میں بالکل نہیں سوچتا چاہتی۔ بڑا کڑا  
 وقت تھا ہمارے لیے۔“ انہوں نے تاسف سے کہا۔  
 ”اچھا کوئی رشتہ وغیرہ ہے کیا صبا کا تمہاری نظر میں؟“ وہ موضوع بدل کر بولیں۔  
 ”کس کے رشتے وغیرہ کی بات ہو رہی ہے بھئی!“ صوفی بھی چائے کا کپ بچن سے لا کر بولی۔  
 ”تم فکر نہ کرو لڑکی تمہارے رشتے کی بات بالکل نہیں ہو رہی۔“ دادی نے ایک چپت اس کے سر پر لگائی تو  
 اس کی عینک گرتے گرتے بچی۔  
 ”ہائے دادی میری عینک چائے میں ڈبکی مار لیتی۔“

”اچھا چل میرے لیے بھی چائے لاموسی سردی بڑی لگ رہی ہے اور بیڑ بھی جلا دو۔“ وہ اسے اٹھاتے  
 ہوئے بولیں۔

”یہ بھی لے جاؤ اور برکتے سے کہو کہ سالن چڑھا دے۔“ روبینہ بیگم بھی اسے ٹوکری تھماتے ہوئے بولیں۔  
 ”ہاں بہو بتاؤ کوئی رشتہ ہے نظر میں؟“ وہ چادر لپیٹ کر بولیں۔

”جی اماں صبا کی خالد کا سب سے بڑا بیٹا ہے نا عظیم باجی نے اس کے لیے بھی کہا تھا اور میرے بھائی ہیں نا  
 اسلام آباد والے وہ بھی اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے کہہ رہے تھے میرے لیے تو دونوں ہی مناسب ہیں بس میں  
 چاہ رہی تھی کہ آپ سے اور ملک صاحب سے مشورہ کر لوں اور صبا کی بھی رائے لے لوں آخر کو زندگی تو اس نے  
 گزارنی ہے ناں؟“ وہ بولیں۔

”تم غیث سے بات کر لو میرے لیے تو دونوں ہی دیکھے بھالے ہیں۔“ وہ بولیں۔

”جی آج ہی بات کر لوں گی۔“ وہ بولیں۔

رات کو انہوں نے ملک صاحب سے بھی بات کی تھی انہوں نے بھی فیصلہ ان پر ہی چھوڑ دیا تھا اب بس  
 انہوں نے صبا سے بات کرنی تھی۔

اگلے دن ہی انہوں نے صبا سے دونوں رشتوں کے لیے رائے مانگی تھی۔

”ای جی آپ جو فیصلہ کریں گی ٹھیک ہی ہوگا۔“ وہ بیڈ شیٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا زندگی تمہیں گزارنی ہے میں نے نہیں چلو اچھا تم مجھے بتا دو تم کس سے شادی کرنا چاہو گی آخر کو تمہاری  
 بھی تو مرضی ہوگی نا؟“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

وہ چند لمحے خاموش رہی تھی پھر بولی ”اگر مناسب سمجھیں تو خالہ کو ہاں کر دیں“ وہ مر جھکا کر بولی۔  
 ”یہ ہوئی نابات“ وہ بڑھ کر اس کا ماتھ چوم کر بولیں۔

☆.....☆

وقت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی اس کی شادی کو مہینہ بھر ہی ہوا تھا مگر اسے لگتا تھا کہ وہ صدیوں سے اس خستہ حال مکان میں رہ رہی ہے۔ وہ صحیح طور پر اس ماحول اور گھر والوں کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ ساری ساری رات وہ سوچتے گزر دیتی کہ وہ کس طرح یہاں رہے گی۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ سب کچھ جس طرح ہے اسے قبول کر لے پھر ایک دم بغاوت سر اٹھاتی اور کہتی کہ زندگی تمہاری ہے تم خود مختار ہو پھر کس بات کا ڈر ہے جیسے چاہو جیو۔

کبھی کبھی اسے زین پر شدید غصہ آ جاتا تو کبھی وہ ملک صاحب پر برے لگتی درحقیقت وہ اپنے آپ سے جنگ کر رہی تھی۔

اب بھی وہ بیٹھی دوپٹے کے دھاگوں سے کھیلتی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ پاس ہی زین اور اس کے بچے ٹیوشن میں مصروف تھے جبکہ اماں آرام کر رہی تھیں اور زین آفس سے نہیں آیا تھا۔  
 ”اللہ اس سوال کا تو جواب نہیں آ رہا ہے لیجئے تم آج گائیڈ نہیں لائی ہو“ زین حساب کے سوال سے تنگ آ کر بولی۔

”نہیں باجی آپ نے ہی تو کہا تھا کہ یہاں گائیڈ نہ لایا کرو“ علیہ مسکراتے ہوئے بولی جیسے زین کا مذاق بنا رہی ہو۔

”ہاں کہا تو میں نے ہی تھا مگر اس سوال کا جواب پیچھے دیے گئے جوابات سے صحیح نہیں ہو رہا ہے“ زین پین منہ میں لے کر بولی۔

وہ مسلسل اسے حل کرنے میں کوشاں تھی۔ بار بار ناکامی ہاتھ لگ رہی تھی اس نے چڑ کر زور سے کتاب پٹخ دی۔ ”بھاڑ میں جائے یہ کبخت سوال اب تو میں اس کو حل نہیں کر رہی ہوں“ وہ منہ بسور کر بولی۔ علیہ ہنسنے لگی۔  
 ”تم کیوں دانت نکوس رہی ہو ہاں“ وہ غصے میں علیہ کو ڈانٹ کر بولی۔  
 ”ضمیمہ بھی متوجہ ہو گئی۔“

”کیا ہوا ہے؟“ وہ زین سے بولی۔  
 ”بھابھی یہ انٹر کا میٹھس ہے اس کا یہ سوال مجھ سے حل نہیں ہو رہا ہے میں بار بار کوشش کر چکی ہوں“ وہ منہ پھلا کر کتاب آتے کرتے ہوئے بولی۔  
 ”لاؤ دکھاؤ ادھر“ اس نے کتاب آگے کی۔

”ذرا مجھے کاپی اور پین دو“ وہ سوال دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے حل کرنا شروع کر دیا۔  
 زین بڑے دھیان سے اسے سوال حل کرتا دیکھ رہی تھی ”کیلکولیٹر دینا“ اس نے مصروف انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا جبکہ سر کاپی پر ہی جھکا ہوا تھا زین نے کیلکولیٹر تمنا دیا۔ ضحیٰ نے وہ سوال پانچ منٹ میں حل کر دیا۔  
 ”دیکھو یہی ہے جواب“ وہ کاپی آگے کرتے ہوئے بولی۔

”جی بھابھی Exactly یہی جواب ہے“ وہ خوشی سے بولی۔

”میں تو کر کے تھک گئی تھی مگر آپ نے تو چند منٹوں میں ہی حل کر دیا۔“ وہ جوش اور خوشی کے طے طے جذبات سے بولی۔

”ہوں“ صحتی نے صرف اتنا کہا اور گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔  
 ”چلو میچہ تمہارا کام تو ہو گیا اب میری پیاری بھائی کو کھینکس کہو۔“ وہ اپنی شاگرد سے بولی۔  
 ”تھیک یو بھائی!“ میچہ اپنی کاپی لیتے ہوئے بولی۔ صحتی ہلکا سا مسکرا دی۔  
 ”بھابھی واہ بھی آپ کا تھکس تو کمال ہے۔“ زرین بچوں کو چھٹی دے کر صحتی کی طرف متوجہ ہوئی۔  
 صحتی خلاؤں میں گھورتی ہوئی تھی ایک دم چوٹی۔  
 ”ہوں“ صحتی ہنکاری۔

”بھابھی کبھی موقع ہی نہیں ملا کہ پوچھوں آپ کی ویسے کو الیفیکشن کیا ہے۔“ زرین پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

”میں نے تھکس میں ماسٹرز کے پیپر زدے تھے۔“ مختصر جواب دیا۔  
 ”واؤ بھائی زبردست!“ زرین متاثرانہ لہجے میں بولی۔  
 ”آپ کا رزلٹ نہیں آیا ابھی تک ماسٹر کا۔“  
 ”نہیں آنے ہی والا ہی ہوگا“ وہ متوجہ ہوئی۔  
 ”بھابھی اتنا بڑا بیک سیٹ ہے تھکس آپ نے کیسے پڑھ لیا اسے“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔  
 صحتی اس کی شکل دیکھ کر مسکرا دی۔ ”مجھے تھکس پسند ہے اس لیے پڑھ لیا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔  
 ”ہاں یہ تو ہے۔ اگر کوئی چیز انسان کو پسند ہوں تا تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“  
 ”ہاں اور تا پسندیدہ چیزوں کو ڈھونڈنا برا مشکل ہوتا ہے۔“ صحتی نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔  
 زرین اس کے لہجے پر چوٹی مگر خاموش رہی۔

”چلیں میں چائے بنا رہی ہوں بھائی بھی آنے والے ہی ہیں“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔  
 ”آپ کی بناؤں بھابھی چائے؟“ جاتے جاتے وہ اس کی طرف ہلٹی اور پوچھا۔  
 ”ہاں بنا دو مگر آدھا کپ“ صحتی نے آہستگی سے کہا۔  
 زرین مسکرا کر اٹھ گئی تو وہ سامنے پودوں کو دیکھنے لگی۔

شام کے وقت وہ ہنزہ عجیب ساحر خمیر رہا تھا مویسے اور گلاب کی خوشبو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔  
 شام کے وقت پرنندوں کی چچہا ہٹ اسے سکون دے رہی تھی وہ آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ سر لگا کر بیٹھ گئی۔

”ارے بھائی آپ کب آئے؟“ زرین کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں زرین بڑی محویت سے سامنے والی کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنی دلچسپ لگ رہی تھی وہ بہت سادگی میں وہ اس پر سکون گونشے کا ہی حصہ معلوم ہوتی تھی۔

”ہوں بس کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں۔“ وہ ایزی ہوتے ہوئے مسکرا دیا۔  
 ”دیکھیں مجھے پتہ تھا کہ آپ آ رہے ہیں اسی لیے چائے بنا لی“ وہ کپ اسے تھماتے ہوئے بولی۔



”جی رہو زین اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے“ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔  
 مٹی بالکل لائق بیٹی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کا انگ انگ زین کو دیکھ کر بیزاری ظاہر کرتا تھا۔

”بھابھی آپ کا کپ“ زین نے ٹرے آگے کی۔ مٹی نے چپ چاپ کپ تھام لیا۔  
 زین اپنا کپ لے کر مٹی کے ساتھ چوڑی مار کر بیٹھ گئی۔  
 ”پتہ ہے بھائی آپ کو بھابھی کا مقصد کتنا کمال ہے“ زین پر جوش تھی۔  
 ”بھئی نہیں کیسے پتہ چلے گا کہ آپ کی بھابھی میں کتنی خوبیاں ہیں یہ ہمیں پتہ کرنے ہی نہیں دیتیں۔“  
 زین چائے کا کپ لبوں کو لگاتے ہوئے بولا۔ جبکہ مٹی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”بھائی بھائی نے سوال پانچ منٹ میں ہی حل کر دیا۔ وہ سوال مجھ سے آدھے گھنٹے سے حل نہیں ہو رہا تھا۔“  
 بھابھی نے چٹکی بجاتے ہی حل کر دیا وہ چٹکی بجا کر بولی۔

”واقعی؟“ وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔  
 ”جی ہاں میری بھائی کوئی ایسی ویسی نہیں ہیں بڑی کمال ہیں وہ“ وہ کندھے اکڑا کر بولی۔  
 ”اماہا“ زین کا قہقہہ بلند ہوا۔  
 جبکہ مٹی کے ہونٹوں پر ہلکا سا ہنس بکھر گیا اس کے معصومانہ انداز پر۔  
 زین کی شرارتی آنکھوں نے اس ہنس کو بڑی محویت سے دل میں اتارا۔  
 یہ لڑکی خاموش اور بیزار رہ کر بھی اس کے دل کے تاروں سے کھیل جاتی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا چائے پینے لگا۔

☆.....☆  
 ”باجی آپ کا اور ایسا کارڈ لٹ کب آئے گا تین سینے ہو گئے ہیں“ عبدالرحیم رات کے کھانے پر صبا سے بولا۔

”ہوں بس اگلے ہفتے تک آئے گا۔“  
 ”واہ جی واہ اگلے ہفتے رزلٹ اور اس سے اگلے ہفتے باجی کی منگنی بھی یہ مہینہ تو بڑے مزے میں گزرے گا۔“  
 زارا خوش ہو کر بولی۔

”جی اور منگنی کے تین دن بعد میرے پیپر میرا تو اور ہی اچھا ہو گیا“ صوفی منہ پھلا کر بولی۔  
 ”بھئی میں نے کہا بھی تھا کہ میرے پیپر کے بعد یہ کھڑا رکھ لیں مگر میری کوئی سنا ہی نہیں ہے پتہ بھی ہے کہ میری پڑھائی کتنی ٹھ ہے“ وہ رونے لگی۔  
 بیٹا ہم نے کوشش تو کی تھی ناں مگر باجی نے کہا کہ منگنی کے دو دنوں بعد ہی عظیم کو آفس کی طرف سے ٹریننگ پر جانا ہے وہ چھ ماہ بعد آئے گا پھر شادی کر لیں گے۔ چلو کوئی بات نہیں تم منہ نہ بسورؤ“ روبینہ بیگم نے پیار سے اس کی کمر سہلائی۔

زارا صبا اور عبدالرحیم تینوں دبی دبی ہنسی رہے تھے عبدالرحیم بار بار اس کی نقل اتار رہا تھا۔  
 دادی ابو اور روبینہ بیگم بھی مسکرا دیے۔

صوفی کی نظر اس پر پڑی تو چڑ کر بولی ”ابو جی دیکھیں بھائی میری نقل اتار رہے ہیں“

وہ عبدالرحیم کی شکایت لگاتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی آنسو صاف کیے۔

عبدالرحیم! ملک صاحب نے سخت آواز میں کہا۔

’جی ابو جی!‘ عبدالرحیم سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

ٹیرس پبلک صاحب ہنسل رہے تھے انہوں نے موبائل نکالا اور نمبر ملانے لگے۔

وہ سچی کے لیے کافی پریشان تھے وہ جب آئی تھی دعوت میں تو اس کا رویہ اکھڑا اکھڑا تھا اس نے ان سے

بھی بات نہیں کی تھی اور یہ بات ان کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ دوسری طرف کال ریسیو کر لی گئی تھی

”علیکم سلام بیٹا۔ زین مجھے کل آفس میں آکر مل سکتے ہو۔“ انہوں نے مختصر کہا۔

”خیریت!“ وہ تشویش سے بولا۔

”ہاں ہاں بیٹا بالکل خیریت ہے“ وہ مسکرائے۔

”اوکے میں شام آفس سے واپسی پر آؤں گا۔“

”اوکے بیٹا اللہ حافظ“ انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆.....☆

آج موسم بڑا ابر آلود تھا وہ شام میں سو کر اٹھی تو کالی گھٹانے سارے آسمان پر قبضہ جمالیا تھا۔ یہ موسم اسے

اندر ہی اندر پریشان کر دیتا تھا دیکھتے ہی دیکھتے بارش برسنے لگی تھی۔

”اگلی بارش میں ہم دونوں ساتھ ہوں گے“ آواز کہیں قریب ہی گونجنے لگی۔

گرم گرم آنسو ایک تواتر سے رخساروں پر بہہ نکلے۔ آوازیں اب بھی گونج رہی تھیں اس نے گھبرا کر

دونوں ہاتھوں سے دونوں کان بند کر لیے اور پھر گھڑکی سے ہٹ کر واپس بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے

دونوں ہاتھ بیڈ پر مضبوطی سے گڑے تھے اور وہ ہر جھکائے بیٹھی تھی۔

”بھابی..... بھالی آپ اٹھ گئی ہیں کیا“ زین آنکھیلیاں کرتی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے وہ اپنی کمزوری ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ارے بھابی! انھیں نا دیکھیں کتنی تیز بارش ہو رہی ہے اور آپ اب تک اندر ہی بیٹھی ہیں۔“

وہ پوری طرح بارش میں بھیگی ہوئی تھی اس لیے کمرے کی دہلیز پر ہی رک گئی۔

”مجھے بارش پسند نہیں ہے“ وہ منہ موز کر بولی جو بارش کی دیوانی تھی جو بارش میں نہانے کے لیے اپنے

سارے کام چھوڑ دیتی تھی جو دوسروں کو کھینٹ کھینٹ کر لاتی تھی کہ وہ اس انجوائے کریں اور اب کہہ رہی تھی کہ

مجھے بارش پسند نہیں ہے۔

”بھابی! آئیں دیکھیں تو سبھی بہار کی آمد کی بارش ہے آجائیں بڑا مزہ آئے گا“ وہ بار بار منہ باہر کی طرف

کر رہی تھی۔

”جاؤ زین میرے سر میں درد ہے“ وہ ذرا سختی سے بولی۔

”چلیں آپ کی مرضی“ اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ واپس پلٹ گئی۔

”ارے زین بارش میں نہ بہاؤ ابھی سردی کا اثر پوری طرح ٹوٹا نہیں ہے بیٹا کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔ چلو آؤ

اندر۔ اماں عصر پڑھ کر فارغ ہوئیں تو دیکھا کہ زین باہر صحن میں بچوں کی طرح اچھل رہی ہے۔

سو فیروزہ 219

”اماں مزہ آ رہا ہے“ وہ اچھلتے ہوئے بولی۔

”اچھا چائے تو بنا لو شام کی“ وہ ہار مانتے ہوئے بولیں جانتی تھیں کہ وہ نہیں مانے گی۔

”اماں آج آپ بنا لیں اور ہاں پکڑے بھی بنائیے گا کل جو پودینے کی چٹنی بنائی تھی اماں کے ساتھ بڑا لطف دے گی“ وہ مسلسل چھلانگیں مار رہی تھی۔

اچھا چلو میں ہی بنا لیتی ہوں۔“ وہ مسکرا کر اس کی نظر آنکھوں ہی آنکھوں میں اتارتے ہوئے بولیں۔

”اللہ میری بچی کی معصومیت اور خوشی کو ہمیشہ قائم رکھنا اور اس کے لیے کوئی اچھا بر بھی عطا کرنا۔“ وہ ڈھیر دل دعائیں دل میں کرتی بچن میں جا گھسیں۔

”واہ اماں مزہ ہی آ گیا کیا خوش ہو آ رہی ہے!“ زین بھی ہیکلتا ہوا آیا تھا اس نے موٹر سائیکل کو کھڑا کیا جو اس نے پچھلے ہفتے ہی لی تھی۔

”اماں میں جلدی سے کپڑے بدل لوں آپ فوراً چائے اور پکڑے لے آئیں بڑی بھوک لگ رہی ہے“ وہ اندر گھستے ہوئے بولا۔

”لارہی ہوں بیٹا تم ذرا جلدی سے آ جاؤ۔“ وہ بچن سے بولیں۔

ضحیٰ کو ساری آوازیں آ رہی تھیں۔

”ان کے ساتھ بھی تو حالات میرے حالات سے مختلف نہیں ہیں پھر یہ سب اتنے مطمئن اتنے پرسکون کیوں ہیں۔ زین کی بھی تو مگنی ختم ہوئی اور زین کی بھی تو پھر یہ اداس اور ناراض کیوں نہیں ہیں۔“ ایک دم اندر سے آواز اٹھی۔

”جاذرین بھابی کو بھی لے آ۔“ اماں نے تخت پر گر کر گرم پکڑے چائے اور چٹنی رکھی تو بولیں۔

”اماں وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کے سر میں درد ہے۔“ زین نے پکڑا منہ میں رکھا۔

”رہنے دیں اماں اگر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تو رہنے دیں۔“ زین نے کہا اور چائے پینے لگا جبکہ نظریں اس کی اوپر کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔

☆.....☆

”امی جی..... داوی دیکھیں میرا اور اپنا کارڈ لٹ آ گیا ہے۔“ صبا دوڑتی ہوئی نیچے آئی تھی وہ بہت پر جوش تھی

”آرام سے لڑکی گر جائے گی۔“ اسے یوں دوڑنا دیکھ کر داوی دہل گئیں۔

روینہ بیگم بھی آواز سن کر کمرے سے نکلیں اور زارا اور عبدالرحیم بھی لاؤنج میں آ گئے۔

”کیا بنا باجی کتے بجیکلش میں اڑ گئی ہو“ عبدالرحیم مزے سے بولا۔

”دھب.....“ صبا نے اس کی کمر پر ایک دھب رسید کی ”تمہارے منہ میں خاک میں کیوں اڑنے لگی بھلا۔“

الحمد للہ اے گریڈ میں میں نے ماسٹر کیا ہے۔“ صبا گردن اکڑا کر بولی۔

”اور اپنا کیا کیا؟“ زارا پر جوش اٹھی۔

”ہاں امی جی داوی ماشاء اللہ ہماری اپیا کی پوری یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن آئی ہے“ صبا نے بتایا۔

”واقعی باجی“ زارا نے حیرت سے منہ کھولا۔

”ہاں بھی ہماری اپیا ہے ہی بڑی لائق اوپر سے ان کا فیورٹ سبجیکٹ۔ کارنامہ تو مارنا ہی تھا ہاں۔“ وہ

دادی کے ساتھ بیٹھے ہوئے بولی۔

”چلو ماشاء اللہ دونوں بچیاں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی ہیں۔“ دادی نے خدا کا شکر ادا کیا اور صبا کو بوسہ دیا ساتھ ہی مبارکباد بھی دی، امی زارا اور عبدالرحیم نے بھی مبارکباد دی۔

”چلو اچھا ہوا کہ پاس ہو گئیں ورنہ سرالیوں کے سامنے ہمیں شرمندہ ہونا پڑتا۔“ عبدالرحیم نے ایک بار پھر چیخڑا تو صبا نے پاس پڑا کٹن دے مارا جو اس نے پھرتی سے کچھ کر لیا۔

”اچھا میں ابھی اپنا کو بتاتی ہوں۔“ زارا اٹھتے ہوئے بولی۔

”کیسے بتاؤ گی ایسا کہ پاس موبائل نہیں ہے اور گھر میں ان کے فون نہیں لگا ہوا۔“ صبا نے یاد دلایا۔

”ہاں یہ تو ہے“ زارا دوبارہ بیٹھ گئی۔

”تم لوگ شام کو چلے جانا سارے بچے لکڑ خوری بھی سنا دینا اور اس کا حال بھی پوچھ لینا۔“ دادی نے کہا

”ہاں دادی یہ ہوئی نابات۔“ عبدالرحیم ایک دم بول پڑا۔

”زارا نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔“ چکر کیا ہے بھائی بڑے پر جوش ہو رہے ہو۔“ اس نے ابرو اچکا کر

پوچھا۔ باقی بھی متوجہ ہوئے۔

”کچھ نہیں ہوا تم بھی نا!“ عبدالرحیم نے گردن ہلائی۔

”ہوں..... زارا نے ہوں پر زور دیا۔

”چلو شام کو چلیں گے جب تک صوفی بھی آ جائے گی۔“ صبا نے کہا۔

”ٹھیک ہے مٹھلی یا ایک وغیرہ لے جانا“ تحفہ بعد میں دے دیں گے“ روبینہ بیگم نے کہا۔

”جی امی جی.....“ صبا نے کہا۔

☆.....☆

”ارے آپ سب.....“ زارین نے دروازہ کھولا تو سامنے سب کو دیکھ کر مسکرا دی اور اندر آنے کی جگہ دی۔

عبدالرحیم کے علاوہ تینوں نے حیرانی سے گھر کو دیکھا۔ پرانے زمانے کا بنا ہوا گھر کی حالت کافی خستہ تھی۔

وہ ڈبوڑھی سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔

”کیسے ہی آپ سب لوگ؟“ وہ بہت خوش لگ رہی تھی وہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں

لے آئی۔

”ہم سب ٹھیک ہیں آپ سناؤ کیسی ہو؟“ صبا نے سب سے پہلے تاثرات بہتر کیے اور خوش اخلاقی سے

بولی۔

”اللہ کا کرم ہے آپ سب بیٹھیں میں امی اور بھائی کو بلاتی ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

”باجی اپنا یہاں رہ کیسے رہی ہے؟ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا اس گھر کی حالت دیکھ کر۔“ زارا نے سادہ سے

ڈرائنگ روم پر نظر دوڑائی جہاں صرف ایک صوفہ سیٹ تھا۔

”واقعی باجی پتہ ہے کہ ایسا نے اپنی چیزوں کے معاملے میں بہت چوڑی ہے کافی سلیکٹیو رہی ہے وہ ہمیشہ

..... اور وہ اس گھر میں رہ رہی ہے۔“ صوفی بھی حیرت زدہ تھی۔

”چلو چھوڑو یہ سب تم لوگ اور اپنا سے بہت نارل انداز میں ملنا۔“ عبدالرحیم نے جھڑکا تو وہ خاموش



ہو گئیں۔

”بھابی آپ کے گھر والے آئے ہیں جلدی کریں وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ زرین و اش روم کے باہر کھڑے ہو کر بولی اور بچن میں انتظام کرنے چل دی تھی اماں کو وہ پہلے ہی بتا چکی تھی ساتھ ہی اس نے زرین کو بھی فون کر دیا کہ لوازمات بھی ساتھ لیتا آئے اور جلدی آ جائے۔

وہ نہا کر نکلتی تو فریش محسوس کر رہی تھی۔ بالوں کو جھٹکنے کے بعد وہ اندر آئی جہاں بلقیس بی پہلے ہی سے موجود تھیں وہ حیرانی سے آگے آئی ”تم سب لوگ.....؟“ مہمانے ایسا کو دیکھا تو تیزی سے بڑھی۔

”ایسا..... مبارک ہو تمہیں۔“ وہ جلدی سے اس کے گلے لگ گئی۔

”کس بات کی مبارکباد؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”تمہاری دوسری پوزیشن آئی ہے ماسٹرز کے سپر ز میں۔“ وہ پر جوش تھی۔

”واقعی..... تم جچ کھ رہی ہو۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”جی ایسا بالکل سچ کہہ رہی ہے باجی“ صوفی بھی بڑھی اور گلے لگ گئی پھر زار اور عبدالرحیم نے بھی مبارکباد دی۔

”اللہ تیرا شکر ہے میری محنت و صول ہو گئی وہ خوش تھی نہ جانے کتنے دنوں بعد شاید بیٹوں بعد اسے خوش ملی تھی۔“

”تمہارا کیا بنا؟“ وہ صبا کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بھئی ہم بھی اے گریڈ میں کامیاب رہے ہیں۔“ وہ فرضی کالر جھاڑ کر بولی۔

”مبارک ہو تمہیں بھی۔“ وہ اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

”مبارک ہو بیٹا اللہ تمہیں ہزاروں خوشیاں دے۔“ بلقیس بی نے مبارکباد دی جسے مسکراہٹ کے ساتھ جھٹی

نے قبول کیا اور تمہیں بھی صبا بیٹے۔ وہ صبا کو دیکھ کر بولیں۔

”شکریہ آئی!“ وہ مسکرائی۔

اتنے میں زرین مشروب لے آئی۔ اس نے سرو کیا۔ ”میں نے سب سن لیا بھابی۔ بہت بہت مبارک ہو

آپ کو۔ میں تو پہلے ہی جان گئی تھی کہ میری بھابی جینس ہیں۔“ وہ جھٹی کے گلے لگی۔

”جینس زرین۔“ جھٹی مسکرائی۔

”آپ کو بھی مبارک ہو صبا باجی۔“ اس نے گلے لگ کر مبارکباد دی۔

”زرین کو بتا دیا کہ جلدی آئے۔“ اماں نے پوچھا۔

”جی اماں بتا دیا ہے بس آتے ہی ہوں گے۔“ زرین نے کہا۔

”گھر میں سب ٹھیک ہیں بیٹا۔“ بلقیس بی نے پوچھا۔

”جی آئی سب ٹھیک ہیں آپ کو اور اپنا کو مبارکباد دے رہے تھے۔“ عبدالرحیم نے ادا کیا۔

”خیر مبارک..... خیر مبارک میری طرف سے بھی آپ کو اور اپنے والدین کو مبارکباد دیتا۔“

”جی آئی ضرور!“ عبدالرحیم نے کہا اور ساتھ بیٹھی زرین پر بچی نظر ڈالی جو پوری طرح لڑکیوں کی طرف

متوجہ تھی عام سے سوٹ میں سر پر دوپٹہ سجائے وہ بہت پاکیزہ لگ رہی تھی۔

زرین جب صوفی اور زارا کے ساتھ مصروف ہوئی تو صبا نے جھٹی سے پوچھا۔

دو شہزادے

”ایسا تم ٹھیک تو ہونا یہاں؟“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔  
 ”تمہیں کیا لگتا ہے۔“ اس نے الٹا اس سے سوال دانا۔ صبا چپ رہ گئی۔  
 ”تین مہینے ہونے کو آئے ہیں اور میں زندہ ہوں بس یہی کافی ہے“ سخی نے کہا اور منہ موڑ لیا۔ جبکہ صبا نے  
 افسوس سے گردن جھکا لی۔

باہر بانیٹک کی آواز آئی تو زرین فوراً ہلکی ”بھائی آگئے ہیں۔“  
 ”ارے واہ ہمارے غریب خانے پر آج تو خدا کی خاص رحمت ہے جو اتنے مہمان آئے ہیں۔“ وہ کمرے  
 میں داخل ہوا۔

عبدالرحیم بڑھ کر بغل گیر ہوا تو وہ دونوں اکٹھے ہی بیٹھ گئے۔  
 بیٹھے ہی اس کی نظر سخی پر پڑی تو وہ چونک گیا آج غیر معمولی طور پر وہ خوش اور آسودہ دکھائی دے رہی تھی۔  
 ”مبارک ہو بھائی آپ کی بیگم نے ٹاپ کیا ہے دوسری پوزیشن آئی ہے ان کی“ زارا نے پر جوش ہو کر کہا۔  
 ”ارے واہ..... یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ میری زوجہ محترمہ نے ٹاپ کیا ہے“ زین خوش دلی  
 سے بولا۔

”مبارک ہو آپ کو سخی“ وہ مسکرایا مگر سخی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔  
 ”بھئی خالی مبارکباد سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہمیں ٹریٹ دینی پڑے گی کیوں زرین“ صوفی نے اندر سے  
 آتی زرین سے پوچھا۔

”بالکل میں سو فیصد آپ کے ساتھ ہوں۔“  
 ”بھئی آپ لوگوں نے اتنی بڑی خوشخبری سنائی ہے اس پر ٹریٹ کیا دعوت بنتی ہے آپ سب کی“ زین نے کہا۔  
 ”واہ بھائی اتنی محبت.....“ زارا کے منہ سے ایک دم نکل گیا۔ احساس ہونے پر اس نے زبان دانتوں تلے  
 دبالی۔ سخی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا جبکہ زین صرف مسکرا دیا جبکہ صبا نے ٹپو کا دیا۔  
 ”میں آتی ہوں ابھی“ سخی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

سبھی نے یہ بات محسوس کی۔  
 ”میں ایسا کو یہ دے آؤں وہ گھر ہی بھول گئی تھیں“ صبا نے سیل بیگ سے نکالا اور اٹھ گئی۔

”ایسا کا کرہ؟“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”سیڑھیاں چڑھ کر سامنے والا“ زرین نے بتایا۔  
 ”اوکے“ وہ نکل گئی۔

صبا گھر کا جائزہ لیتی ہوئی زینے طے کر رہی تھی اس نے کمرے پر رک کر ناک کیا۔  
 ”ایسا آپ اندر ہیں تو آؤں؟“ اس نے ناک کر کے پوچھا۔

”ہاں آ جاؤ۔“ اس نے نرمی سے آکھیں رگڑیں اس نے تسکین کی تھی۔ اس نے خرم کوچیلنج کیا تھا کہ وہ  
 ضرور ٹاپ کرنے میں کامیاب ہوگی اور خرم نے کہا تھا کہ اسے زبردست پارٹی دے گا اگر وہ کامیاب رہی تو۔  
 اس نے سوچا کیا تھا اور ہو کیا گیا تھا۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

عبادت کاظمی

# ہم نے تو بس عشق کیا...

اس کو بھی کسی سے عشق ہو گیا تھا..... پہلی نظر کی محبت ہوتی ہی  
ایسی ہے کہ انسان کو روگ لگ جاتا ہے.....



www.urdu-tube.com

داخلہ لیا اور یہیں سے اُسے پتہ چلا کہ اب تک جو وہ زندگی گزار رہی تھی وہ تو بس عام سی تھی لیکن اسے کہاں پتہ تھا بے خبری کی زندگی انسان کے لیے سکون دہ ہوتی ہے..... وہ ہیکل جنوری کی ٹھنڈی صبح تھی بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھیں اُس نے کندھے سے بیگ لٹکایا اور حاجی کے کمرے کی طرف گئی ”آؤ انابیہ“ انہوں نے کتاب ٹیبل پر رکھی ”داہی آج مجھے کچھ دیر ہو جائے گی پر کیٹیکل کے بعد میں نے اسیہ کے گھر جانا ہے اس کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں.....“ اُس نے دوپٹہ سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے کہا تھا ”اچھا واہ اسیہ بیٹی بھی اتنی بڑی ہو گئی..... ہاہ بیٹیاں بھی کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں آنگن کی کلیاں ایک دن چھوڑ کر چلی جاتی ہیں ایک دن آئے گا جب تم بھی اپنے گھر کی ہو جاؤ گی“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری ”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی“ اُس نے لاڈ سے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔ ”اگر دادا پوتی کا جذباتی سین ختم ہو گیا ہو تو چلیں کالج سے دیر ہو رہی ہے، کب سے دین والا ہارن دے رہا ہے“ افزانے کمرے سے جھانک کر کہا ”داہی چلتی ہوں“ انابیہ نے ان سے اجازت لی اور وہ دونوں کمرے سے چلتی ہوئی باہر آئی تھیں ”رمشا چھاپا کتنی آگئی ہے یا ابھی اس کی طرف جانا ہے“ اس نے چادر سر پر جماتے ہوئے افزا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ”آگئی ہے“ افزانے منہ بتایا تھا انابیہ کو کسی آگئی ”نہں لوتم“ وہ خفا ہوئی تھی ”تم خواہ مخواہ اس سے چڑتی ہو یا اتنی اچھی تو ہے“..... ”ہاں اچھی تو ہے مگر اس کی ہر وقت چپکو رہنے کی عادت مجھے نہیں پسند“ افزانے بے زاری سے جواب دیا ”اچھا چلو تم کھڑکی کی سائیڈ پر بیٹھ

آسان پر نظریں لٹکاؤ وہ گہری سوچ میں گم تھی سرمئی بادلوں کی بارات تیزی سے دور دیسوں کی طرف روانہ تھی پرندے اپنے آشیانوں کی حفاظت کے لیے اڑ رہے تھے بجلی کی ہلکی جھلک کے ساتھ جب بادل زور سے گرجے تو بچے ماؤں کی آغوش میں چھپ جاتے ”انابیہ“ داہی نے ٹیبل پر سے کھڑے ہو کر اسے آواز لگائی تھی وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی اور اوپر کی طرف دیکھا تھا جہاں داہی اسے اشارے سے موسم کی خرابی کا بتا کر اوپر آنے کا کہہ رہے تھے ”آپ کو کیا پتا داہی یہ موسم ہی تو مجھے اس ہرجائی کی یاد دلاتا ہے اور جانے کیوں دل یہ بھکتا ہے یہ موسم اسے لوٹانے کا نو مہر کی آخری شام ٹھنڈی ہواؤں اور بارش کے ساتھ وارد ہوئی تھی اور انابیہ رخصت کے دل پر اداسیوں کی اوس ہولے ہولے گرنے لگی تھی۔

رحمن خان والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور پھوئی زادہ موسم سے شادی کرنے کے بعد چار سال ان کے گھر کا آنگن سونا بہا چار سال بعد انابیہ رخصت ان کے گھر رونق لے کر آئی ابھی انابیہ ڈھائی سال کی تھی کہ روڈ ایکسڈنٹ میں رحمن اور موسم اسے روتا بلکتا نصیر خان کی گود میں چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ جوان بیٹی کی موت نے نصیر خان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا مگر وہ جب بھی انابیہ کو دیکھنے کو لیتا تو اسے اس لیے انہوں نے اپنی زندگی انابیہ کے سنے وقت کر دی وقت ہر رزم کا علاج ہے ہر گھناؤ بھر جاتا ہے وقت دسہ بادوں گزرتا گیا اور انابیہ رحمن جوانی کی دہلیز پر آن کھڑی ہوئی ”انابیہ رحمن کے بس و دشوق تھے کتا مین پڑھنا اور باغبانی کرنا۔ میٹرک شاندار نمبروں سے پاس کرنے کے بعد اُس نے گورنمنٹ گریڈ کالج میں



ابو کو اندر لے گئے وہ گم صم تھی وہ وہاں سے واپس آ گئی تھی مگر انا بیہ رحم اپنا دل اسی دہلیز پر چھوڑ آئی تھی۔

کتنے ہی دن وہ گم صم رہی تھی دودن سے کالج سے بھی چھٹی کی تھی رمشا کے بار بار فون کو بھی وہ انور کر رہی تھی افزا اس سے ناراض ہو چکی تھی مگر انا بیہ تو دل پر پھوٹی کونسل کی بڑھتی رفتار سے پریشان تھی ابھی وہ لان میں بیٹھی دیوار پر اچھلتی کودتی پھوری رنگ کی چڑیوں کو تک رہی تھی کہ رمشا اور افزا دروازے سے اندر داخل ہوئیں ان کو دیکھ کر اس نے چہرے پر جبراً مسکراہٹ سجائی تھی ”کیسی ہو انا بیہ“ گندی رنگ اور چار جٹ کے سوٹ میں رمشا کی رنگت دک رہی تھی ”میں ٹھیک ہوں تم سناؤ بڑی خوش نظر آ رہی ہو“ اس نے گہری نظروں سے رمشا کا جائزہ لیا ”افزا ایتہ خاموش بیٹھی جس سے انا بیہ کو الجھن ہونے لگی تھی اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں افزا کو اشارہ کیا تھا مگر وہ چپ رہی ”ارے کچھ بتاؤ گے بھی تم لوگ یا نہیں؟“ اس نے رمشا کی طرف دیکھ کر کہا ”جواباً رمشانے اپنا ہاتھ آگے کیا تھا جس پر سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی ”میری مٹکئی ہو گئی ہے“ رمشانے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ شرما کر جواب دیا تھا ”واہ بہت مبارک ہو رمشا“

..... ”اس کے کزن جوکل ان کے گھر آئے ہوئے تھے ان سے ہوئی ہے مٹکئی“ افزا نے اس کی سماعت پر ہم گرایا تھا وہ یکدم سے انجھی اور بھاگتی ہوئی گھر سے میں چلی گئی..... رمشانے گھبرا کر افزا کی طرف دیکھا تھا مگر وہ نظریں چرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی ”چلو رمشا“ اس نے حیران پریشان رمشا کا بازو پکڑا اور چل دی اور انا بیہ رحم اپنی قسمت کے اجڑنے پر ماتم کناں تھی ابھی تو اس نے محبت کرنا

جانا، اب چلیں“ انا بیہ نے رسائیت سے کہا جس وقت وہ لوگ کالج پہنچیں ہلکی ہلکی بوند باندی سے اب بارش تیز ہو چکی تھی ”اتنی بارش میں اب کلاس کی آدھی تعداد تو آنے سے رہی اور مجھے لگتا ہے نام تبدیل کر دیں گے“ افزا اچھی خاصی جھنجھلا چکی تھی ”چلو تب تک کینٹین سے گرم گرم سو سے کھاتے ہیں“ اس نے جھٹ سے تجویز پیش کی تھی ”پیے نہیں ہیں میرے پاس تھوڑے سے بچے ہیں جن سے میں نے سحر ساجد کا مرن جانا زمر سنا ہے“ افزا نے آنکھیں دکھائی تھیں ”مرومت میں کھلا دوں گی“ انا بیہ نے دانت کلچکپائے تھے ”رمشا نہ آ جائے جلدی چلو“ افزا نے اسے دکھایا تھا ابھی وہ کینٹین سے تھوڑی دور تھیں کہ یکدم رمشا بھاگتی ہوئی ان کی طرف آئی تھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا وہ نے تماشہ رو رہی تھی انا بیہ اور افزا سے یوں روتے دیکھ کر گھبرا گئیں ”کیا ہوا رمشا؟“ انا بیہ نے اسے سنبھال کر بٹھایا تھا ”میرے بابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، انا بیہ میں تو مر جاؤں گی“ انا بیہ نے افزا کو اشارہ کیا تھا وہ پانی بھر کر لائی تھی اس کے بعد وہ دونوں رمشا کے ساتھ ہاسپٹل گئی تھیں اور پھر رمشا اصرار کر کے انہیں گھر لے آئی تھی کچھ لمحات انسان کی زندگی میں ایسے ہوتے ہیں جو بہت خاص ہوتے ہیں جن کو کبھی انسان بھول نہیں پاتا یا وہ پہلے کبھی محسوس نہ کیے ہوں جس وقت وہ رمشا کے گھر میں داخل ہوئی تھی پہلی نظر اس لڑکے پر پڑی تھی وہ پریشان نگاہوں سے دروازے کو تک رہا تھا انا بیہ اس پر نظر ڈال کر ہٹانا بھول گئی تھی ”کچھ لمحات انسان کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور ایسا کچھ ہی انا بیہ رحم کے ساتھ ہوا تھا افزا نے اسے ٹھوکا دیا تھا اس نے گھبرا کر نگاہیں ہٹائی تھیں کب رمشا کے

سکھنی تھی اور یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔

کی آنکھوں سے دور تھی۔

”یار میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا ہے.....  
وہ رمشا کو پسند نہیں کرتا۔“ افزا نے زچ ہو کر کہا تھا  
اس نے انا بیہ کی آنکھوں میں فیصل کے لیے  
پسندیدگی دیکھ لی تھی اور چاہتی تھی کہ انا بیہ اپنے دل  
کی بات کہہ ڈالے مگر.....

”چھوڑو یا رتم نے رمشا کو دیکھا کتنا خوش لگ  
رہی تھی.....“ انا بیہ نے گھاس نوچتے ہوئے کہا۔ وہ  
دونوں کالج سے باہر لان میں بیٹھی تھیں ”دل کے  
آنسو گھاس کو نوچ کر تم نکالو انا بیہ کہہ دو کہ تم عشق  
کر بیٹھی ہو۔“ وہ اُسے اکسار ہی گئی۔ ”افزا اگر تم  
کچھ سمجھ چکی ہو تو یہ بھی جانتی ہو محبت خراج نہیں  
مانگتی۔“ بھاڑ میں جاؤ تم۔“ وہ غصے سے ناراض ہو کر  
چلی گئی اور انا بیہ کچھ دیر سوچ میں گم رہنے کے بعد  
کھڑی ہوئی تو دھک سے رہ گئی۔

وہ سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا  
”انا بیہ“ وہ اس کا نام پکارتے ہوئے قریب آیا تھا  
انا بیہ کو لگا اس کا دل دھڑکنے لگا۔  
”میں قصے کہانیوں کی باتیں نہیں کروں گا سچ  
کہوں گا مجھے تم سے محبت ہے.....“ وہ جذب سے  
کہہ رہا تھا اس لمحے انا بیہ رخصت کے ارد گرد گھنٹیاں  
بجی تھیں مگر یکدم سے ذہن پر رمشا کا جھلکنا ہوا  
چہرہ نمودار ہوا تھا۔

”آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا تو آپ کو  
میری قسم آپ رمشا کو اپنا لیں اور اسے خوش رکھنا  
.....“ وہ یہ کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتی دیاں  
سے چلی گئی تھی اور فیصل نے آنکھوں کے گرد پھیلی ہی  
کو سختی سے رگڑا تھا ”عشق ایسے ہوتا ہے میں تمہیں  
کر کے دکھاؤں گا انا بیہ رخصت..... تمہارا مجھ سے دور  
جانا ہی مجھے سمجھا گیا ہے کہ تم نے عشق کیا ہے اور

فیصل مجاہد کل سے سخت پریشان تھا وہ تایا کے  
ایکسڈنٹ کی خبر سن کر ان کے گھر آیا تھا اور اس کے  
پچھے اس کی والدہ بھی آگئیں فیصل کے والد اس کے  
بچپن میں فوت ہو گئے تھے ان کی وفات کے بعد  
حیات صاحب نے فیصل اور ان کی والدہ کا بہت  
خیال رکھا تھا..... ایسے ہیگم کی خواہش تھی کہ وہ اپنے  
دیور کی بیٹی رمشا کو فیصل کے لیے مانگ لیں مگر  
حالات کی وجہ سے وہ چپ رہیں آج برسوں بعد ان  
کے دیور نے ان کی خواہش حقیقت میں بدل دی  
تھی..... فیصل رمشا کو بطور کزن پسند کرتا مگر اس  
رشتے کی حیثیت سے نہیں..... اکثر وہ رمشا کو کالج  
چھوڑنے جاتا بھی تو انا بیہ رخصت کو دیکھ کر اس کے دل  
کے تار بج اٹھتے تھے اور اسے رمشا کے گھر اپنی  
طرف دیکھتے دیکھ کر فیصل کو کچھ ہوا تھا..... لیکن اس  
کے بعد وہ سب کچھ ہو گیا اس کے نام کی انگوٹھی رمشا  
حیات کی انگلی میں ج چکی تھی اس نے بہت سوچا کہ  
وہ رمشا سے بات کرے مگر تایا ابو کے چہرے پر  
پھیلی خوشی اور رمشا کے چہرے پر پھیلے قوس قزح  
کے رنگ اس کی خواہش کو بیان کرنے سے روک  
گئے۔ ”فیصل تم خوش ہو یا نہ؟“ ایسے ہیگم نے اسے  
یوں لان میں پریشان بیٹھے دیکھ کر کہا..... ”جی ای  
خوش ہوں بس اچانک یہ سب اس لیے تھوڑا گھبرا  
گیا“ اس نے محبت سے ان کو ہاتھ تھام کر بٹھایا۔  
”اب آپ کو کیا تاؤں ای دل نے ابھی کسی کے  
لیے دھڑکنے شروع کیا تھا مگر کیا پتہ وہ بھی مجھے پسند  
کرتی یا نہیں“ اس نے سوچا۔ ”چلو اب سو جاؤ رات  
بہت ہو گئی ہے صبح دفتر بھی جانا ہے ناں.....“ جی  
ای چلتا ہوں.....“ اس نے کہا..... چاند کی روشنی  
پورے جو بن کے ساتھ اتر چکی تھی مگر نیند فیصل مجاہد





افسانہ

عروج فاطمہ

# میں سسرال اور سیاست

~~~~~

اگر لڑکیاں زبان بند رکھنا سیکھ لیں تو
زندگی بہت خوبصورت ہو جاتی ہے.....

~~~~~



دوربین



بہو ہونے کی وجہ سے سخت کے آثار عیاں تھے۔  
 ”نہیں آپ! میرا ہرگز ایسا مطلب نہیں تھا۔  
 ہاتھ سے روٹی بنانے کی عادت نہیں ہے نا مجھے اس  
 لیے مشکل پیش آرہی تھی۔“ میرے گلے میں موجود  
 آنسوؤں کا پھندا سانس لینے میں دشواری کا سبب  
 بن رہا تھا۔ میں بچپن ہی سے لڑائی جھگڑے سے  
 بہت ڈرتی تھی۔

”بی بی ایسی عادتیں میکے میں چھوڑ کر آتے ہیں  
 یہ آپ کا سسرال ہے اور مجھ سے تو فاصلہ ہی دکھا  
 کرو۔“ میری جیٹھانی نے آج بر ملا اپنی نفرت کا  
 اظہار کر دیا تھا۔ ان گنت آنسو میری پلکوں کی جھار  
 عبور کر کے میرے آنچل میں جذب ہو گئے اور بلیوں  
 ایک سے زائد باریک ناکام کوششوں کے بعد میں دو  
 روٹیاں بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”ہاہاہا..... شوق یہ تم نے کس ملک کا نقشہ بنایا  
 ہے؟“ احسن ہمیشہ میرے ہاتھ سے بنے ہوئے  
 کھانوں پر بھرپور تبصرہ کرتے تھے اور آج بھی  
 بناشت بھرے لہجے میں گویا ہوئے تھے لیکن اپنی  
 جیٹھانی کا سارا غصہ میں نے احسن پر نکال دیا۔  
 ”سنبل آپ! نے بیانا چھپا دیا تھا تو پھر ایسی  
 روٹی ہی بنتی تھی۔“ آنسو مسلسل میری آنکھوں سے  
 بہہ رہے تھے۔

”خبردار جو آج کے بعد تم نے سنبل آپ! کے  
 خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“ احسن نے  
 وارننگ دے دی تھی اور میں اپنی اس حرکت پر بچھتا  
 رہی تھا۔

دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا جب میں احسن کی  
 روٹی بنانے کے لیے کچن میں داخل ہوئی تو بیانا  
 غائب تھا۔ اس بات نے مجھے درطہ حیرت میں  
 ڈال دیا۔ دو روٹیاں بنانے کے بعد میں نے پانی  
 کے چھینٹوں سے اپنا چہرہ اچھی طرح دھویا کہ کہیں

میں تعلیمی میدان میں ہمیشہ کامیابی سیننے کی  
 عادی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں زندگی کی ہر  
 بازی با آسانی جیت لوں گی مگر میں غلط تھی۔ میرا  
 اصل امتحان تو تب شروع ہوا جب سیڑھیوں سے  
 گرنے کی وجہ سے مجھے سسرال میں دس دن بستر پر  
 لیٹ کر گزارنے پڑے تھے۔ تب میں نے اپنی  
 والدہ کو بچہ یاد کیا۔ وہ تو میرا ہلکا سا بھار بھی  
 برداشت نہ کر پاتی تھیں جبکہ یہاں تو کسی نے اتنا  
 بھی نہیں پوچھا کہ شوق زندہ بھی ہے یا مرگئی؟ فون پر  
 سنائی دینے والی میری ماں کی آواز نے میرے  
 زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا۔ میں نے اپنے پاس  
 آنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ میں نہیں جانتی تھی کہ  
 میرا زرد رنگ اور آنکھوں کے نیچے نظر آنے والے  
 حلقے میری ماں کو غموں سے ہلکان کر دیں۔

”امی جان یہاں سب میرا بہت خیال رکھتے  
 ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں معمولی سی چوٹ آئی  
 ہے۔“ میری اس بات نے میری والدہ کو ہر طرح  
 کے دوسوؤں سے آزاد کر دیا تھا۔ میں نے قبول کر لیا  
 تھا کہ اب یہ میرا نصیب ہے اور اب میں نے  
 اکیلے ہی ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا ہے لیکن  
 خود کو یہ سب سمجھانے میں مجھے کچھ وقت لگا تھا۔  
 وارڈروب میں پڑا ہوا اپنا گولڈ میڈل دیکھ کر میرے  
 چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی تھی۔

”سنبل آپ! میں نے احسن کے لیے روٹی بنانی  
 ہے لیکن بیانا نہیں مل رہا ہے۔ کیا آپ نے نہیں  
 دیکھا ہے؟“ کچن میں ہر جگہ ڈھونڈنے کے بعد  
 جب میں نے ہار مان لی تو سوچا قریب ہی کھڑی  
 اپنی جیٹھانی سے پوچھ لیتی ہوں۔

”اب میں اٹھا کر اپنے کمرے میں تو نہیں لے  
 کر جاسکتی ہوں نا۔ بیہیں نہیں ہوگا ذرا ٹھیک طرح  
 سے ڈھونڈ مل جائے گا۔“ چہرے پر گھر کی بڑی

جانا۔ ”حسن نے میری الجھن سلجھا دی تھی۔

”حسن آپ بہت اچھے ہیں۔“ میں اتنا کہنے کے بعد ارسلان کی جانب متوجہ ہو گئی تھی جو نیند سے بیدار ہونے کے بعد اب مسکرا رہا تھا اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ میں اکیلی نہیں ہوں کوئی ہے جو میرا بہت خیال رکھتا ہے۔

☆.....☆

”شفق تم نے میرے بیٹے اویس کو کہیں دیکھا ہے کیا؟ سنبھل آئی کے بیٹوں کے ساتھ ٹی۔ وی لائونج میں کھیل رہا تھا۔“ شائلہ روہاٹی ہو رہی تھی۔

”آپ فکر مت کیجیے ہم سب مل کر ڈھونڈتے ہیں اویس مل جائے گا۔“ میں اپنے چار ماہ کے بیٹے کو اچھی طرح کھیل میں لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

”سنبھل آئی آپ کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں پانی کی خالی بوتلیں لے کر جلد ہی نیچے آ جاؤں گی اویس کو باہر مت جانے دیجئے گا پھر یہ سب کیسے ہو گیا ہے؟“ شائلہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

”اچھا تم نے ایسا کچھ کہا تھا۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سنائی ہی نہیں دیا تھا کہ تم کہہ کیا رہی ہو چلو اب لڑنے سے کیا حاصل یہ سوچو کہ اویس آخر کہاں جا سکتا ہے دو سال کا بچہ تو کسی کو اپنے گھر کا بچہ بھی نہیں بتا پائے گا۔“ سنبھل نے لاعلمی کا اظہار کرنے کے بعد شائلہ کی پریشانی مزید بڑھا دی تھی۔

”آپ تینوں سکون سے رہ ہی نہیں سکتی ہیں۔ گھر کو ہر وقت مچھلی بازار بنایا ہوتا ہے۔“ میری نند مہرین کی انٹری سے ماحول میں مزید تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

حسن میرے آنسو دیکھنے کے بعد پھر سے خفا نہ ہو جائیں۔

میں نے جب کمرے میں قدم رکھا تو حسن نے پھولوں کے گلدستے سے میرا استقبال کیا۔ سرخ گلابوں کی مہک سے میرا مزاج بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔

”آئی ایم سوسری! کشف دراصل کل میں اپنی نوکری کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ کچھ ورکرز کو نکال دیا گیا ہے۔ پرائیویٹ نوکریوں میں کچھ معلوم بھی تو نہیں ہوتا ہے کہ جب چاہیں کسی کو بھی نکال دیں۔ بس اسی پریشانی کی وجہ سے کل میں نے تمہاری دل آزاری کر دی تھی۔“

حسن کی آنکھوں میں سچائی کی رقع صاف دکھائی دے رہی تھی۔

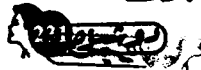
”سوری حسن اصل غلطی تو میری ہے۔ شوہر تو پہلے ہی تھکے ہوئے گھر آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کام سے فراغت کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ سکون کا سانس لیں۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کی پریشانیوں کو کم کرے اور صبر و تحمل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑے۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔

”آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنیں گے۔ میرا آفس بیک کھولا ایک چیز تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“ حسن آج مجھے ایک کے بعد ایک سر پرانزدے رہے تھے۔

”ہاہاہا..... حسن یہ بیلتا آپ لے کر آئے ہیں؟ مجھے تو اب تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔“

حسن نے آفس سے واپسی پر پہلی بار اس طرح کچن کی کوئی چیز خریدی تھی۔

”جب بھی کچن میں نہ ملے تو یہ والا ساتھ لے



## ”امام ابوحنیفہ“

آپؒ کی کنیت ”ابوحنیفہ“ تھی جسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ اکثر لوگ حقیقی نام تک بھول گئے۔ اگر کسی شخص کے سامنے نعمان بن ثابت کا ذکر کر دو تو وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ہے کہ یہ کون بزرگ تھے؟ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جس نے تمام عمر شہرت کو ناپسند دیدہ نظروں سے دیکھا وہ رشتی دنیا تک امام اعظم کہلائے۔

”خدا کے واسطے آپ سب خاموش ہو جائیں۔“ شاملہ کا ہاتھ جوڑ کر فریاد کر رہی تھی۔

دروازے پر سنائی دینے والی دستک نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ میری ساس نے جب دروازہ کھولا تو میرے سر پرچے پر موجود بنجیدگی کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئے تھے۔

”اولیں سبزی والے کی دکان کے پاس کھڑا ہوا تھا وہ تو شکر ہے کہ دکاندار ہمیں جانتا تھا میرے ساتھ اکثر اولیں کو دیکھنے کی وجہ سے جلد ہی پہچان گیا کہ یہ ہمارے گھر کا بچہ ہے۔“ میرے سر اور اولیں کی یوں اچانک آمد نے ہر طرف خوشی کھیر دی تھی۔

”شکر ہے خدا کا کہ اولیں مل گیا ہے ورنہ شاملہ نے تو مجھ پر پکس کر دینا تھا۔“ پہلے سبیل اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے کمرے میں لے کر گئی تھی اور پھر ایک ایک کر کے سب ہی اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں بھی وہاں سے چلی جاتی شاملہ نے مجھ سے اپنے حق میں صفائی مانگ لی تھی۔

”شفیق تم ہی بتاؤ سبیل آپ کی کیا ایسی حرکت کرنی چاہیے تھی؟“ شاملہ میرے جواب کی منتظر تھی۔

”شاملہ میں مانتی ہوں آج جو ہوا ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن آپ پریشانی مت لیں میں حاضر ہوں اگلی بار آپ اولیں کی ذمہ داری مجھے دے سکتی

ہیں۔“ شاملہ کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر میں مطمئن ہو گئی تھی کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

☆ ☆ دو دنوں بعد شاملہ اور میری جیٹھانی نجلے کس بات پر قہقہہ لگا رہی تھیں۔ میں بچن میں کام کر رہی تھی اسی دوران میری جیٹھانی جیرے ستانے آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور مجھے یقین دلاتی تھیں کہ آج میری خیر نہیں ہے۔

”تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟ میرے خلاف شاملہ کو بھڑکانے سے تمہیں کیا حاصل ہوا ہے؟ ہم تو آج بھی ایک ہیں۔“ سبیل آپنی طنزیہ انداز میں اپنی بات مکمل کر کے چلی گئی تھیں۔

آج مجھے بہت بڑا سبق حاصل ہوا تھا۔ اگر کوئی آپ کے سامنے کسی کی برائی کرے تو ایسے میسوں کی حمایت مت کریں کیونکہ کل کو یہ ہی لوگ جان کا وبال بن جاتے ہیں۔

میرے جیٹھ فرقان اور دیورہ سلیم دونوں کی اپنی گارمنٹس کی دکانیں تھیں۔ سر بھی اپنے ان بیٹوں کے پاس چلے جاتے تھے یوں گھر کے تینوں مرد ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ میرے شوہر احسن کو ایم۔بی۔اے کے بعد آفس میں جاب مل گئی تھی۔ گھر میں تندی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔

”آئی یہ گولڈ کی چین میں نے مہرین کے لیے خریدی ہے۔“ میری جیٹھانی نے میری ساس رخشندہ بیگم کے ہاتھ میں ایک ڈبیہ تھماتے ہوئے کہا

پانچ منٹ بعد شکہ سونے کی انگلی لے کر آگئی تھی۔ میری نند اور ساس کی خوشی دیدنی تھی جبکہ میں سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا دوں کیونکہ احسن نے کچھ ماہ قبل پلاٹ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اسی وجہ سے ہماری ساری بچت تو قسط کی ادائیگی میں ہی صرف ہو جاتی تھی۔

☆.....☆

”اچھا تو ایسے سیاست کہتے ہیں۔“ اُس دن میں نے اپنے کمرے میں آکر بہت آنسو بہائے تھے۔ میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ میرا تو کوئی بھائی بھی نہ تھا اور نہ ہی کوئی بہن تھی اور والدین سے میں ایسی کوئی بات نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میرے بابا جان ریٹائرڈ آری آفیسر ایک بارہاٹ ایک کاجھٹکاسہہ چکے تھے اور میری والدہ شوگر لی پی کی پشٹ تھیں خاموش رہ کر صبر کرنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

☆.....☆

”خالہ جان یہ میری چار سونے کی چوڑیاں اور دو کڑے مہرین کے لیے رکھ لیجے۔ چیزوں کا کیا ہے ان شاء اللہ پھر بن جائیں گی۔“ میں نے جیولری باکس اپنی ساس کے سامنے رکھ دیا۔

”مجھے معاف کر دو شفق بیٹی تم نے ہمیشہ ہمیں اپنا سمجھا ہے لیکن ہم نے تمہیں اجنبیت کے علاوہ آج تک اور کچھ نہیں دیا ہے۔ تم میری بہن کی بیٹی ہو اس لحاظ سے مجھے تو تمہارا زیادہ خیال رکھنا چاہیے تھا۔“ میری ساس نے مجھ سے معافی مانگ رہی تھیں۔

”نہیں خالہ جان پلیز ایسا مت کہیں آپ کو جب بھی دیکھتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میری والدہ میرے سامنے کھڑی ہیں۔“ میں نے اپنی خالہ کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کر دیا تھا۔

☆.....☆

”تم نے ایسا کیوں کیا شفق؟ میں نے کچھ رقم جمع کی ہوئی ہے۔ تم نے آج بہت بڑی قربانی دے دی ہے۔“ احسن نے میری خالی کلائیوں کو تھام کر افسردگی سے کہا تھا۔

”میرے لیے آپ کی عزت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔“ میں اتنا کہنے کے بعد کچن میں جانے کے لیے ابھی کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ مہرین نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

”بھابھی آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ میری کزن ہیں پھر بھی میں نے اسے اور آپ کے درمیان فاصلے کی دیوار کھڑی کر لی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری رخصتی سے قبل آپ مجھے دل سے معاف کر دیں۔“ مہرین نے ننکا آنکھوں سے لب کشائی کی تھی۔

”پنگی معافی کیوں مانگ رہی ہو تم تو مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔ آج سے ہم دونوں بہنیں ہیں۔“ آج مجھے اپنی کزن واپس مل گئی تھی جو کہ مند بننے کے بعد مجھ سے چھن گئی تھی۔

☆.....☆

”تم نے شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر اور اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا تھا؟“ احسن کا سوال سننے کے بعد میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”ہا ہا ہا..... احسن آج آپ نے مجھے کیا یاد دلا دیا نہیں میں نہیں بتانے والی ہوں کیونکہ اگر میں نے آپ کو بتا دیا کہ میں کیا سوچتی تھی تو آپ میرا بہت مذاق اڑائیں گے۔“ میں کافی دنوں بعد دل سے مسکرائی تھی۔

”نکا وعدہ میں نہیں ہنسوں گا چلو اب بتا دو نا اپنوں سے کیسی پردہ داری۔“ احسن بھی ہنسنے لگے کہ





”شفق پلیر تھوڑا صبر کر لو میں اپنے بیٹوں کے

لئے خیر بنا رہی ہوں۔“ اپنی جیٹھانی کی بات سننے کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ بھوک کی شدت بڑھتی جا رہی تھی لیکن سنبیل آپنی کے بعد اب ٹائلہ کچن میں آ گئی تھی۔ شام میں جب احسن آفس سے گھر واپس آئے تب کہیں جا کر چولہا فارغ ہوا تھا۔

”شفق کیا بات ہے مجھے بتاؤ تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔“ میرا سر چکرا رہا تھا اور احسن جلد ہی سمجھ گئے تھے کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔

”میں ٹھیک ہوں احسن آپ فریش ہو جائیں میں ابھی آپ کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔“ میں نے خود کو بڑی مشکل سے کپور کیا ہوا تھا۔

”کم آن شفق تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتی ہو۔ آج تم آرام کرو کھانا میں باہر سے لے کر آ رہا ہوں۔“ احسن اتنا کہنے کے بعد مارکیٹ چلے گئے تھے۔

”یہ لیں محترمہ سچی رائٹا روٹیاں اور کولڈ ڈرنک۔“ احسن کو میری پسند معلوم تھی۔ اگلے دن احسن آفس نہیں گئے تھے اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ احسن نے ایسا کیوں کیا ہے کیونکہ وہ تو بخار کی حالت میں بھی آفس ضرور جاتے تھے۔

”آج تم میرے ساتھ کچن کا سامان لے کر آؤ گی اور کل سے تم اسی کمرے میں اپنی روٹی بنایا کرو گی۔ تمہارے ساتھ اس گھر میں جتنا اچھا سلوک ہو رہا ہے وہ میں نے دیکھ لیا ہے۔“ احسن نے اپنا فیصلہ بنا کر مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

”احسن پلیر ایسا مت کریں۔ اس طرح تو مجھے سب کی دشمنی مول لینی پڑ جائے گی۔ میں ایسے ہی گزارا کر لوں گی۔“ میں گلوگیر لہجے میں احسن

آج صبح جان کر رہے ہیں گے۔

”میں سوچتی تھی میرا دو منزلہ گھر ہوگا جس میں موجودہ خوبصورت سے لان میں گلاب کے پھول لگے ہوں گے۔ شام میں جب میرے شوہر محترم آفس سے تھے ہمارے واپس آئیں گے تو میں پہلے تو مسکراہٹ کے ہمراہ خوش آمدید کہوں گی اور پھر ڈانٹنگ نیپل پر ہر وہ شے رکھ دوں گی جو ان کو پسند ہو گی اور پھر ہم ٹیرس کے قریب بیٹھ کر شام کی چائے پیئیں گے۔“ میں نے وہ سب بتا دیا جو کبھی میرے دل کی خواہش ہوا کرتی تھی۔

”ارے واہ یہ تو پوری فلمی کہانی ہے۔“ احسن سے اپنی ہمی کٹر دل نہیں ہو رہی تھی۔

”دیکھا میں نے کہا تھا نا آپ مجھ پر ہنسیں گے اور اب تو آپ نے اپنا وعدہ بھی توڑ دیا ہے۔“ دل ہی دل میں تو میں بھی اپنی سنائی ہوئی بات پر مسکرا رہی تھی۔

”مائی کیوٹ وائف ہنسنے والی بات پر ہنسی تو آتی ہے نا۔ چلو آج میں دل سے دعا دیتا ہوں کہ تمہارا یہ خواب حقیقت کا روپ دھار لے۔“ مجھے احسن کی محبت پر رشک آ رہا تھا کیونکہ اسی کے سہارے تو میں زندہ تھی۔ سسرال میں ملنے والی لفظوں کی مار جسمانی تشدد سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ نظر آنے والے زخموں پر تو مرہم لگایا جا سکتا ہے لیکن روح پر لگے گھاؤ بہت تکلیف دیتے ہیں۔ ایسے کھن حالات میں احسن نے میرا ہاتھ تھام کر اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔

☆.....☆

اگلے دن مجھے نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ارسلان سو رہا تھا اور اب میں آرام سے کچن میں جا کر روٹی بنا سکتی تھی لیکن وہاں سنبیل آپنی پہلے سے موجود تھیں۔

سے مخاطب ہوئی تھی۔

”میں تیار ہو کر جب کمرے سے باہر آئی تو سنبھل آئی اور شاملہ نے مجھے دیکھنے کے بعد قہقہہ لگایا تھا۔

”شاملہ دیکھو ذرا زمانہ کتنی ترقی کر گیا ہے اور ایک ہم ہیں ایک کمرے میں رہ رہے ہیں لیکن آج تک اف نہیں کی اور نہ سیر سپاٹے کی ضد کی ہے کبھی کچھ لوگوں کو شوہروں کو کبھی میں قید کرنے کا فن آتا ہے۔ اب تو معلوم کرنا پڑے گا کہ یہ کورس ہوتا کہاں سے ہے جس سے شوہر قابو میں آ جاتا ہے۔ اپنی جیٹھانی اور دیورانی کے پہنچ الفاظ سن کر میرا دہاں ٹھہرنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا اسی وجہ سے میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔

”شفیق جلدی سے باہر آ جاؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔ احسن کی آواز سننے کے بعد میں بھول گئی تھی کہ گھر میں کیا ہوا ہے اور پھر اپنی خالہ ساس سے باہر جانے کی اجازت لینے کے بعد ارسلان کے ہمراہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

”احسن کچھ تو بتا دیجیے ایسا بھی کون سا سر پرانز ہے میں تو کب سے سوچ رہی ہوں لیکن اندازہ ہی نہیں لگا پا رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا لیکن زندگی میں پہلی بار میں کسی پہلی کو سلجھانے میں اس قدر بے تاب تھی کہ انتظار نہیں ہو رہا تھا۔

”شفیق اگر بتا دیا تو پھر سر پرانز تو ختم ہو جائے گا۔ بس تھوڑا سا انتظار اور۔ احسن کے چہرے پر پھیلے ہوئے اطمینان سے مجھے بڑی راحت ملی تھی۔ گاڑی نے ایک رہائشی کالونی کا گیٹ کراس کر لیا تھا۔ دو منزلہ خوبصورت گھر بہت دلکش لگ رہے تھے۔

”شفیق اپنی آنکھیں بند کر دو اور ارسلان کو میرے چا لے کر دو۔“ احسن نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا مجھ پر بھروسہ رکھو۔ احسن نے میرے رخسار پر بہنے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

☆.....☆

”بابا جان میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ شفیق کچھ وقت تک اپنے کمرے میں ہی اپنی رونی بنالیا کرے اور اس طرح ارسلان کا دودھ ابالنے میں بھی آسانی رہے گی۔ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟ احسن نے میرے خالو جان سے اجازت مانگ لی تھی اور اب بس جواب کے منتظر تھے۔

”شفیق بڑی بھولی بھالی سی بچی ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب میں ان کے گھر جاتا تھا تو شفیق پڑھائی میں مصروف ہوتی تھی۔ ہر سال پوزیشن لیتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گولڈ میڈل شفیق کی ذہانت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ میرے بیٹے میری طرف سے اجازت ہے۔ میرے سر نے میرا مان رکھ لیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی احسن کی طرح ہر مشکل گھڑی میں وہ ہمیشہ میرا ساتھ نبھائیں گے۔

مہرین کی شادی کے انتظامات میں احسن نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ احسن کے دوست نے کچھ سال قبل ایک لاکھ تیس ہزار کا قرضہ لیا تھا اور وہ صحیح وقت پر لوٹا دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی احسن نے مہرین کی شادی کے لیے رقم جمع کی ہوئی تھی۔

☆.....☆

”شفیق آج میں تمہیں ایک بہت ہی خاص جگہ دکھانا چاہتا ہوں تم شام میں تیار رہنا۔ احسن نے ناشتے سے فارغ ہوتے ساتھ ہی مجھے تیار رہنے کا کہا اور پھر آفس چلے گئے۔

وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ صبح کے بعد شام آ جائے۔

# خزل

## صبا کبر آبادی

سب سے بے احتیاج ہیں ہم لوگ  
کتنے نازک مزاج ہیں ہم لوگ

کوئے جاناں کی خاک ہے سر پر  
منکرِ تخت و تاج ہیں ہم لوگ

سب کا غم اپنے دل میں رکھتے ہیں  
سب کے غم کا علاج ہیں ہم لوگ

رسمِ الفت رواجِ غم ، ہم سے  
وجہِ رسم و رواج ہیں ہم لوگ

کل کا کیا غم ہے کچھ نہ ہوگا کل  
آج دیکھو کہ آج ہیں ہم لوگ

ہم نہیں ہوں تو سلطنت لٹ جائے  
سرِ کیتی کے تاج ہیں ہم لوگ

عشق معشوق سے چھپاتے ہیں  
ایسے عاشق مزاج ہیں ہم لوگ

موت کی نذر ہوتے رہتے ہیں  
زندگی کا خراج ہیں ہم لوگ

آگے کی جانب ہم دونوں کے قدم بڑھ رہے  
تھے میری آنکھیں بند تھیں اس لیے دیکھ نہیں پاری  
تھی کہ ہم جا کہاں رہے ہیں۔

”شفق اپنی آنکھیں کھولو اور دیکھو خدا تم پر کس  
قدر مہربان ہے۔ احسن نے مجھے خوابوں کی دنیا میں  
لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ دو منزلہ خوبصورت گھریا لکھ دیا  
ہی تھا جس کے متعلق میں اکثر سوچا کرتی تھی۔

”احسن یہ آپ مجھے کس کے گھر میں لے آئے  
ہیں اس گھر کا مالک کون ہے اس پاس کوئی نظر بھی  
نہیں آ رہا ہے۔ میری کچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ  
احسن آخر کہاں کیا جا رہے ہیں۔

”تم ہو اس گھر کی مالکین اور یہ ہمارا گھر ہے۔“  
احسن نے حقیقت سے اگا کر دیا تھا۔

”احسن یہ کیسے ہو سکتا ہے دیکھیں پلیز مذاق  
مت کیجیے اب یہاں سے چلتے ہیں۔“ میری  
آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کیونکہ شادی کے بعد  
میں پہلے سے زیادہ حساس ہو گئی تھی۔

”ہمارا ایک کروڑ کا پرائز باڈل نکلا ہے اور مجھے  
آج صبح ہی معلوم ہوا ہے۔ دو روز قبل میں نے یہ دو  
منزلہ گھر تمہارے لیے پسند کیا تھا کیونکہ یہ ہو بہو دیا  
ہی ہے جیسی تمہاری ہمیشہ سے خواہش تھی لیکن میرے  
پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ اللہ نے تمہارے صبر کا صلہ  
دے دیا ہے۔ اب تم شام میں کافی بنا کر میز پر میرا  
انتظار کرنا یا پھر ڈائننگ ٹیبل پر کوئی بھی ڈش بنا کر سجا  
دینا یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ احسن کی بات نے مجھے  
سرست کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔

”احسن خالہ جان اور خالو بھی ہمارے ساتھ  
رہیں گے۔“ میں نے بھی احسن کو خوشخبری سنائی تھی  
کیونکہ میں چاہتی تھی کہ میرے بچے بزرگوں کی  
نعت سے محروم نہ ہوں بڑوں سے ہی گھر کی رونق  
برقرار رہتی ہے۔☆☆☆

افسانہ

حمیرا فضا

# ناشکری

جہالت کسی کی میراث نہیں..... زرینہ کی ساس بھی ایک  
جاہل عورت تھی جس نے سیدھی سادی بہو کی زندگی اجیرن کر  
رکھی تھی۔





میں جا چکے تھے۔

کچی کھلی سنان سڑکوں کی خاک اوڑھ کر اب وہ آبادی میں داخل ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے آگے ہموار اور تہا ہموار سڑک کی آنکھ بھولی تھی۔ کبھی پتھر ملی میڑھی میڑھی تو کبھی یکساں سیدھی سڑک جیسے سکھ اور دکھ کا انوکھا بلاپ۔ کچھ دیر بعد کئی چھوٹے چھوٹے مکان دکھائی دینے لگے۔ بے حال ٹوٹے پھوٹے مکان جنہیں تنگ گلیوں نے اپنے اندر الجھا رکھا تھا یا یہ مکان اُن گلیوں میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ سوچیں دماغ میں ایک جا میں یا دماغ سوچوں میں پھنس جائے بات تو ایک ہی ہے اور کہاں سمجھ آتی ہے۔ چلتے چلتے وہ نجانے کون سے سفر پر نکل گئی، جہاں قیاس کی کشادہ سڑکوں پر چکرانی ہوئی مشکلیں تھیں۔ زخموں سے پُورے زخم زدہ، بڑی بڑی مشکلیں اور سامنے حقیقت کی تنگ گلیوں میں بہتی ہوئی نالیاں۔ گندگی سے لبریز چھوٹی چھوٹی بدبودار نالیاں۔ "لگتا ہے تیرے دماغ کا گندہ پڑاوی ہو چکا ہے، تھی تو یہ بدبو تھیں محسوس نہیں ہو رہی۔" اُنہاں نے چادر کا پلو ناک پر رکھ کر اہانت سے کہا تھا۔ "کچھ انسانی دل دماغ بھی تو ایسے ہی ہوتے ہیں، ان نالیوں کی طرح تنگ، فتور کی نجاست سے پُر۔" اُس نے نالیوں کا سیاہ گدلا پانی دیکھ کر مکدر سوچوں اور کالے دلوں پر تاسف کیا۔

گلیوں اور کمیوں سے الجھتی الجھتی بالآخر وہ ایک خستہ حال کچے گھر میں داخل ہو گئیں، جہاں ایک میلی چمیلی سی بڑھیا اُن کی منتظر تھی۔ وہ گہری سانس لے کر ایک کونے میں بیٹھ گئی جبکہ کچھ فاصلے پر آتاں اور وہ بڑھیا اُسے نا پسندیدہ نظروں سے گھور گھور کر بڑبڑانے لگیں۔ سر تا پیہر گھورنے کے

اُسے وقت اور فاصلوں کا حساب کتاب نہیں آتا تھا پر اتنا اندازہ تھا کہ اپنے گاؤں کی سرحد پار کیے لگ بھگ آدھا دن بیت چکا تھا۔ کچے راستے پر وہ اُنہاں کے پہلو پہلو چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا راستہ بالکل اُس کی زندگی کی مانند ہے، دکھ درد کی دھول سے اُٹا ہوا، جہاں آسودگی کی صاف ستھری شارع کا کہیں امکان نہیں۔ یہ ست ست قدم کیا اُٹھا رہی ہے؟ اٹھ پہری نحوست چھائی رہتی ہے تجھ پر، جلدی چل! پیروں میں جان نہیں ہے کیا؟ طاقت والے کام ہی کو نئے کے ہیں تو نے کہ کک گئی ہے بد بخت۔" اُس کی بھانجی سوچوں اور آہستہ قدموں کو اُنہاں نے خوب لکھ لکھ کر سوچوں کی گرمی کے ساتھ ساتھ طنزوں کی حدت نے بھی تن کو سلگا دیا۔ "کوئی کام کرنا پڑے تو اُس بڑھیا کو سونپا دیاں اور ہزار عذر گھیر لیتے ہیں مگر اب یوں دوڑ رہی ہے جیسے ناتواں بڑھاپے میں جوانی پھونک دی گئی ہو۔" وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے انسو سے سوچنے لگی۔

کہنے کو تو وہ ایک دور پار کے گاؤں آئے تھے مگر اُس گاؤں کی اتنی دیکھ کر اُسے اپنا گاؤں شہر جیسا لگ رہا تھا۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر اور اُن پر بھنھناٹی ہوئی سینکڑوں کھیاں۔ اُسے یوں محسوس ہوا کھیاں جوتی در جوتی اُس کے گرد گھوم رہی ہیں۔ "کیا یہ اپنی زبان میں میری بے وقوفی اور بے بسی پر ہنس رہی ہیں؟ آخر میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔" وہ ہاتھ سے منہ پر چپکتی ہوئی کھیلوں کو پرے دھکیلتے ہوئے رو ہنسی ہوئی۔ "بگاڑ تو میں نے اُنہاں کا بھی کچھ نہیں جس نے مسلسل مجھے امتحانوں کی کشت میں ڈال رکھا ہے۔" ہنگامہ پرور جذبات کے چند خاموش آنسو چہرے کی گرد صاف کرتے ہوئے مٹی

"تمہاری اصل عزت و توقیر تو ہم جانتے ہیں۔  
 بڑھیا زیادہ تنگ کرے تو بتانا مجھے، ایسی گولیاں  
 دوں گا کہ دماغ کے سارے فساد کی کڑے  
 تمہارے تابع ہو جائیں گے۔"

اُس نے ٹھری حکیم سے بمشکل اپنا ہاتھ چھڑایا  
 جو نبض چیک کرنے کے بہانے دس منٹ سے  
 دوپے بیٹھا تھا۔ ساری شرمناک باتیں یاد آئیں  
 تو ایک بار پھر اُسے اتناں پر شدید غصہ آنے لگا۔

اب اتناں اپنی نگرانی میں اُسے دوا کی کھلاتی  
 تھی فرق صرف یہ تھا کہ گولیوں کی جگہ پڑیوں نے  
 لے لی اور آنکھوں کے پردے پر ہوں بھری نگاہوں  
 کی جگہ میلے ناخنوں کی تصویر چلنے لگی۔ اُس کی شادی  
 کو تین سال ہونے والے تھے۔ اُس کے شوہر رجم  
 کی گنتی گاؤں کے سیدھے سادھے لوگوں میں ہوتی  
 تو اُس کی ساس کا شمار گاؤں کی چیمکی عورتوں میں  
 تھا۔ اتناں شریا کو اُس میں کئی خامیاں نظر آتیں، مگر  
 اُس کا سب سے بڑا قصور اولاد کا نہ ہونا بن گیا تھا۔

اُسے وہ پڑیاں کھاتے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ وہ  
 جب جب بھی پڑیاں کھاتی اُسے اپنے اندر ایک  
 گندگی کے اترنے کا احساس ہوتا، لمبے ناخنوں کی  
 گندگی۔ تنگ گلیوں کی گندگی۔ کچی کھلی  
 سروکوں کی گندگی۔ اُن جادوئی پڑیوں نے اُس کے  
 آئینے میں اولاد کے پھول تو نہ کھلائے مگر  
 گردوں میں بھیشتی پتھریاں ضرور پیدا کر دیں۔

"جو باغوں کی سلامتی چاہتے ہیں وہ تو مایوں  
 کو بھی دعائیں دیتے ہیں۔" اُس نے رجم کا سر  
 دباتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟" رجم نے ہمیشہ کی  
 طرح بھولے پن سے پوچھا۔

"تیری ماں تو میرے اندر کا حال بھی بھانپ

بعد بڑھیا نے اُسے چار پائی پر لیٹایا اور اپنے بھاری  
 گھر درے ہاتھوں سے کسی ماہر شناس کی طرح اُس  
 کے کمزور وجود کا معائنہ شروع کر دیا۔ "شریا بی بی  
 لگتا تو مشکل ہے مگر یہ جادوئی پڑیاں دس ربی  
 ہوں اِس نے بھی کام نہ دکھایا تو سمجھنا کہ بڑی  
 بد قسمت ہے تیری بہو۔" بڑھیا کے کرخت چہرے  
 پر شدید ناگواری در آئی تو اتناں کے نامید چہرے  
 سے بھی خجالت اور حقارت کے جھوٹے آنکھیں لگے۔

اُس کا دل تو پہلے ہی متلا رہا تھا نظر بڑھیا کے  
 ناخنوں پر پڑی تو مزید خراب ہونے لگا۔ لمبے لمبے  
 چڑیلوں جیسے ناخن جو ست رنگی گندگی سے بھرے  
 ہوئے تھے۔ اُنہوں نے وہاں ایک گھنٹہ سناہ  
 سفر پھر شروع ہو چکا تھا مگر اب پاؤں سے نکراتے  
 لعنت ملامت کے سنگ زیادہ تھے، دل میں چھتے  
 گالیوں کے خار ڈگنے تھے، بیتابی کو تنگ کرنی لاچار  
 ی کی دھول سوا ہو گئی۔ تنگ ذہن میں کبھی ہوتی  
 سوچیں مزید غلاظت کا جو روپ دھار چکی تھیں۔

"اُس موئے حکیم کی گولیوں کو پھینک دے  
 کچرے میں اور باقاعدگی سے اب یہ پڑیاں کھا۔"  
 حکیم کے ذکر پر اُس کا خشک منہ کڑواہٹ سے بھر  
 گیا۔ ہوس بھری دو نگاہیں وہ اب تک نہیں بھولی  
 تھی۔ "تمہارے رنگ بڑے دلکش اور چمکیلے ہیں  
 گڑیا اپنی صحت اور شباب کے رنگوں کو کیوں  
 دوائیوں سے رنگ لگاتی ہو؟ یہ جو باہر بڑی بی  
 بیٹھی ہے ناں یہ تمہارے سب رنگین پر اپنے  
 فائدے کے لیے کات دے گی اور تمہیں ایک  
 سفید بچھرے میں قید کر دے گی۔" اُس نے یکدم  
 خوفزدہ ہو کر سر اٹھایا۔ "ارے میرا مطلب ہے  
 تمہیں جلد بوڑھا کر دے گی یہ بڑی بی۔" بڑی  
 نگاہیں اُس کی حالت سے لطف اندوز ہوئیں۔

لیتی ہے ایک تجھے میری کہی باتیں بھی سمجھ نہیں آتیں۔" وہ ناراضگی سے کہتے ہوئے کچی زمین پر جا بیٹھی تھی۔

"میں تو اُن پڑھ ہوں، تیری طرح چار جماعتیں پڑھی ہوتیں تو سب سمجھ جاتا۔" رحیم نے بھی اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ اور شکوے پہ شکوہ رکھا۔

"چار جماعتوں میں جو معلم تھے سب ایک پاسے، جو اس محرومی، تنزلی، بے حرمتی نے سبق پڑھایا ہے وہی ازبر یاد ہے بس۔" وہ جھارو کے تنکے کو کچی زمین پر گھماتے ہوئے چٹنگی سے بولی۔

"بس کر دے زریزہ! وہ بات بول جو تو کہنا چاہتی ہے۔ رحیم اب اُس کی اداسی کے آگے پار گیا تھا۔ "اُمّات سارا سارا دن جھولیاں بھر بھر بدعائیں دیتی ہے کہ میری آنکھوں سے اُلم کا ساون برسے، میرا تن بیماریوں کی خزاں بھگتے، میرا دل درد کی تپش میں جھلے۔ بول پھر ایسے وجود پر کیسے بہار اُترے گی۔ اُس کی بدعاؤں نے تو میرے اندر پتھر بھر دیے ہیں، میں پھولوں کی اُمید کیسے رکھوں آخر؟" وہ رحیم کی جھنجھناہٹ پر پھٹ پڑی اور رحیم افسردگی سے نینوں کی جل تھل تکتا رہ گیا۔

پڑوں کا عذاب و داع ہوا تو چند دن بعد خالہ شکلیہ آدمی کی، جو اُمّات کے دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ "بہن شکلیہ بس دعا کر رحیم کے بچوں کو جیتے جی دیکھ لوں۔ دیکھ مجھے لڑکے کا لالچ نہیں، بیٹی بھی ہوئی تو آنکھوں پر بیٹھاؤں گی، میری بڑی آرزو ہے اس سونے آنگن میں کلکاریاں گونجیں۔" "تیری دعا ضرور پوری ہوگی اُمّات! گھر میں داخل ہوتے رحیم نے ماں کے منہ سے شکرا نہ کلمات سن کر صدقِ دل سے دعا مانگی۔

کافی دنوں بعد اُس نے رحیم کی فرمائش پر ایسی مرغ پکایا تھا۔ خالہ شکلیہ مرغ کی خوشبو سے سکون پاتے ہوئے اُس کی زندگی کو بے سکون کرنے کے سارے طریقے اُمّات کو سکھانے لگیں۔ "ارے بہن من کی مراد پانے کے لیے بھی کھار منہ پر بھی قدغن لگانا پڑتی ہے۔ بڑی عورتوں کو دیکھا ہے میں نے، جنہوں نے مرغ مسلم سے ہاتھ کھینچے تو اب گود میں کا کے لیے پھرتی ہیں"

خالہ شکلیہ نے بوٹی منہ میں ٹھونس کر اُمّات کی طرف دیکھا جہاں بات نہ سمجھنے کے واضح آثار تھے۔

"ارے کہنے کا مقصد یہ ہے اپنی بہو کا گوشت مچھلی چاول اور مٹی کھانا بند کر دے، بس سبزیاں کھائے پانی میں پکا کر بغیر مرغ مسالے کے۔ یہ ایک قسم کی پرہیز ہے میری بہن۔ بڑی دیکھی ہیں ایسی عورتیں، جو کھانے پانے میں فقیر بنیں تو اُن کے تحت پر جائیں۔" خالہ شکلیہ تو سنی سنائی لگا کے چلی گئیں، مگر اُمّات نے اُس سے ایسے عمل کروایا جیسے کسی ماہر ڈاکٹر کی کہی گئی بات ہو۔ اس پرہیز کے ساتھ گاؤں کے دو چار ڈاکٹروں کی دونیاں بھی چلتی رہی تھیں۔

اُس دن اُمّات گھر نہیں تھی اُس نے بڑے شوق سے گڑ والے چاول بنائے پر جیسے ہی پہلا نوالہ منہ میں ڈالا کسی نے اُس کی جان ہی سمجھ لی، شیشے کی اکلوتی پلیٹ بغیر پلستر کی دیوار سے ٹکرا کر چور چور ہو چکی تھی۔ بد پرہیزی پر اُمّات نے وہ آہ و بکا کی جیسے کوئی مر گیا ہو۔

"اُمّات جو بولے گی میں کروں گی بس یہ پھنکار کی سخت غذا بند کر دے، بیشک مجھے سوکھے مگرے ڈال دیا کرے۔" اُس نے رحیم کے آگے ہاتھ

جوڑ کر کہا تو وہ شدید آبدیدہ ہو گیا۔

اور ٹوکوں کے لیے کی تھی اتنی ہی شدت دعاؤں میں بھی لے آئی تھی۔ ایک امید کا شجر تھا جسے وہ روز یقین اور ایمان سے سیراب کر رہی تھی۔

آخر اُسے صبر اور محرومی کا صلہ مل ہی گیا ایک سال بعد مراد پوری ہوئی تو جیسے پھر میں بھی جو تک لگ گئی، پہلی بار آنتاں نے اُسے نفرت کی بجائے پیار سے جو دیکھا تھا۔ پورا وقت رحیم نے ہر طرح سے اُسی کی خوشی اور آرام کا خیال رکھا تو آنتاں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔

"یہ میرا صبر اور شکر ہی ہے کہ آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ ساری میری شکر گزاری کا پھل ہے۔" آنتاں نے تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے رحیم کو بتایا۔

"بالکل آنتاں جی۔" رحیم کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ صبح سے ہسپتال میں بیٹھے کسی اچھی خبر کے منتظر تھے۔ دائی تو پہلے ہی جڑواں بچوں کی پیش گوئی کر چکی تھی۔ اچانک نرس نے وہ خبر سنائی کہ آنتاں کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ رحیم کے گھر دو بچوں کی ولادت ہوئی تھی مگر قسمت سے لڑکی زندہ تھی اور لڑکا اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔

"تیرا امیرا غرق ہو زینہ! تو نے میرے غریب پتر کو خوشی نہ دکھائی۔ اُس کا سہارا کھا گئی تو، بس بوجھ بچا دیا ہے ہمارے لیے، تو کیوں بچ گئی، تو بھی مر جانی۔" زینہ کی فکر میں دوڑتے ہوئے رحیم کے قدم ایک پل کے لیے ڈمک کر پتھر کے ہو گئے کیونکہ اُس نے بلند آواز میں دہائی دیتی شکر گزار ماں کے منہ سے ناشکری بھرے الفاظ سن لیے تھے۔

☆

☆☆

"رحیم میں بس تیری اولاد دیکھنا چاہتی ہوں مجھے بیٹا بیٹی سے کوئی غرض نہیں پتر۔ میں ہر حال میں شکر ادا کروں گی بس تیری اولاد ہو جائے۔ اور میں تیری بیوی کی دشمن نہیں ہوں اُس سے چار برساتیں زیادہ دیکھی ہیں میں نے۔ اُسے سمجھا تیرے کان بھرنے کی بجائے اپنے من کا میل صاف کرے۔" رحیم کو لگا اُس نے بات چھیڑ کر ہی غلطی کی۔ آنتاں سمجھنے کی بجائے مزید براہم ہو گئی تھی۔

اُس نے آنتاں کا دل جیتنے کے لیے دو مہینے ایسا کڑا پرہیز کیا کہ نقاہت کے باعث سوکھ کر کاٹا بن گئی۔ رحیم سے اُس کی حالت برواشت نہ ہوئی تو ماں سے رحم کی اپیل کی جسے آنتاں نے کوئی فائدہ نظر نہ آنے کی صورت میں بے دلی سے قبول کر لیا۔ امتحانوں میں تھوڑا وقفہ آیا تو اُس نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ کچھ ہفتے ہی گزرے کہ کسی نے آنتاں کے کچے ذہن میں دس جڑی بوٹیوں والے تھوے کی بات ڈال دی، وہ کڑوا تھوہ جو اُسے سات دن تک متواتر پینا پڑا، آٹھویں دن وہ اُلٹیاں لگیں کہ آنتاں خوشی سے نہال ہو گئی۔ دوڑے دوڑے ڈاکٹر کے پاس گئے تو معلوم ہوا کوئی خوشخبری تو نہیں ہے البتہ معدہ میں زخم ضرور ہے۔

اب تو وہ خود بھی مایوس ہو چکی تھی گلے میں جھولتے تین تین تنویر۔ ہاتھ پر بندھے سات قسم کے دھاگے اور جسم میں نفوذ کر چکی سینکڑوں دوائیوں نے کوئی کرشمہ نہ دکھایا تھا۔ دوا پیوں اور ٹوکوں کے تیر برسا بند ہو چکے تھے مگر حرف گیری کے روزے لگا تار بہتے رہے۔ وہ دن رات رو رو کر دعائیں مانگتے لگی، جتنی محنت اُس نے علاج



# دوشیزہ ٹوٹکے

~~~~~

جیل النساء

~~~~~

کر کے آپ اپنا بہت اچھے سے خیال رکھ سکتی ہیں۔

اپنا خیال خوب رکھیے

پہلا دن اتوار  
آج چھٹی ہے اور آپ عام دنوں سے زیادہ  
مصرف رہیں گی تو کاغذ قلم اٹھائیے اور کوئی ایک کام  
جو آپ کرنا چاہتی ہیں لکھ ڈالیے اب آپ کے پاس  
پورا ایک ہفتہ ہے اس پر عمل کرنے کے لیے.....

شاید پڑھنے میں اپنا خیال خوب رکھیے ہماری  
گھر بیٹو خواتین کو کچھ مطلبی سا لگے کیونکہ شادی کے  
بعد تو وہ صرف اپنے شوہر، بچوں اور سسرال والوں کی  
خدمت اور خیال کو ہی اپنا اولین فرض سمجھتی ہیں۔  
(یہاں بات ہو رہی ہے عام خواتین کی) جی ہاں تو  
سب کا خیال رکھتے رکھتے وہ اپنا خیال رکھنا ہی بھول  
جاتی ہیں یا اس وقت تک اتنا تھک چکی ہوتی ہیں کہ  
بس پھر صرف آرام کرنا ہی غیبت لگتا ہے۔ آج ہم  
آپ کو 7 دن کا پلان دے رہے ہیں جس پر عمل

دوسرا دن بدھ  
صبح اٹھ کر ہلکی پھلکی ورزش کریں چاہے یوگا کی  
شکل میں یا محض چہل قدمی صرف 30 منٹ کے لیے  
اس کے بعد روز مردہ کے کاموں میں مشغول





ہو جائیں۔ صحت اور زندگی کے لیے کس قدر بہترین ہے۔

پانچواں دن جمعرات

تیسرا دن منگل

آج آپ کچھ وقت نکال کر کاغذ پر 5 پسندیدہ چیزوں کے نام لکھیے وہ چیزیں جن سے آپ کو خوشی ملتی ہے۔ شوہر اور بچوں کے ناموں کے علاوہ کچھ لکھیے کیونکہ وہ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً فلم دیکھنا، شاپنگ کرنا، گھر جانا، کتاب پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔

آپ آج بہت مصروف ہیں۔ دوپہر کا کھانا، بچوں کی اسکول، کالج سے واپسی رات پر بڑے صاحب کے لیے خصوصی کھانے کا انتظام سب آپ کو ہی کرنا ہے لیکن ٹھہریے اس مصروفیت میں صرف 5 منٹ کے لیے سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جائیے۔ سکون سے آنکھیں بند کر لیں اور محسوس کریں کہ آپ کے آس پاس مکمل خاموشی ہے۔ بس 5 منٹ بعد آنکھیں کھولیں اور مصروف ہو جائیں۔

چھٹا دن جمعہ

آج آپ کو گن کر 8+10 گلاس پانی پینا ہے سائے کام کرتی رہیے مگر پانی کے گلاس بھی گن کر نہیں۔

چوتھا دن بدھ

ساتواں دن ہفتہ

آج آپ اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال کر اپنا پسندیدہ رسالہ دو شیزہ پڑھیں گی اور کوشش کریں گی کہ پوری توجہ سے پڑھیں تاکہ مدیرہ صاحبہ کو خط لکھ سکیں رات کو سونے سے قبل یہ ضرور چیک

آج آپ جلدی سونے کی تیاری کریں گی چاہے صرف 30 منٹ قبل ہی کیوں نہ ہو مگر جلدی سونا ہے۔ فرض کریں آپ 11 بجے سوئی ہیں تو آج آپ 10:30 بجے اپنے آرام دہ بستر پر ہوں گی آپ کو اعزاز نہیں ہے کہ جلدی سونا اور جلدی اٹھنا

دو شیزہ 243

آپ اگر صبح دلپے سے ناشتہ کریں تو دن بھر  
چاق و چوبند رہیں گے۔  
دلپے دل کو مقوی کرتا ہے۔  
Thyroid سے محفوظ رکھتا ہے۔  
نظام ہضم کو فعال رکھتا ہے۔  
ہڈیوں کے ممبر بھرے پن سے بچاتا ہے۔  
تو پھر آج سے ہی فیصلہ کر لیں کہ اپنی غذا میں  
دلپے کو ضرور شامل رکھیں گے۔

پیٹ کم کرنے کی آسان ترکیب

½ Cup Fresh Apple Juice

2 + Sp Fresh Lemon Juice

1 tsp Ginger Juice

½ tsp Sea Salt

½ Warm Water

گرم پانی (درمیانہ) میں نمک ملائیں پھر سیب  
کارس، لیموں کارس، اورک کارس اچھی طرح مکس



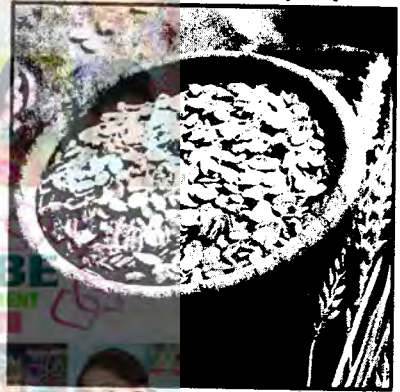
کریں اور ایک گلاس نہار منہ پی لیں۔ اس طرح  
دوپہر کے کھانے سے پہلے اور رات کے کھانے سے  
قبل یہ مشروب پئیں آپ خود چند دنوں میں محسوس  
کریں گی کہ آپ کا پیٹ کم ہونا شروع ہو گیا ہے۔

☆☆.....☆☆

کچھ گاکہ اتوار والے دن جو آپ نے اہم کام کاغذ  
پر لکھا تھا وہ کر لیا یا آپ کو وقت ہی نہیں ملا اگر آپ  
اس معروف ہفتے میں اپنا پسندیدہ اور ضروری کام  
کر چکی ہیں تو شاباش اب کل پھر اتوار ہے کچھ اور  
لکھیے اور اگر کام ادھور ہے تو اسی کو دوبارہ لکھ ڈالیں  
آپ کے پاس ایک ہفتہ اور ہے اپنے لیے کچھ کرنے  
کے لیے.....

دلپے کے فوائد

اپنی غذا میں دلپے ضرور شامل کریں۔ اس میں  
وٹامن بی 5، بی 6 اور بی E شامل ہوتے ہیں۔ دنیا

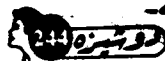


بھر میں دلپے کو صحت مند ترین غذا تصور کیا جاتا ہے۔  
آج ہم آپ کو دلپے کے فوائد بتائیں گے تاکہ  
پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ دلپے کس قدر صحت مند غذا  
ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ اس کو ناشتے میں  
کھائیں آپ دلپے اور قیہ دوپہر میں بھی کھا سکتے  
ہیں۔ دلپے میں گوشت، پھلی سبزیوں کے ساتھ  
بچوں کو کھلا سکتے ہیں۔

دلپے روز کھانے سے انسان کینسر جیسے موذی  
مرض سے محفوظ رہتا ہے۔

یہ آپ کے جسم میں شوگر لیول کو Maintain  
رکھتا ہے۔

وزن کم کرنے میں بہت فائدہ مند ہے۔



# ہمارے فنکار

URDU TUBE

## ڈی خان

اداکاری حقیقت کے بہت قریب محسوس ہوئی۔  
کراچی سے تعلق رکھنے والے اس اداکار کی عمر  
30 سال ہے اور اسٹار جہدی ہے۔ اسامہ نے بچپن  
کیا ہے اور ابھی تک سنگل ہیں۔ اپنے آپ سے  
باغی کرنے کا بہت شوق ہے اور مانتے ہیں کہ  
خواتین کے لیے ہماری سوسائٹی میں Survive  
کرنا بہت مشکل کام ہے۔

اسامہ طاہر  
اسامہ طاہر شوہز انڈسٹری میں بہترین اضافہ  
ہیں۔ ان کی اداکاری میں بڑھتی اور حقیقت محسوس  
ہوتی ہے۔ چلے تھے ساتھ فلم سے شوہز انڈسٹری میں  
قدم رکھنے والے اس خوش شکل نوجوان نے کئی کمرشلز  
کیے۔ ڈری جاتی ہے صلا میں ان کی اداکاری کو بہت  
سراہایا گیا۔ نیلا پور کی ڈائن میں بھی اسامہ کی





کھلنڈری طبیعت کی مالک ہیں اور سیٹ پر بھی خوب  
روح لگا کر رہتی ہیں۔ حتا کا ایک بھائی ہے والدہ



کھریلو خاتون ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حتا کا مستقبل  
بہت روشن ہے۔

عدنان ملک

9 جون 1984ء کو اسلام آباد میں پیدا  
ہوئے۔ ایکٹر ماڈل 'پروڈیوسر اور VJ عدنان ملک



یمینہ زیدی

یہ شرارتی اور نٹ کھٹ سی اداکارہ کافی ڈراموں



میں کام کر چکی ہے اور اپنی اداکاری کا لوہا بھی منوالیا  
ہے۔ یمینہ لاہور میں پیدا ہوئیں اور اُن کا تعلق برج  
سرطان سے ہے۔ اب تک 7، ہم ایوارڈز میں نازد  
ہو چکی ہیں۔ مشہور ڈرامے خوشی ایک روگ، میری  
دلاری، دل ملے کی حویلی، رشتے کچھ ادھورے سے  
موسم، گزارش، ذرا یاد کر اور ڈرسی جاتی ہے صلہ  
زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والی اس اداکارہ نے  
ماسٹرز کی ڈگری لی ہے۔ بطور ریڈیو جاک بھی کام کیا  
ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یمینہ بہت  
Selective ہیں انہوں نے اب تک جتنے  
ڈرامے کیے اس میں اُن کا کردار بہت جاندار تھا۔

حتا الطاف

1992ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی  
تعلیم بیکن ہاؤس اور پلیمز اقرار پورٹی سے کیا۔ حتا  
نے اپنے کیریئر کی ابتدا 18 سال کی عمر میں بطور  
VJ کی۔ ڈرامے جن میں حتا کے کام کو پسند کیا گیا  
اڈاری، ایک نئی میٹل، آبرو آتش ہیں، حتا بہت

فائٹا اور Oye Hoya کے ایڈز بھی بنائے۔  
عدنان کے والد ڈاکٹر ہیں اور والدہ نے بھی ڈراموں  
میں کام کیا۔ عدنان جیسے اداکار ہی ہماری اس  
انڈسٹری کو وہ عروج عطا کر سکتے ہیں جو کبھی ہمیں  
حاصل تھا۔

### فیضان خواجہ

فیضان 7 جنوری 1986ء کو امریکہ میں پیدا  
ہوئے۔ موجودہ رہائش گراچی میں ہے۔ فیضان کے  
والد پروڈیوسر ہیں۔ فیضان نے ایکٹنگ کی تعلیم نصیر  
الدین شاہ سے حاصل کی فلم بول اور ایکسٹران لاجیسی  
فلموں میں چھوٹے رول ادا کیے اس کے بعد ڈرامہ  
سرہیل من کے موتی اور لؤلؤ لائف اور لاہور، عشق تماشا،  
چلی رو برو رخصتی اور کئی اور ڈرامے کیے۔ فیضان نے  
زمینت امان کے بیٹے ازان خان کی فلم  
Bankster سائن کی ہے اس کے علاوہ بہت جلد  
مزا حیلہ فلم چھپن چھپائی میں بھی آپ اُن کا کام  
دیکھیں گے۔

☆☆.....☆☆



## Digitized by Google

آج اور کل

جو پریشانی خاطر تھے درپیش ہے اب

جس مسئلہ آج وہ کتنی ہی لگے

کل وہ معدوم خیالات میں ڈھل جائے گی

پھر یہ مشکل جو ہے درپیش تھے

وقت آئے گا کٹل جائے گی

کرب کی سخت گھڑی

کل ہی بدل جائے گی

اس لیے آج.....!

میری جان پریشان نہ ہو

آج رکتا ہی نہیں کل میں بدل جاتا ہے

جیسے سورج کا سفر

چھاؤں میں ڈھل جاتا ہے

شاعرہ: پروین سلطانہ خاں

ورنگ وین

جب بھی تم کو رینگ کروں میں

بڑی کی ٹون آتی ہے

کیوں تمہارا موبائل اکثر آف رہتا ہے؟

تم پارٹی میں کیوں خوش نہیں اتنا

تم گھر اتنی دیر سے کیوں آتی ہو؟

تمام سوشل گیدرنگ میں کیوں

کیوں سب کا ساتھ نہ لیتی ہو؟

اور بے چاری ورنگ وین

حیران کی یہ سوچ رہی ہے

کیا ٹینشن فزٹی جاب ہے میری؟

کیا اسٹریس مجھے نہیں ہوتا؟

میرے پیسے پسند آتے ہیں

اور الزام بھی لگائے جاتے ہیں

اتنی توقعات ہیں مجھ سے

کہ گھر بھی دیکھوں اور باہر بھی

کھاؤں بھی اور پکاؤں بھی

اس سے بہتر ہوں میں اکیلی

کیوں نہ خود کی بنوں میں اکیلی

شاعرہ: کلفۃ شفیق

اُس کے مرنے پر

مہر و وفا کی ہر گلی میرے دامن سے بین لی

تو نے تو مجھ سے یارب میری دنیا ہی چھین لی

یارب مصائبِ زیست کو کیسے گزاروں میں

گر وہ نہیں یہاں تو کس کو پکاروں میں

زلفِ پریشاں کو اب خود ہی سنواروں میں

آئینہ حیات کو اب کیسے نکھاروں میں

آ آج تو نے اس کو جدا مجھ سے کر دیا

میری زندگی کا دامن کائناتوں سے بھر دیا

تانی تھی اُس نے مجھ سے محبت کی اک ردا

یوں ہی نہیں تھی اس پہ دل و جان سے فدا

تن تو الگ ہوا تھا، ہوئی روح بھی جدا

آ رہی ہے دل سے میرے آج یہ صدا

اب چہار سو میرے اندھا ہی ہو گیا

میں جس کو چاہتی تھی وہ فتنہ کھو گیا

حائل ہوا ہمارے نہ درمیان کبھی سماج

رکھی تھی اُس نے اس طرہ رسم وفا کی لاج

پہنایا اس نے مجھ کو محبت کا ایک تاج

بعد از مرگ بھی کرے گا وہ دل پہ راج

عنوانِ میری زیست کا بکھرا ہے اس طرح

سانحہ یہ دل پہ میرے گزرا ہے کس طرح

شاعرہ: منیہ سلطانہ مشعل

☆☆.....☆☆



# دوشیزہ گلستان

## ترتیب: ارم حمید

حال کر دیتی ہے۔ یہ درد بھی نہیں بھی اٹھ سکتا ہے اور ایسے میں روشنی کی ایک باریک سی لکیر مختلف آوازیں سب اس کے سر درد کو بہت بڑھاتی ہیں۔ مائیکرین کا مریض روزمرہ کے کاموں سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ آئے آج آپ کو بہت آسان سی ترکیب بتائیں اس درد کو بھگانے کی۔

ایک لیون کارس  
1/2 اچھا اور ٹیک ہالین ٹمک  
پانی میں کس کر لیں

جب سر میں درد ہو تو چھوٹے چھوٹے سپ لیں ضرور فائدہ ہوگا۔

رحم اور کرم  
کسی بزرگ سے پوچھا گیا۔  
”رحم اور کرم میں کیا فرق ہے؟“ فرمایا۔  
”جو طلب پر مل جائے وہ رحم ہے اور جو بغیر طلب کے مل جائے وہ کرم ہے۔“

اشفاق احمد کہتے ہیں  
خونی رشتے دوتا منہ کی مانند ہوتے ہیں جن کے بغیر جوانی تو گزر جاتی ہے لیکن بڑھاپا نہیں گزرتا۔  
تھپڑ

زندگی کے ہاتھ نہیں ہوتے مگر اکثر وہ ہمارے منہ پر ایسا تھپڑ مارتی ہے کہ جلن ساری زندگی محسوس ہوتی ہے۔

## فرمان اللہ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بے وفائی مت کرنا اور نہ جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانتوں کے مرتکب ہونا اور یہ بات سمجھ لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں اور یہ کہ عظیم انعام اللہ ہی دینے والا ہے۔

(سورۃ انفال آیت 27، 28)

## فرمان رسول اللہ ﷺ

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ (صحابہ یا اہل بیت نے) ایک بکری ذبح کی (گوشت صدقہ کر دیا) حضور ﷺ نے دریافت فرمایا۔  
”اس میں سے کتنا باقی رہ گیا ہے۔“ عرض کی۔  
”ایک شانہ کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا۔  
”شانہ کے سوا سب باقی ہے (اسی کا ثواب ملے گا جو صدقہ ہو گیا اور ثواب ہی باقی رہتا ہے)“

## حضرت علیؓ کا فرمان

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ ”بعض اوقات معمولی فائدے بہت بڑے فائدے اور منافع سے بہتر ہوتے ہیں۔“

فائزہ مشتاق۔ کراچی

مائیکرین

مائیکرین ایک ایسی تکلیف ہے جو انسان کو بے

آپ کو مزید تکلیفیں دیں۔“ سارے مجمع نے خاتون کی تائید میں تالیاں، بجائیں اور امیدوار بے ہوش.....

سچے موتی

ماں باپ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور نعمت نہیں۔  
جو لوگ مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اُن کی مصیبتیں راتوں کا پیغام سناتی ہیں۔  
اپنے حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار سے زندگی کو اتنا عظیم بنالو کہ لوگ تمہاری عزت کریں۔  
بھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لیے کانٹوں کی جبین کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

پہچان

کھنٹی بجی ملازمہ باورچی خانے میں تھی صاحب نے آواز دی۔  
”خدیجہ جاؤ تمہارا منگیتز آیا ہے۔“  
ملازمہ حیرت سے.....

”صاحب دروازہ تو بند ہے آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ صاحب نے ہنسی سے بولے۔  
”مگر کھڑکی تو کھلی ہے اور میں نے دیکھ لیا ہے اس نے میری پتلون قمیض پہنی ہے۔“  
U.K. سیدی سیٹھی

خواب

بیوی ادا نے دلہری سے شوہر سے بولی۔  
”جانو میں کل ساری رات خواب میں تم سے باتیں کرتی رہی۔“  
”میاں گھبرا کر:“ سچ تمہیں میرے سر کی قسم مجھے صاف کرنا میں نے نہیں سنا ورنہ جواب ضرور دیتا۔“  
سلمان رشید۔ ملتان

غزل

دیکھ کر رقص ماہ پاروں کا  
دیکھ رک گیا بھاروں کا

گہری بات

60 کی دہائی میں ملکہ برطانیہ اور ان کے شوہر پاکستان کے دورے پر آئے۔ ایوب خان صدر پاکستان انہیں برن ہال اسکول امیٹ آباد لے گئے۔  
ملکہ بچوں سے ہاتھ ملاتی آگے بڑھ گئیں اُن کے شوہر بچوں سے باتیں کرنے لگے پوچھا۔  
”بڑے ہو کر کیا بناتے؟“ کسی نے کہا۔  
”ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ، آرمی افسر وغیرہ وغیرہ.....“ وہ خاموش ہو گئے۔ پھر صدر پاکستان سے سچ پر کہا کہ آپ کو اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنا ہوگا۔ میں نے 20 بچوں سے بات کی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ٹیچر بننا ہے اور یہ بہت خطرناک بات ہے۔“ ایوب خان صرف مسکرا دیے کچھ کہہ نہ سکے۔  
خولہ عرفان۔ کراچی

اُلٹی ہو گئی سب تدبیریں

قوی اسبلی کا امیدوار جلے سے خطاب کر رہا تھا۔  
”خواتین و حضرات میں آپ کے لیے فائینس پرانا خادم ہوں آپ کے لیے میلوں پیدل چلا ہوں بارشوں میں بھیگا ہوں“ کوئے پھیڑے کھائے ہیں اور آپ کی خاطر میرے ٹکڑوں میں چھالے پڑ گئے اور..... اور اچانک مجمع میں سے ایک خاتون کھڑی ہوئیں امیدوار نے تقریر روک کر کہا۔  
”جی خاتون فرمائیے۔“  
”جناب یہ ساری تکلیفیں اور دکھ آپ نے ہمارے لیے برداشت کیے ہیں صرف ہماری خاطر.....؟“

”جی ہاں۔“ امیدوار نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا دیا۔ ”بے شک آپ کی خاطر۔“  
خاتون نے جواباً کہا۔ ”تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ کو اب آرام کرنا چاہیے ہم اتنے احسان فراموش نہیں کہ

موسمِ شہر

معجزہ

ایک ادیب سے ایک ملاقاتی نے پوچھا۔  
”آپ معجزوں پر یقین رکھتے ہیں۔“  
ادیب نے نفی میں گردن ہلائی اس پر وہ بولا۔  
”تو پھر سن لیجئے آپ کا پورا ناول پڑھنے کے  
بعد بھی میں نے خودکشی نہیں کی اسی کو معجزہ کہتے  
ہیں۔“

معانی

ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا۔  
”اچھا تو بیوی سے تمہاری لڑائی کیسے ختم  
ہوئی؟“  
دوست: ”وہ گھٹنوں کے بل رہ جیتی ہوئی میرے  
پاس آئی اور اپنی ٹھکت تسلیم کرتے ہوئے بولی چلو  
اب بستر کے نیچے سے نکل آؤ میں کچھ نہیں کہوں  
گی۔“

ثوبیہ۔ جھٹک

ہمیشہ یاد رکھنے والی باتیں

تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔  
مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا  
مسلمان محفوظ رہے۔  
بہترین ذکر لا الہ الا اللہ اور بہترین دعا الحمد للہ ہے۔  
قرآن کریم کی فضیلت تمام کتابوں پر ایسی ہے  
جیسے خلق خدا پر اللہ تعالیٰ کو فضیلت۔  
دنیا آخرت کی یکمیت ہے۔

یادیں

یادیں ابتدا میں کچے دھاگے کی مانند ہوتی ہیں  
لیکن بعد میں آہستہ آہستہ لوہے کے تار بن جاتی ہیں  
جن کے کٹنے میں شخصیت محصور ہو کر رہ جاتی ہے۔  
غل ہما ظفر کے

☆☆.....☆☆

اک عظام کا سیل تھا جس پر  
مجھ کو دھوکا ہوا کناروں کا  
کون دیوانہ وار گزرا ہے  
زخم تازہ ہے رہگذاروں کا  
ان سے تنہائیاں بہتی ہیں  
مجھ پر احسان ہے ستاروں کا  
اے دل فرار اعتبار نہ کر  
لڑ کھڑاتے ہوئے سہاروں کا  
کس نے رخ سے نقاب الٹی ہے  
نور پیکا ہے چاند تاروں کا  
انتخاب: ناصرہ۔ ناروے

شعر

لوگ کہتے ہیں مرگ ناصر پر  
اک دیا مجھ گیا مزاروں کا  
دنیا کی حساس ترین خاتون

فرانس کی مادام دینیور دنیا کی حساس ترین خاتون  
تھیں 1842ء میں ان کے شوہر جو شاہی اتارنی تھے  
کسی بات پر برا فروخت ہو کر کہہ دیا۔  
”خاموش ہو جاؤ کیا بے وقوفی کی باتیں کرتی  
ہو۔“ اس کے بعد مادام کے لبوں پر مہر سی لگ گئی پھر  
وہ 35 سال بالکل خاموش رہیں ان کے شوہر  
معافیاں مانگ مانگ کر تھک گئے حتیٰ کہ اپنی اکلوتی  
بیٹی کی شادی پر بھی سر ہلا کر رضا مندی دی اور اسی  
حالت میں اُن کا انتقال ہو گیا۔  
نقیمت

جوانی کو بڑھاپے سے پہلے تندرستی کو بیماری  
سے پہلے خوشحالی کو تنگدستی سے پہلے فرصت کو  
معروفیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے  
نقیمت جانو۔

صومہ شریف۔ کینیڈا

میں 2018-12-12 کو کیسے لکھیں گے؟  
شاگرد: ”دور جن دور جن ڈیڑھ دور جن۔“  
نور احمد۔ چکوال

بابا بلے شاہ

غصے وچ نہ آیا کر  
ٹھنڈا کر کے کھایا کر  
دن تیرے دی بھر جان گے  
ایویں نہ گھرایا کر  
پیار دے ایسے بوٹے لا  
سارے پنڈتے سایہ کر  
اپنے اندروں جھوٹ مکا  
بچ داڈھول وچایا کر  
رکھی سکھی کھاکے توں  
من اندرتوں جھاڑو دے  
اندر باہر صفایا کر

اہمیت  
اگر آپ اپنی اہمیت کو ماننا چاہتے ہیں تو سامنے  
والے کو بہت اہم جانیے آپ کی اہمیت اور وقعت  
دونوں کو جو جائیں گی۔

رومانہ سعید۔ لاہور

السلام علیکم

صبح کا سلام صرف رسم نہیں بلکہ یہ احساس فکر بھی  
ہے تاکہ رشتے سلامت رہیں اور یادیں باقی رہیں۔

مکار دوست

پہلا دوست: ”ہیلو! یار کیا حال ہے؟“  
دوسرا دوست: ”مست بھائی! ٹھنڈا۔“  
پہلا دوست: ”یار ایک کام تھا۔“  
دوسرا دوست: ”ہاں تو کر لے کام بعد میں بات  
کریں گے بائے۔“

اچھا انسان

انتخاب: تحسین احمد۔ جدہ

ایک دفعہ میں نے ایک بزرگ سے پوچھا۔  
”میں کامیاب انسان بننا چاہتا ہوں بتائیے  
کون سا کیرئیر میرے لیے اچھا رہے گا۔“ انہوں  
نے جواب دیا۔  
”اچھا انسان بننے کی کوشش کرو یہاں کامیابی  
کی بہت گنجائش ہے اور مقابلہ بہت کم۔“  
محنت۔ چٹوکی

حکومتی پیکیج

شوہر بیوی سے: ”میں سوچ رہا ہوں کہ ہم بھی  
حکومتی پیکیج کی چار مرغیاں اور ایک مرغالے آئیں۔“  
بیوی: ”ہرگز نہیں! مرغے کو دیکھ کر کہیں آپ کو  
بھی ہری ہری نہ سوجے۔“

نیپا پاکستان

استاد: ”انڈوں کے حساب سے نئے پاکستان



# کچن کارنری

صومہ شریف

موسم سرما کے  
لذیخ کھانے

دو شیرو قارئین کی فرمائش پر اب انتہائی سہل کھانے کی ترکیب پیش کی جا رہی ہیں وہ ترکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

قیمت بھرے کر لیے

اجزاء:-

گائے کا قیرہ

کر لیے

پیاز (باریک کٹی ہوئی)

پسی ہوئی ہلدی

پسا ہوا لہسن اور ک

پسی ہوئی لال مرچ

کلوئی

سونف

پسا ہوا گڑ

املی کا گودا

لیموں کا رس

ہری مرچیں

کڑمی پتے

نمک

تیل

ہر ادھیا

ترکیب:

کرلیوں کو جمیل کر چڑا لگائیں اور بیج نکال

دیں۔ ان پر  $\frac{1}{2}$  کڑمی ہلدی اور نمک ملا کر  $\frac{1}{2}$  گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر اچھی طرح سے دھو لیں۔ دہی میں تیل گرم کر کے پیاز پادای کر پیں پھر قیرہ اور ک لہسن باقی ہلدی لال مرچ کلوئی کڑمی پتے سونف لیموں کا رس ہری مرچیں اور نمک ملا کر بھونیں۔  $\frac{1}{2}$  قیرے کو کرلیوں میں بھریں اور دھاگے سے باندھ دیں۔ فرمائنگ پن میں تیل گرم کر کے کرلیے تلیں اور قیرے والی دہی میں پھیلا دیں۔ اس پر بانی گڑ اور املی کا گودا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار کر لیے ڈش میں نکالیں اور ہرے دھینے سے سجھا کر پیش کریں۔

پالک پنیر

اجزاء:-

پالک (چپ کی ہوئی)

بنیر (چوکور تے ہوئے کلوے)

تازہ دودھ

پیاز (چپ کی ہوئی)

پسا ہوا لہسن

پسی ہوئی اور ک

ہری مرچیں

$\frac{1}{2}$  کلو

ایک پیالی

100 ملی لیٹر

ایک عدد

2 چائے کے چمچے

ایک چائے کا چمچ

4 عدد

ایک پیالی + تیلے کیلے

سجانے کے لیے

|                   |                 |                    |                 |
|-------------------|-----------------|--------------------|-----------------|
| پسی ہوئی ہلدی     | ½ چائے کا چمچ   | ادرک (چپ کیے ہوئے) | 2 چائے کے چمچے  |
| پسی ہوئی لال مرچ  | ½ چائے کا چمچ   | لیموں کارس         | 2 کھانے کے چمچے |
| پا ہوا گرم مصالحہ | 2 چائے کے چمچے  | نمک                | ایک چائے کا چمچ |
| دہی               | 4 کھانے کے چمچے | تیل                | ¼ پیالی         |
| ٹماٹو پوری        | ½ پیالی         | ہری مرچ            | سجانے کے لیے    |
| خیبر (کدوئیں)     | 2 کھانے کے چمچے | کریم               | سجانے کے لیے    |
| نمک               | حسب ذائقہ       | لیموں (تھ)         | سجانے کے لیے    |
| تیل               | 2 کھانے کے چمچے |                    |                 |
| ٹماٹر (تھ)        | سجانے کے لیے    |                    |                 |

ترکیب:  
دہی میں تیل گرم کر کے مسٹرڈ پیسٹ، کلونچی اور سونف کو بھونیں پھر ادرک، پیاز اور ٹماٹر شامل کر کے ٹماٹر گٹنے تک پکائیں۔ اس میں لال مرچ، ہلدی اور نمک ملا کر تیل اوپر آنے تک بھونیں پھر جیسے ملا کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار جیسے لیموں کارس اور گرم مصالحہ ملا کر ڈش میں نکالیں اسے لیموں، کریم اور ہری مرچ سے سجادیں۔

### مولی کے اچار کی پرائی

|                    |                  |       |
|--------------------|------------------|-------|
| اجزاء:-            | مولی (کدوئیں)    | ½ کلو |
| پسی ہوئی لال مرچ   | ایک چائے کا چمچ  |       |
| اچھور              | ایک چائے کا چمچ  |       |
| سونف               | ½ چائے کا چمچ    |       |
| راٹی               | ½ چائے کا چمچ    |       |
| کلونچی             | ½ چائے کا چمچ    |       |
| جاٹ مصالحہ         | ایک کھانے کا چمچ |       |
| اٹی کا کودا        | 2 کھانے کے چمچے  |       |
| پودینہ (چپ کر لیں) | ½ گڈی            |       |
| نہیں               | 2 کھانے کے چمچے  |       |
| نمک                | ایک چائے کا چمچ  |       |
| آٹے کے اجزاء:      |                  |       |
| آٹا (مٹا)          | 2 پیالی          |       |

سوڈا اچھی طرح سے پھینٹیں اور باقی تمام اجزاء چمچے سے ملا لیں۔ مٹن ٹرے کو چھٹا کر کے کاغذی پیالیاں سیٹ کریں۔ اس میں تھوڑا تھوڑا آمیزہ بھر کر پہلے سے گرم اودن میں  $160^{\circ}\text{C}$  پر رکھ دیں۔ 20 منٹ تک پکانے کے بعد گرما گرم پیش کریں۔

### زیر ایک

بیسن (چمٹا ہوا) ایک پیالی  
کھانا ہو اسفید زیرہ ایک کھانے کا چمچ  
کھانا ہو ادھنیا ایک کھانے کا چمچ  
پسی ہوئی لال مرچ ایک چائے کا چمچ  
نمک ایک چائے کا چمچ  
سبھی تلنے کے لیے

ترکیب:

اجزاء:-

300 گرام

4 عدد

250 ملی لیٹر

250 گرام

1/4 چائے کا چمچ

ایک کھانے کا چمچ

3 کھانے کے چمچ

250 ملی لیٹر

میدہ (چمٹا ہوا)

اٹھ سے

تازہ دودھ

کاسٹر چینی

وینلا ایسنس

بیکنگ پاؤڈر

کو کو پاؤڈر (چمٹا ہوا)

تیل

ترکیب:

اجزاء:-

اٹھ سے

بیسن

تازہ دودھ

4 عدد

2 کھانے کے چمچ

1/4 پیالی

4 عدد

ہری مرچیں (چپ کی ہوئی)

ایک عدد

شملہ مرچ (چپ کی ہوئی)

ایک عدد

پیاز (چپ کی ہوئی)

1/2 چائے کا چمچ

پسا ہوا گرم مصالحہ

2 چائے کا چمچ

لیموں کا رس

1/4 چائے کا چمچ

بیکنگ سوڈا

ایک عدد

ٹماٹر (چپ کیا ہوا)

1/2 چائے کا چمچ

نمک

ترکیب:

ایلیکٹرک میٹر سے اٹھنے بیسن دودھ اور بیکنگ

میدے میں بیکنگ پاؤڈر اور ایسنس ملا لیں۔ ایلیکٹرک میٹر سے اٹھنے پھینٹیں اس میں تھوڑی تھوڑی چینی یکجان کریں پھر تیل ملا لیں۔ اس میں تھوڑا میدہ اور دودھ ڈال کر چمچے سے ملا لیں۔ اس آمیزے کو 2 حصوں میں تقسیم کر گئیں ایک حصے میں کو کو پاؤڈر ملا لیں۔ 9 انچ کے اسپرنگ فوم چین کو چھٹا کر لیں۔ اس میں ایک کھانا پکانے کا چمچ بھر کر سادہ آمیزہ پھر کو کو پاؤڈر ملا آمیزہ ڈالیں۔ اسی طرح سے پورا آمیزہ ڈال دیں۔ اس دوران چین کو بالکل نہ ہلائیں۔ اسے پہلے سے گرم اودن میں  $180^{\circ}\text{C}$  پر 40 منٹ پکائیں۔ اسے نکال کر وائر ایک پر خشکا کریں۔ پھر ٹکڑے کاٹ کر پیش کریں۔

☆☆.....☆☆

